سالنامہ ۲۰۱۶ء

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ

سہ ماہی

# الاقرباء

اسلام آباد

یونس ایمرے

عظیم ترک صوفی شاعر (۱۲۳۸ء۔۱۳۲۰ء)

(ص۔ ۱۳)

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

# سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

---

جلد نمبر ۱۷ شمارہ نمبر ۱ جنوری۔مارچ/اپریل۔جون ۲۰۱۴ء

---




---


الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-2221670

website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG (U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012- 4677 (USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com


## زرِ تعاون

| | |
|---|---|
| فی شمارہ | ۲۵۰ روپے |
| سالانہ (مع محصول ڈاک) | ۱۰۰۰ روپے |
| بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک) | ۱۰ / ڈالر ۷/ پاؤنڈ |
| بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک) | ۴۰ /ڈالر ۳۰/ پاؤنڈ |

## کوائف نامہ



| | |
|---|---|
| شمارہ | جنوری۔مارچ/اپریل۔جون ۲۰۱۴ء |
| کمپوزنگ | محمد انور چوہدری |
| طابع | ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد |
| ناشر | سیّد ناصر الدین |

# مندرجات

# لسانی مباحث اور مادری زبان۔۔ چند توجہ طلب حقائق

اقوام متحدہ کے معروف ذیلی ادارے 'یونیسکو' نے مختلف موضوعات پر عالمی دن منانے کے حسب روایت ۲۱ فروری ۲۰۱۴ء کو "مادری زبان کا بین الاقوامی دن" منایا۔ اس موقع پر سکریٹری جنرل جناب بانکی مون نے اپنے خصوصی پیغام میں کہا:

"آیئے! ہم سب مل کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر اور زندگی کو پُر وقار بنانے کے لیے زبانوں کے پھیلانے اور کثیر اللسانیت کے فروغ کے لیئے اپنا کردار ادا کریں"۔

مادری زبان کے حوالے سے اس روایت کا آغاز فروری ۲۰۰۷ء میں ہوا اور جنرل اسمبلی نے اسی سال مئی میں ایک قرارداد کے ذریعہ رکن ممالک پر زور دیا کہ وہ دنیا بھر میں بولی جانیوالی عوامی زبانوں کے تحفظ اور بقاء کے لیئے موثر اقدامات کریں۔ اس پالیسی کے پس منظر میں نومبر ۱۹۹۹ء میں منعقدہ یونیسکو کی جنرل کونسل کا وہ اعلامیہ کارفرما تھا جس کے مطابق مادری زبان کا بین الاقوامی دن منانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اس فیصلے کا بھی ایک پس منظر تھا اور وہ یہ کہ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان) میڈیکل کالج کیمپس میں "شہید مینار" اُس سانحہ کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جو بنگلہ کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیئے جانے کے مطالبہ پر احتجاجی مظاہروں میں شریک بعض طلباء کی شہادتوں پر منتج ہوا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کے دستورِ پاکستان میں اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ البتہ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد قومی اسمبلی نے بحثیت مجلسِ دستور ساز ۱۹۷۳ء میں جو متفقہ آئین قوم کو دیا وہ بحمد اللہ نافذ العمل ہے اور یہی نہیں کہ اس آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے تحت پاکستان کی واحد رابطہ کی زبان (Lingua-Franca) اردو کو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے بلکہ ۲۵۱ ہی کے

ذیلی آرٹیکل (۳) کے ذریعہ اردو کی قومی و سرکاری حیثیت کے باوجود ہر صوبائی مجلسِ مقننہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کے تدریس و فروغ اور استعمال کے لیئے قانون سازی کرے۔ یہی نہیں بلکہ ایک علیحدہ آرٹیکل ۲۸ کے ذریعہ شہریوں کے ہر اُس طبقہ کو جس کی ایک واضح اور جداگانہ زبان۔ رسم الخط اور ثقافت ہونے کی صورت میں اِن کے تحفظ و فروغ اور قانون کے مطابق ادارے قائم کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا۔

مادری زبان کے عالمی دن کے موقع پر یونیسکو نے جو مزید اعداد و شمار جاری کیے اُن کے مطابق بتایا گیا کہ دنیا میں ۶۹۱۲ زبانوں میں سے تقریباً نصف معدوم ہو جانے کے خطرات سے دوچار ہیں جب کہ پاکستان میں ۷۳ زبانوں میں سے ۶۳ زبانیں ناپید ہو جانے کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ جن میں ۲۷ زبانوں کو شدید اور فوری خطرات لاحق ہیں اُن میں خیبر پختون خواہ، فاٹا، گلگت، بلتستان اور چترال کے علاقوں کی زبانیں شامل ہیں۔ گزشتہ سال بین الاقوامی مادری زبان کے دن کا 'نفسِ موضوع' پنجابی زبان تھی جو اب رُو بہ زوال ہے۔ ملک میں ۶ زبانیں سب سے زیادہ بولی جاتی ہیں۔ ۴۴ فیصد پنجابی، ۱۵ فیصد پشتو، ۱۴ فیصد سندھی، ۱۰ فیصد سرائیکی، ۵ فیصد اردو اور ۴ فیصد بلوچی۔ پاکستان میں ۶۳ زبانیں ایسی ہیں جو صرف چند سو افراد تک محدود ہیں۔ نیز ہر ۱۴ دنوں میں دنیا کی ایک زبان اپنی موت آپ مر جاتی ہے چنانچہ انتباہ کیا گیا کہ رواں صدی کے آخر تک ۶۰۰۰ سے زائد زبانیں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ ان میں پاکستان کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک زبان 'بدیشی' بھی شامل ہے جو سوات میں بشگرام کے علاقہ میں بولی جاتی رہی ہے اور اب ختم ہو چکی ہے۔ بدیشی قبیلے کے افراد نے جو ایک ہزار ہیں اس زبان کو تقریباً ترک کر دیا ہے۔ تحریری و دستاویزی تحفظ سے محروم ان زبانوں کے معدوم ہو جانے کے نتیجہ میں عالم انسانیت نہ صرف تہذیبی و ثقافتی ورثہ سے محروم ہو جائے گا بلکہ ان مقامی زبانوں سے وابستہ آبائی معلومات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ تاہم اِن تمام عوامل کے باوجود انگریزی رابطہ کی عالمی زبان بن چکی ہے۔

قبل اس کے کہ یہاں عالمی سطح کے اِس اشتہاری منظر نامہ کا جائزہ لیا جائے مناسب ہوگا کہ پاکستان میں اس صورت حال کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان پر سرسری نظر ڈال لی جائے۔ سب سے زیادہ دلخراش اور تدبّر باختہ ردِعمل کا مظہر قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کی وہ متفقہ قرارداد ہے جسے ۱۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو منظور کیا گیا اور جس میں اراکین کو ۳۵ پاکستانی زبانوں کے بارے میں (اردو زبان میں) معلومات مہیا کی گئیں ان میں بلوچی، بلتی، براھوی، ہندکو، کھوار، کشمیری، پہاڑی، پشتو، پنجابی، سندھی اور سرائیکی بھی شامل تھیں۔ قرارداد کے ذریعہ وفاقی پارلیمان کو 'منجملہ دیگر' جو سفارشات پیش کی گئیں اُن میں باون (۵۲) مادری زبانوں کو پاکستان میں پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح تک ذریعہ تعلیم بنانا اور ان زبانوں کے فروغ کے لیئے مختص ادارہ کا قیام شامل ہیں۔ یہ قرارداد اس کے باوجود منظور کی گئی کہ اس سے قبل بھی قومی اسمبلی ایک پرائیویٹ ممبر بل کو مسترد کر چکی ہے جس میں اردو سمیت سات زبانوں کو پاکستان کی قومی زبانیں قرار دینا تجویز کیا گیا تھا۔ ۱۶ مارچ ۲۰۱۴ء کے قومی اخبارات میں یہ خبر بھی چھپی کہ پختون خواہ میں ایک مقتدر ادارہ قائم کیا جارہا ہے جو صوبے میں علاقائی زبانوں کی تعلیم کا اعلیٰ ثانوی سطح تک اہتمام کرے گا۔ ان زبانوں میں پشتو، ہندکو، خووار، سرائیکی اور کوہستانی شامل ہیں۔ نیز یہ ادارہ نصاب کے تعین کا بھی مجاز ہوگا۔ بلوچستان میں وزیر اعلیٰ پہلے ہی اعلان فرما چکے ہیں۔ کہ صوبے میں بلوچی پشتو اور براھوی سکول کی سطح پر پڑھائی جائیں گی۔ جب کہ صوبہ سندھ کے پرائمری نصاب سے سابق صدور ایوب خاں، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے نام خارج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کام صوبہ سرحد میں پہلے ہی کیا جاچکا ہے یعنی بانی پاکستان کی جگہ ایک ایسی شخصیت کو قومی قائد اور ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا منفی کردار قیامِ پاکستان کے سلسلہ میں تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ لگتا ایسا ہے کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں پاکستان تیزی سے لسانی۔ تعلیمی اور تاریخی طور پر طوائف الملوکی (Anarchy) کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔

یہ سرسری سا اور محتاط جائزہ لینے کے بعد چند نہایت اہم اور غور طلب حقائق سامنے آتے

ہیں جن میں یونیسکو کا کردار سرِ فہرست ہے یعنی ۱۹۵۲ء میں بنگلہ زبان کے حق میں ڈھاکہ کے فسادات سے نصف صدی سے بھی زیادہ مدّت کے بعد آخر یونیسکو کو اچانک کیسے یاد آ گیا کہ تمام دنیا میں اس حوالے سے مادری زبان کا دن ہر سال منایا جائے اور جس کا ۲۰۰۷ء سے آغاز کر دیا گیا نیز پاکستان کو مرکزی ہدف بنانے کے ساتھ ساتھ مشرق کے ہر اُبھرتے ہوئے ملک کو خونخوار لسانی تقسیم کے ذریعہ پارہ پارہ کر دینے پر عالمی ادارہ کمربستہ ہو گیا۔ کون نہیں جانتا کہ مغربی استعماریت کا اقوام متحدہ اور اُس کے متعلقہ اداروں پر موثر کنٹرول ہے ۲۰۰۸ء میں جو عالمی زبانوں کا دن منایا گیا تھا جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ انگریزی رابطہ کی واحد عالمی زبان ہے اور اب یک لسانی عالمگیریت کے حصول کی خاطر ساری دنیا کو چھوٹی چھوٹی زبانوں میں بانٹ کر لسانی عالمگیریت کے ساتھ ساتھ ایک لسانی آمریت کی راہ بھی ہموار ہو چکی ہے۔ ایک اور حربہ جس کے تاریخی تسلسل کا عمل تیز کر دیا گیا ہے وہ رسم الخط ہے۔ استعماری دور میں سامراجیوں نے ترک زبانوں کا عربی رسم الخط بدل دیا تھا۔ روسیوں نے وسط ایشیا میں ترک زبانوں پر لاطینی رسم الخط کی اجارہ داری قائم کر دی گئی۔ چنانچہ ترک قوم اسلامی ورثہ سے محروم ہو گئی یہی صورت حال بنگلہ زبان کا رسم الخط دیوناگری یا ہندی ہونے کے سبب پیش آئی ورنہ پاکستان کو دولخت کر دینے کا المناک سانحہ ہرگز پیش نہ آتا۔ اس موضوع پر چند ماہ قبل لاہور میں منعقدہ دوروزہ اردو سیمنار میں رسم الخط کے مسائل زیر بحث آئے۔ جنوبی ایشیا میں رابطہ کی واحد زبان ہونے کی حیثیت میں اردو کا رسم الخط دیوناگری، ہندی یا رومن رسم الخط میں تبدیل کر دینے کی معاندانہ کوششیں کی جاتی رہی ہیں تاکہ اس زبان نے اسلامی تہذیب و معاشرت کے جو اسالیب اختیار کیے ہیں اُنھیں تہس نہس کر دیا جائے۔ اور وہ مسلم ممالک جہاں عربی بولی جاتی ہے پاکستان سے دینی و معاشرتی روابط نہ بڑھا سکیں۔ گاندھی نے اردو کی مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر اسے ہندوستانی کا نام دینے کی تجویز دی تھی تاکہ بعد میں رسم الخط بھی تبدیل کر کے مسلمانوں کی دینی و ثقافتی شناخت کی عمارت ہی کو منہدم کر دیا جائے۔ یونیسکو کے عزائم بھی یہی ہیں جس نے ۲۰۰۸ء کے اعداد و شمار شائع کر کے دنیا

کو بتایا کہ کم و بیش دنیا کی چھ ارب آبادی میں جو زبان ایک ارب سے زیادہ افراد بولتے اور سمجھتے ہیں اُس کا نام 'ہندوستانی' ہے حالانکہ اس نام کی زبان بشمول ہندوستان جہاں صرف ہندی، قومی و سرکاری زبان ہے دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اردو کی جگہ ہندوستانی کا لفظ استعمال کر کے یونیسکو نے اپنے بدترین تعصب کا مظاہرہ کیا کہ اسے اردو کے عالمی سطح کی زبان کہا جانا ہرگز گوارا نہیں۔ بھارت میں جہاں دیکھئے دفتروں، دکانوں تعلیمی اداروں اور ریلوے سٹیشنوں کے نام دیوناگری و ہندی میں نظر آتے ہیں۔ وہاں بھی اردو زبان کے فطری ارتقاء کی صلاحیتوں نے متعصب اذہان کو حسد و کم مائیگی کے احساس میں جھلس کر رکھ دیا ہے۔

قومی زبان کے حوالے سے ڈھاکہ میں قائداعظمؒ کے دوٹوک اور واضح اعلان سے پہلے اُس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم نے ایک کانگریس لیڈر ردمتہ کے ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کے اس دعوےٰ کے جواب میں کہ ملک میں چھ کروڑ نوے لاکھ افراد میں سے چار کروڑ چالیس لاکھ بنگلہ بولتے ہیں واضح کر دیا تھا کہ ''پاکستان کا قیام برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبہ پر وجود میں آیا تھا جن کی زبان اردو ہے پاکستان ایک مسلم ریاست ہے اور اس کے رابطہ کی زبان کوئی اور زبان نہیں بلکہ اردو اور صرف اردو ہی ہے''۔ چنانچہ اس دلیل کی صداقت بدستور قائم و دائم ہے اور اسی واقعاتی صداقت کے پیش نظر بانیٔ پاکستان نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ریس کورس گراؤنڈ ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں اعلان فرما دیا تھا۔

''میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کوئی اور زبان نہیں صرف اردو ہی مملکت کی زبان ہوگی ـــ جو بھی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ بغیر ایک زبان کے کوئی قوم نہ متحد رہ سکتی ہے نہ فعّال۔''

۲۴ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کرزن ہال میں کانوکیشن کی تقریب سے اپنے صدارتی خطبہ کے دوران ایک بار پھر فرمایا:

''ـــ رابطہ کی زبان صرف ایک ہوگی اور وہ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو

سکتی۔۔۔اردو ہی پاکستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ زبان اسلامی ثقافت اور مسلم روایات کی روح اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔"

یہاں سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ اپنے اعلانات میں حضرت قائداعظمؒ اور قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم دونوں ہی نے اردو کے رابطہ کی زبان ہونے کی حیثیت کو بنیادی اہمیت دی اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امریکہ۔فرانس۔ جرمنی۔ترکی۔سعودی عرب اور عرب امارات جہاں رابطہ کی زبان صرف ایک ہے جو قومی اور مملکتی اتحاد کی ضامن ہے جب کہ، برطانیہ میں زوال و خلفشار کے آثار اس لئے نمایاں ہیں کہ وہاں چار زبانیں آئرش۔ انگریزی۔ سکاٹش اور ویلش قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یونیسکو کی یہ تازہ مہم محدود علاقوں اور محدود افراد کے درمیان بولی جانے والی زبانوں یا بولیوں کی نسبت اخلاص و صداقت پر مبنی ہے وہ اپنی غلط فہمی دور کرلیں کیونکہ زبانوں کے فروغ و ارتقاء کا عمل فطری ہے مصنوعی نہیں۔ زبانیں بیساکھیوں پر نہیں چلائی جاسکتیں۔ صرف وہ زبانیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کر لینے اور اپنے الفاظ دوسری زبانوں کو منتقل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال خود اردو زبان ہے جسے یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے ایک ارب سے زیادہ افراد بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن اِسے ہندوستانی کا نام دیا گیا ہے جسکا ہرگز کوئی جواز موجود نہیں۔ ہماری حکومت کا تو یہ فرض ہے کہ اس معاملے کو بین الاقوامی سطح پر اُٹھائے اور عالمی ادارے کے ریکارڈ میں تصحیح کو یقینی بنائے۔

جہاں تک پاکستان کی علاقائی اور صوبائی زبانوں کا تعلق ہے اُن کے فروغ و ارتقاء کے لیے آئین میں باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے صوبائی حکومتوں کا فرض ہے کہ قانون سازی کریں اور قومی زبان اردو کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کو بھی پرائمری کی سطح پر ذریعۂ تدریس بنائیں لیکن اِس سے آگے تو نہالان قوم کو تفریق و انتشار سے بچانے کے لیے قومی زبان ہی کو بطور ذریعۂ تعلیم قائم رکھنا قوم کے فکری۔ نظریاتی اور عمرانی اتحاد و یک جہتی کا ضامن ہوسکتا ہے ورنہ پاکستان کے

خلاف یونیسکو نے جو ملفوف سازش کی ہے اُس کے اثرات تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اردو نہ صرف پاکستان کی شناخت ہے بلکہ پورے برصغیر میں رابطہ کی مسلّمہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی کوئی علاقائی بنیاد نہیں اور اسی لیے قائداعظمؒ نے اِسے قومی زبان قرار دیا تھا۔

-----

## مکتبہ اتحادالمصنفین کی مطبوعات

### زیرِ اہتمام الاقرباء فاؤنڈیشن

| نام کتاب | موضوع | مصنف/مولف | سالِ اشاعت |
|---|---|---|---|
| حرف بہ حرف | تنقید و تحقیق | سید منصور عاقل | ۱۹۸۱ء |
| برگِ سبز | تحقیق و سوانح | سید منصور عاقل | ۱۹۹۲ء |
| گہوارۂ سخن | شعری مجموعہ | سید منصور عاقل | ۱۹۹۳ء |
| حرفِ محرمانہ | شخصیت فکر و فن | سید منصور عاقل | ۱۹۹۴ء |
| گلاؤٹھی | دوآبہ گنگ و جمن کی بستی کا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مزاحمتی کردار | سید منصور عاقل | ۱۹۹۸ء |
| دبستانِ قابل | سوانح۔ انتخاب کلام۔ تنقید | سید منصور عاقل | ۲۰۰۰ء |
| حرفِ معتبر | ادبی اداریہ نویسی | سید منصور عاقل | ۲۰۱۳ء |
| متاعِ فکر و نظر | تنقید و تجزیہ نگاری | سید منصور عاقل | ۲۰۱۴ء |

ملنے کا پتہ: مکان نمبر ۱۰۲، سٹریٹ نمبر ۱۱، G-11/3، اسلام آباد (پاکستان)

## محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

# یونس اُمرے، عظیم ترک صوفی شاعر

## (۱۲۳۸ء۔ ۱۳۲۰ء)

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب اناطولیہ کی ترکی زبان مستند عربی و فارسی روایات کے زیرِ اثر ادب عالیہ میں نئے نئے گل کھلا رہی تھی، ایک صوفی منش، درویشِ خدا مست، فقر کا لبادہ اوڑھے، جنھیں رومیؒ ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، ترکی میں شہ نشینِ ادب پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور دل کی سادہ و سلیس زبان میں عشقِ حقیقی وانسانی محبت واخوت کے وہ غیر فانی نغمے چھیڑتے ہیں کہ ترکی معاشرہ کے ہر طبقہ کے لوگ ان کے گرویدہ اور ایک ایسے روحانی سرور سے سرشار ہو جاتے ہیں جس سے وہ اس سے قبل ناآشنا تھے۔ ترکی کا کوئی بھی شاعر آج تک ایسی سادہ پُر وقار، محاورہ بندی اور روزمرہ کی دل نشیں زبان میں شعر نہیں کہہ سکا ہے۔ ان کا نام یونس اُمرے ہے۔ یونیسکو نے ان کی سات سو پچاسویں سالگرہ پر ۱۹۹۱ء کو یونس اُمرے کا بین الاقوامی سال قرار دیا تھا۔

یونس اُمرے کی بیشتر زندگی قصے اور کہانیوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ ان کی تاریخِ پیدائش کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۸ء کے لگ بھگ ایک گاؤں "صاری کوئے" جدید ترکی نام "ایمرے" میں ہوئی اور وصال شاید ۱۳۲۰ء ان کے آبائی گاؤں ہی میں ہوا۔ ان تواریخ کا اندازہ ان کے کلیات شعروسخن سے کیا گیا ہے۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی تھی اور ہے کہ بے شمار مقامات ان کی جائے پیدائش اور آخری آرام گاہ کے طور پر مشہور ہیں اور کہیں کہیں ان کے مجسمے بھی نصب ہیں۔ اس غیر فانی عوامی شاعر کی زندگی کے متعلق بہت سی روایات زبان زدِ عام ہیں۔ جب یونس اُمرے نے آنکھ کھولی تو اس وقت قونیہ پر سلجوق ترک حکمران تھے۔ اس وقت قونیہ اور اناطولیہ کا نواحی علاقہ ان وسطِ ایشیاء کے مہاجرین کے لیئے

واحد پناہ گاہ تھا جن کے آبائی وطن کو منگول حملہ آوروں کی یورش اور قتل وغارت گری نے تباہ و برباد کر رکھا تھا۔ اس صدی میں ایک طرف تو ۹۰ لاکھ سے زیادہ افراد قتل ہوئے اور دوسری جانب مذہبی اختلافات وجہ تفریق بنے ہوئے تھے۔ لوگ اپنے اپنے عقائد کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے قتل وخون سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ جن تارکینِ وطن نے وسطِ ایشیاء سے اناطولیہ ہجرت کی ان میں بے شمار علماء مشائخ، تاریخ ساز شخصیتیں جنھوں نے ان تارکینِ وطن کے ساتھ ہجرت کی ان میں سے ایک غیر فانی مثنوی معنوی کے خالق جناب مولانا جلال الدین رومی رحمت اللہ علیہ تھے جن کا وطن بلخ تھا اور خراسان سے آنے والے سلسلۂ صوفیہ بکتاش کے بانی حضرت حاجی بکتاش ولی رحم اللہ تھے جن سے بعد میں یونس اُمرے نے سعادتِ بیعت حاصل کی۔ ان دو بزرگوں کی تعلیم نے تاریخ پر بہت گہرے اثرات مرتب کیئے۔ مولانا روم مؤحد، فلسفی اور رموز واسرار کائناتِ عشق کے فارسی میں شارح ومفسر تھے۔ ان کے پیغام سے اثر پذیر ہونے والا طبقہ شہری آبادی کا تعلیم یافتہ تھا اور اشرافیہ پر مشتمل تھا جب کہ حضرت حاجی بکتاش ولی کے خُم کی صہبا آفاقی محبت، انسانی اخوت، عشق حقیقی سے لب ریز مولانا رومؒ ہی کی جیسی شدّ ومد، حرارت، گرمجوشی وسرمستی کا جذبۂ بے کراں لیے ساکنانِ کہستان کے لیے تھی جن میں کسان، دہقان، گلّہ بان ومزدور پیشہ جیسے سادہ لوح لوگ شامل تھے۔ وسطِ ایشیا کی ایک اور نامی گرامی صوفی شخصیت احمد یسوی رحمت اللہ کی بھی تھی، جنھوں نے عام دستور سے ہٹ کر روزمرہ کی ترکی زبان کو تصوف پر اپنی تصنیف ”حکم“ کے لیے منتخب کیا۔ لیکن احمد یسوی اور حاجی بکتاش ولی کی تعلیمات عشق ووارفتگی اور سوز دروں کو جس کو ایک واحد فقیر نغمہ نواز نے غیر فانی بنا دیا وہ سحر انگیز اور پر کشش شخصیت یونس اُمرے کی تھی۔ بعد میں بہت سے پست قامت شعراء نے اپنی تخلیقات کو یونس کے نام سے منسوب کر کے بقائے دوام حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن معیار، الفاظ کا در و بست، لب ولہجہ کی مٹھاس، غنائیت اور تاثیر نے کھرے کھوٹے کا فرق نمایاں کر دیا۔

ایک دلچسپ حکایت ہے کہ یونس اُمرے نے شام، آذر بائیجان اور قونیہ کا دورہ کیا تو اس

سفر میں مولانا رومؒ سے ان کی ملاقات ہوئی اور مولانا رومؒ سے انھوں نے بصد ادب کہا کہ آپ کی مثنوی مجھ جیسے معمولی آدمی کے لیے مشکل اور طویل ہے۔ مولانا کے چہرہ پر سوالیہ نشان پڑھ کر اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے یونس نے مزید کہا کہ اگر میں کہتا تو یوں کہتا کہ: ''میں عرشِ ازل سے فرشِ پر اترا، گوشت پوست کا لباس پہنا اور اپنے آپ کو یونس نام دیا۔''
یونس کو رومیِ ثانی کہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں کا فراق و درد یکساں ہے۔ یونس بھی اسی کیفیت

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　　وز جدائی ہا شکایت می کند

[بانسری سے سن کہ جب حکایت کرتی ہے (تو) جدائیوں کی شکایت بیان کرتی ہے]

سے سرشار اور ان کا عشق بھی سوزِ ازلی سے تپاں، بانسری کی طرح سینہ چاک اور ''نفخت''، یعنی انسان کے جسدِ خاکی میں اللہ کے پھونکے گئے امر سے مخمور ہے۔ وہ بھی مولانا رومؒ کی طرح جدائی کی مجسم تصویر و تفسیر ہیں۔ مولانا رومؒ کی زبان فارسی ہے اور وہ ایک عظیم قصہ گو، ماہر تمثیلات و تشبیہات ہیں۔ یونس اُمرے کی زبان ترکی ہے۔ دونوں عظیم شعراء حلیم الطبع ہیں، ایک جیسا حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ یونس اُمرے عوام کی سادہ پُرکار و خوبصورت زبان استعمال کرنے والے ایسے شاعر ہیں جن کی تشبیہات و استعارات شاندار و معنی آفریں مگر سہل اور صاف ہیں۔ ان کے کلام کو آج بھی ان ہی کی زبان میں بغیر کسی دشواری کے پڑھا سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کی تاثیر تر و تازہ اور سحر انگیز ہے جو توجہ کو گرفتار کرتی اور جوش و جذبہ سے سرشار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک حکایت کے مطابق جب یونس نوعمر تھے تو اناطولیہ میں سخت قحط پڑا اور ان کا گاؤں اس قحط سے بُری طرح متاثر ہوا۔ یونس کو اپنی ذات سے زیادہ اپنے پڑوسیوں اور گاؤں والوں کی فکر ستا رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ حاجی بکتاش ولی کی درگاہ محتاج اور فاقہ کشوں کی امداد کے لیے ہر وقت کھلی رہتی ہے، اگر وہاں جاسکو تو جا کر کچھ غلہ لے آؤ۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال، تھکے ہارے یونس درگاہ پہنچے تو حضرت بکتاش ولی کو اس مستقبل کے ولی کے دل کی کیفیت کا پہلے

ہی کشف ہو چکا تھا، انھوں نے درگاہ کے دربان کو بتا دیا کہ یونس نام کا ایک شخص آنے والا ہے۔ اس سے پوچھنا کہ اناج چاہیے یا ''برکت''؟ بھیڑیں چرانے والے اس نوخیز نے ''برکت'' کا لفظ پہلے پہل سنا تھا اور وہ اس کے معنی سے ناآشنا تھے۔ انھوں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا: کیا ''برکت'' اتنی ہی جگہ لے گی جتنی اناج اور کیا اس کا وزن بھی اناج کے برابر ہوگا ؟'' جواب ملا کہ ''برکت تو بہت چھوٹی سی جگہ میں سماسکتی ہے۔'' یونس کو خیال آیا کہ اس کے گاؤں میں تو لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں انھیں تو اناج ہی لے کر جانا چاہیے، بھلا ''برکت'' سے کس کا پیٹ بھریگا۔ چنانچہ جتنی اناج کی بوریوں کا بوجھ یونس اٹھا سکتے تھے، اتنی بوریاں لے کر وہ خوش خوش گاؤں واپس لوٹ رہے تھے۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا تو خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ''برکت'' کوئی سونا یا ہیرے جواہرات قسم کی چیز ہو جو اناج سے بہت زیادہ قیمتی ہو اور جسے فروخت کر کے بہت زیادہ اناج اور دیگر اشیائے خورونوش خریدی جاسکتی ہوں۔ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی؟ دیر تک اسی اُدھیڑبُن میں رہے اور اس یقین کے ساتھ کہ انھوں نے غلطی کی ہے اُلٹے پاؤں واپس لوٹے تاکہ ''برکت'' کے متعلق مزید معلومات حاصل کرسکیں۔ درگاہ پہنچنے پر انھیں بتایا گیا کہ ''ان کے حصہ کی برکت تو بکتاش سلسلۂ صوفیہ کے دوسرے شیخ حضرت تاپدوک امرے کو بھیجی جاچکی ہے، اس کے حصول کے لیے یونس کو شیخ تاپدوک کی درگاہ جانا ہوگا۔ یونس ایک تجسس اور خلش لیے اپنے گاؤں پہنچے۔ اناج گاؤں والوں کی نذر کیا اور شیخ تاپدوک کی درگاہ کا راستہ لیا۔ اللہ کے ولی شیخ تاپدوک کو اس نئے شاگرد کی آمد کا پہلے ہی سے علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس نووارد کو خوش آمدید کہا۔ اس درگاہ سے جس کو تُرکی زبان میں ''تکیہ'' بھی کہا جاتا ہے، یونس ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ یہاں انھوں نے ''یک در گیر و محکم گیر'' کا اصول اپنایا، قرآن وحدیث سے مزید آشنا ہوئے، شریعت کے احکام کو سمجھا اور طریقت کے اسرار ورموز سے کنجِ جاں کو آباد و منور کیا۔ اپنے شیخ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ سنتِ گلہ بانی کے پابند بھی رہے، تقویٰ اور پرہیزگاری کی منازل بھی طے کیں اور فیوض و برکات سے بھی مستفیض

ہوتے رہے۔ جو رشتہ مولانا رومؒ کا حضرت شمس تبریزؒ سے تھا وہی یونس کا شیخ تاپدوک سے تھا، جن کی تربیت میں یونس نے راہِ سلوک کی منزلیں طے کیں اور اپنے گاؤں اور شیخ کی نسبت سے ''اُمرہ'' نام سے یاد کیے جانے لگے۔ ایک دن اچانک شیخ نے یونس کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اب تمہارے قیام درگاہ کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے جاؤ اور مخلوق کو خالقِ حقیقی کے عشق کی تعلیم سے آگاہ کرو۔ پیکرِ عجز و انکسار، یونس یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے پاس ہے ہی کیا جس کی وہ دوسروں کو تعلیم دینگے۔ بہر حال اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں انھوں نے شیخ کے تکیہ کو خیر باد کہا اور گاؤں گاؤں بستی بستی فقیرانہ صدا لگاتے محوِ سفر رہے۔ استغناء کے اس پیکر کا کُل زادِ سفر ایک عصا، دستار، بدن پر موٹے چھوٹے پکڑے اور ایک گدڑی تھی۔ مورخین نے ان کا سراپا یوں بیان کیا ہے چھریرا، کسرتی، جفاکش بدن، گورا رنگ، روشن شربتی آنکھیں، ستواں پر کشش چہرہ، سنہری مائل بالوں کی شانہ نواز لٹیں، اور خش خشی داڑھی۔ زبان پر حمد و ثناء و نعت کے اشعار سجائے جدھر سے گزرتے لوگ ان کو قدر و منزلت سے دیکھتے اور سنتے۔ یونس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک دن پا پیادہ ایک بیاباں سے گزرتے ہوئے ان کی ملاقات دو درویشوں سے ہوئی، جنھوں نے حفاظت اور رفاقت کی خاطر شریکِ سفر ہونے کی دعوت دی جسے یونس نے قبول کر لیا۔ پہلے دن نمازِ مغرب کے بعد بھوک لگی تو ایک درویش نے دعا کی۔ اچانک ایک سمت سے کچھ لوگ نمودار ہوئے اور انھوں نے نان، بھنے گوشت، سبزی اور پھلوں سے ان کی تواضع کی۔ یونس پر ایک انجانا خوف طاری ہوا چلتے چلتے دوسرے دن غروب آفتاب کے بعد جب جسم سفر کی تھکن سے ہلکان ہوئے اور بھوک لگی تو دوسرے درویش نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور حسبِ سابق کچھ اجنبی خدّام نمودار ہوئے اور گزشتہ شب کی طرح دسترخوان سجا اور تینوں اصحاب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ یونس کی حیرت، خوف اور اس خیال سے رات بے چینی سے گزری کہ اگر کل کو انھوں نے مجھ سے فرمائش کر دی تو میں کیا کرونگا؟ بہر حال اگلے دن بھی سفر جاری رہا اور جب شام ڈھلی تو دونوں درویشوں نے یونس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''بھائی کیا آج کی شب ہم آپ سے کچھ

امید رکھیں؟'' یونس کے تو جیسے ہوش اڑ گئے۔ سخت پریشانی کے عالم میں آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یوں ملتجی ہوئے۔ ''اے میرے رب یہ سفر میں نے اپنی مرضی سے تو اختیار نہیں کیا تھا مجھے تو حکم دیا گیا تھا مجھے تو اس قسم کی کرامت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ میرے مرشد آپ کے محبوب ہیں۔ میں آپ کو ان سے آپ کی اور آپ کی ان سے محبت کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے خجالت وشرمندگی سے بچا لیجئے۔'' ابھی یہ دعا ختم ہی ہوئی تھی کہ پہلے کی طرح کچھ لوگ نمودار ہوئے اور دستر خوان آراستہ کرکے انواع و اقسام کے کھانے ومشروب سجا دیے۔ لیکن آج کی ضیافت مختلف اور بادشاہوں کی شان کے شایان تھی۔ دونوں درویشوں نے ششدر وحیران ہو کر یونس سے پوچھا۔ ''بھائی آپ نے کس کے واسطہ سے دعا مانگی تھی؟'' یونس میں کچھ اعتماد بحال ہوا اور انھوں نے الٹا درویشوں سے سوال کر ڈالا کہ پہلے آپ نے کس کے وسیلہ سے دعا کی تھی؟'' انھوں نے جواب دیا ''یہ تو کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں تو ہمارے مرشد نے شیخ تاپدوک اُمرے کے تکیہ سے وابستہ وفیض یافتہ بزرگ شیخ یونس اُمرے کے وسیلہ سے دعا مانگنے کی تاکید کی ہے۔'' یونس نے اپنے نفس پر ملامت کی، ان درویشوں سے اجازت چاہی اور اپنی راہ لی۔

جمال الدین سرور ادغلو کی رائے میں یونس اُمرے عشقِ مجازی کی راہ سے نہیں بلکہ طریقت کی راہ سے عشقِ حقیقی تک پہنچے۔ یونس عشقِ الٰہی کے مظہر اور ان کا فکر وعمل ''تخلقو بہ اخلاق اللہ'' یعنی اپنی ذات کو اللہ کے اخلاق واوصاف سے آراستہ کرو کا آئینہ دار تھا اور یہی فلسفۂ حیات اور جذبۂ بیکراں ان کے شعر ونغمہ میں موجزن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی ایک بیش قیمت مہلت ہے اور یہ ہی وہ مختصر عرصہ ہے جس میں اپنا رشتہ ہر دوسری شے سے توڑ کر اپنی ذات کو تمام کثافتوں سے پاک کر کے بندہ ذاتِ خداوندی میں حلول کر سکتا ہے۔ زندگی میں موت کی حقیقت کو یاد رکھنے سے ہی ابدی زندگی مل سکتی ہے۔ حدیث مبارک ''موتو قبل ان تموتو'' کی تفسیر وتشریح بھی علماء یہی کرتے ہیں کہ آفاقی حقیقت کا شعور وادراک اپنی ذات کے محدود دائرہ وحصار کو توڑ کر حاصل ہوتا ہے۔

یونس اُمرے کے کلام میں رباعیات، گیت اور نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ہر صنفِ سخن کے آخری شعر میں اکثر اپنا نام استعمال کیا ہے۔ ان اشعار میں ان کے نام کے علاوہ ان کا فسانۂ زندگی بھی نظر آتا ہے:

میں نہیں آیا فرشِ زمیں پر — تفریق وتخلیف کی خاطر
آپس، میں ہو پیار، محبت — یونس میری ذات کا مقصد

-----

موضوعات میں خالق کے ساتھ انسان کے عشق کا رشتہ، مخلوق کا ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کا تعلق:

ان کے لیے جو اپنے رب سے پیار کریں — اور اس کا سیدھا رستہ چاہیں
سارے جگ کے انسانوں کو — پہلے اپنا بھائی بنائیں

-----

فنا و بقا بھی ان کا خصوصی موضوع ہے:

جو دنیا میں آیا ہے اس کو واپس جانا ہے — وہ مہماں ہے، جلد اسے درپیش سفر ہے
اور عقبیٰ اس کا ٹھکانہ ہے

مرنے سے کیوں خوف ہے تجھ کو — عاشق زندہ اور امر ہے
موت سے کیا رشتہ ہے اس کا — روح ہی جس کی قدر وہی ہو

-----

آنے سے پہلے اس دنیا میں — تو نے اس سے عہد کیا تھا
جو سچا محبوب ہے تیرا — تو نے اس سے یہی کہا تھا
واپس ہونگا واں نہ رکونگا — عہد کا لمحہ یاد ہے تجھ کو؟

-----

نہیں رہنا مجھے اس جا کسی طور — میں آیا ہوں یہاں جانے کی خاطر

-----

تیرا عشق سمندر یارب، میں اس میں اک ماہی　　میں گر اس سے باہر آیا میں نے جان گنوائی

-----

میں سوداگر بہت کچھ بیچتا ہوں　　مرا پھیرا ہے اب تیری گلی میں
بہت کچھ مال ہے گٹھری میں میری　　خریدے، مفت لے جو تیری مرضی

-----

عشق میں تیرے میں دیوانہ　　مجھ کو تو بس تیری طلب ہے
کل میں تجھ سے کیوں بچھڑا تھا　　درد یہی ہے یہی تڑپ ہے

-----

ان کے کلام میں ایک واضح صوفیانہ علم، عجز و انکسار کا جذبہ اور انسانیت سے بے پناہ رواداری و اُنسیت کا رشتہ برقرار رکھنے اور ایثار کا پیغام ملتا ہے، جو ایک حدیث مبارک کا مفہوم بھی ہے:

اپنے لیئے ہم جو کچھ چاہیں　　سب کے لیئے بھی وہ ہی چاہیں
توراۃ، زبور، انجیل و قرآں، چار صحائف　　یکجا ہو کر ہم سب کو یہ بات بتائیں۔

-----

یونس کا ظرف ملاحظہ ہو کہ انھوں نے کھوکلی مذہبی رسومات ہر شکل کی قدامت پرستی اور اسلام کے نام پر لایعنی لن ترانی کے لیئے اپنی ہی ذات کو کڑی تنقید کا ہدف بنایا اور خود پر شدید لعن طعن کی ہے تا کہ ان کا ارتکاب کرنے والوں کی دل آزاری نہ ہو۔ یونس کے نزدیک ہر چیز کی اساس اور اصل عشق ہے۔ یہی انسان کی وجہ تخلیق بھی، انسان کامل کی جادہ و منزل بھی۔ گہری نظر سے دیکھیے تو یونس کی شخصیت ہر آلائش سے پاک صاف و شفاف وہ آئینہ ہے جس میں انفس و آفاق کا عکس نظر آتا ہے اور ان کی ذات وہ قطرہ ہے جو بحرِ وحدت کی آغوش میں گم ہو کر خود بحرِ بے کراں بن جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ یونس کی فقیرانہ ترنگ ان کی آواز نہیں بلکہ گنبد کائنات میں خود قوت تخلیق کی صدا گونج رہی ہے۔

یونس کا کلام وہ مقدس گیت ہیں جو صوفیاء کی محفلوں میں وجد و حال کی کیفیت پیدا کرتے

ہیں۔ ترکی کے علاوہ بلقان اور البانیہ میں بھی ان کے اشعار نجی محفلوں میں جب ترنم سے پڑھے جاتے ہیں تو سرور و انبساط کی فضا میں لوگ جھومنے لگتے ہیں۔ کلام کا حسن، سادگی، عام فہم زبان کی رنگینی و جادو بیانی، روزمرہ کا استعمال، محاورہ بندی، روانی، اور صوت و آہنگ کا وہ کیف آفریں سحر ہے جس کے ترجمہ کے لیے دنیا کی ہر زبان تہی داماں ہے۔ یونس مکتبہ دل اور درگاہِ عشق کے طالب علم تھے اور ان کو درجہ کمال تک پہنچانا ان کے مرشد کا کرشمہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق یونس بہت خوش الحان تھے اور اگر کبھی وہ دریا کے قریب قرأت سے قرآن پڑھتے تو بہتا پانی ٹھہر جاتا۔ واللہ عالم۔

ایک اور روایت کے مطابق یونس اُمرے کے وصال کے چند صدیوں بعد ان کے کلیات ایک تنگ نظر، دقیانوسی انتہا پسند نام نہاد ملا کے ہاتھ لگ گئے جو دین کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اس کا نام ملا قاسم تھا۔ یہ عقل کا دشمن ایک دریا کے کنارے بیٹھا ان کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتا اور بڑبڑاتا کہ یہ تو خرافات ہے یہ تو کفر ہے اور اُس صفحہ کو توڑ مروڑ کر پانی میں پھینک دیتا، اسی طرح اس بدبخت نے دو تہائی کلام کو کلیات سے نکال کر دریا برد کر دیا تا وقتیکہ وہ اس صفحہ تک پہنچا جس پر یونس اُمرے نے اپنی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انکشاف کیا تھا اور لکھا تھا: ''یونس تم حق بات کہو اس لیئے کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب کہ ملاّ قاسم تمہارا محاسبہ کریگا۔ اس مقام پر ملاّ قاسم کو ہوش آیا اور وہ صفحات کو تلف کرنے کے بعد بہت پچھتایا اور بے اختیار رو دیا۔ آج ہم تک جو یونس اُمرے کے کلام کا ایک تہائی انمول شعری اثاثہ پہنچا ہے وہ یونس کے کلیات کا وہی حصہ ہے جو ملاّ قاسم کی دست بُرد سے محفوظ رہا۔

سولھویں صدی میں عبدالباقی گول پنار بی نے بہت چھان بین کے بعد ایک مجموعہ یونس اُمرے کے کلام سے مرتب کیا ہے۔ جس میں ۱۳۰۷ء میں لکھی گئی ۱۵۷۵ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ''رسالتہ النصیحہ'' ہے جو فارسی بحر اور اوزان پر ہے۔ انھوں نے اس مثنوی میں انسانی اوصاف اور برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن ان کی شہرت کا انحصار ان کے دیوان پر ہے جس

میں ۲۵۰ نظمیں ہیں۔ کہیں بین السطور اور اکثر واضح طور پر فلسفہ 'وحدت الوجود' کا اظہار ہے:۔

یقیناً میں نہیں دیگر خدا سے ستارہ تھا میں قرنوں سے فلک پر
فرشتوں کو بہت محبوب تھا میں خدا نے جب کہا "کن" میں وہاں تھا
پر اس دم خاک کا پیکر نہیں تھا مرا تو نام بھی یونس نہیں تھا
میں وہ تھا اور وہ تھا میں متاعِ عشق جب اس نے عطا کی
تو اس لمحہ میں اس کے پاس ہی تھا

-----

ایک اور جگہ اِسی فلسفہ 'ہمہ اوست' کا ان اشعار سے اشارہ ملتا ہے:

ارض وسماں میں، این وآں میں اللہ سب میں رچا بسا ہے
ذات میں اپنی اس کو ڈھونڈو جدا نہیں کوئی ان دونوں میں
ایک ہیں دونوں

-----

شیخ ابن عربیؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے علاوہ عرب وعجم کے لیے بے شمار صوفیاء اور شعرا اس فلسفہ کے حامی ومعاون ہیں اور ثبوت کے طور پر قرآن وحدیث سے اس نظریہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، مثلاً

۱۔ ھوالاول ھوآلاخر ھوالظاہر ھوالباطن، وہی اوّل وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن
۲۔ اللہ نور السموات والارض۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے
۳۔ ھومعکم اینما کنتم۔ وہ تمہارے ساتھ ہے تم جدھر بھی رخ کرو۔
۴۔ فاینما تولوفثم وجہ اللہ۔ تم جس طرف بھی رخ کرو اللہ کا چہرہ اس طرف ہے۔

فلسفہ "ہمہ اوست" کا اظہار بہت سے اردو شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، چند اشعار:

خواجہ میر درد:

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے　　　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

-----

میر تقی میر:

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　　　اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

-----

غالب:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　　　درد کا حد سے گزرنا ہے فنا ہو جانا

-----

احمد ندیم قاسمی:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤنگا　　　　میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

-----

فلسفۂ ''ہمہ اوست'' کا ذکر ہو تو برصغیر کے تقریباً گمنام فارسی شاعر شاہ نیاز احمد بریلوی سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مصحفی کے استاد تھے جن کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف ''ریاض الفصحٰی'' میں کیا ہے۔

فارسی شاعر فخر الدین عراقی بادۂ ہمہ اوست سے مخمور تھے ان اشعار میں یہ تمثیلیں ملاحظہ ہوں:

گفتگوئے در زبانِ ما فگند۔۔۔ جستجوئے در درونِ ما نہاد

خدا اپنی گفتگو ہماری زبان میں کرتا ہے اور اپنی جستجو ہمارے دل کے اندر ڈال رکھی ہے۔

بر مثالِ خویشتن حرفے نوشت۔۔۔ نامِ او حرف، آدم و حوا نہاد

خدا اپنی طرح کے نقوش خود بناتا ہے اور ان کا نام آدم اور حوا رکھ دیتا ہے۔

ہم بہ چشم خود جمالِ خود بدید۔۔۔ تہمتے بر چشمِ نابینا نہاد

خدا اپنی آنکھ سے خود اپنا حسن دیکھتا ہے اور تہمت ہم اندھوں پر لگاتا ہے کہ ہم اس کا حسن دیکھتے ہیں۔

بعض مورخین ادب نے یونس کو غیر تعلیم یافتہ لکھا ہے جس کی پروفیسر فاروق قادری تاش نے تردید کی ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یونس شیخ سعدیؒ اور مولانا رومؒ جیسے شعرا کے کلام کو سمجھتے اور ان کا دوسروں کے لیئے ترجمہ بھی کر سکتے تھے۔ یونس کو عربی، فارسی، علوم دین، تاریخ اسلامیہ پر اور اپنے دور کے مروجہ علوم پر دسترس حاصل تھی۔ یونس مولانا رومؒ کے انتقال کے وقت ۳۵ برس کے تھے۔ وہ مولانا سے اپنی ملاقات کا ذکر اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ ایک عالم ہی کر سکتا ہے۔:

عارف رومی نے مجھ کو ایسی ایک نظر سے دیکھا قلب مرا آئینہ ہوا ہے اُس کے فیضِ نظر سے

بزم میں ان کی ساز بھی تھا اور صہبا بھی اور ملائک بھی حاضر، پر آنکھ سے پنہاں

-----

مجھ سے بولے:

اپنی جگہ پر بیٹھو یونس پر خاموش ہی رہنا بولنے والے اس محفل میں بیگانہ آداب سے ہیں

یونس، آج کے روز فقیہ احمد قطب الدین سلطاں سید نجم الدین اور رومی جلال الدین

عقدہ کشا موجود و عدم کے، سب یہ کہاں ہیں؟

-----

یونس کے کلام میں بعض مقامات پر حضرت منصور حلاج کا تذکرہ بھی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

دار پہ جب منصور نے یہ اعلان کیا تھا حق سے اپنے وصل کی سچی بات کہی تھی

یہ طفلانہ بات نہیں تھی اس نے کہا تھا ''میں ہی حق ہوں''

-----

روح کی تشنگی، علم و عرفاں کی پیاس، صراطِ مستقیم کی دریافت، اپنی خطاؤں پر ندامت و ملامت، محبوب اور وطنِ حقیقی کا عشق۔ بعض جگہ قرآن پاک اور احادیث کا تذکرہ، انبیاء اور اولیاء کے قصے بھی اور عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو ترکی زبان کا حصہ ہیں شامل ہیں۔

یونس اُمرے کے نزدیک انسان کائنات کا مرکز ہے۔ اللہ سے عشق انسانیت سے عشق کے بغیر نامکمل ہے۔ وہ باہمی مغائرت اور اجنبیت کے خلاف اخوت کا درس دیتے ہیں:
آگے بڑھیئے:

| | |
|---|---|
| آپ ہمیں اب اپنا ہمدم سمجھیں | ہم بھی آپ کو دوست ہی جانیں |
| زیست کو اپنی سہل بنائیں | حکم کریں خود ذات پہ اپنی |
| خود اپنے محبوب بنیں ہم | خود اپنے عاشق کہلائیں |

-----

انھیں تصادم اور چپقلش سے شدید نفرت تھی اور وہ دولت و مادّیت کو انسانی اقدار کا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا سروکار مقصدِ زندگی سے تھا نہ کہ اس تفصیل سے کہ زندگی کس طرح بسر کی جائے۔ ان کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ لوگوں کو پاکدامنی، صداقت اور سادہ زندگی گزارنی چاہیے۔ انسان کا مطمحِ نظر باطنی طہارت اور ناقابلِ تقسیم عشق الٰہی ہو۔ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ نامزد کیا ہے۔ اس لیئے اسے انتہائی باریک بینی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کا خیال اور اپنے دل کا زنگ دور کرنا چاہیے تا کہ اس آئینہ میں اپنے خالق کا دیدار کر سکے۔ یونس کو مال و دولت کے لالچ اور شہرت کی حرص سے شدید نفرت تھی۔ اس لیئے کہ موت کے بعد یہ چیزیں قطعاً لایعنی ہو جاتی ہیں۔:

| | |
|---|---|
| اک دین ایسا بھی آئیگا | ہاتھ کی مٹھی کھل جائے گی |
| گنگ ہو جائیں گی ساری زبانیں | دولت وزر جو جمع کیا ہے |
| وہ سب وارث لے جائیں گے | |

-----

ان کی شاعری میں ''فنا'' ایک دہرایا جانے والا موضوع ہے۔ لیکن اس کا اندازِ بیان افسردگی زدہ، مریضانہ اور سقیم نہیں بلکہ واعظانہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ زندگی ''اول و آخر فنا،

ظاہر و باطن فنا'' ہے اس لیئے اسے سورۃ ''والعصر'' کی روشنی میں گزارنی چاہیے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ ان اشعار میں کلام پاک کی سورۃ محمد آیت ۳۶ ''دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشہ ہے۔'' اور سورۃ الرحمان کی آیت ۲۶ '' ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہونیوالی ہے۔'' ان اشعار میں ان مضامین کا جو قرانِ پاک میں متعدد جگہ آئے ہیں، حوالہ ملتا ہے:

یونس اور تاپدوک سے پوچھو ان کے مطابق دنیا کیا ہے
یہ ہے فریب اور کھیل تماشا تم خود کیا ہو، میں خود کیا ہوں
سب کچھ فانی سب کو فنا ہے

-----

وہ ایسے عالم کو جو اپنے علم کا عمل میں ترجمہ نہ کر سکے گناہگار تصور کرتے ہیں:

جو یہ سمجھے چاروں صحیفے اس لیے اترے تا کہ انکو صرف پڑھے اور معنی سمجھے
پھر بھی عمل سے انکاری ہو، وہ عاصی ہے

-----

یونس کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کے لیے موت یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ اختلافات کی بنا پر جنگ، اپنے موقف پر بحث وتکرار، انانیت، غرور، تکبر، عداوت رنجش، غصہ یہ سب زندگی کو ضائع کرنیوالے اعمال ہیں۔ حضور صلی علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں کیا کسی کو کہیں غصہ کا شائبہ بھی نظر آتا ہے۔؟

غیض اس پر اور غصہ اُس پر تلخ زباں میں طیش میں بڑبڑ
تم درویش نہیں ہو سکتے گر اس راہ میں جائز ہوتا طیش اور غصہ
ہادی برحق، صلی اللہ علیہ وسلم آپ کبھی تو غصہ کرتے، برہم ہوتے
سچ جانو کہ طیش کے باعث تم درویش نہیں ہو سکتے

-----

انسان کو اپنی زندگی محبت اور انسان دوستی سے لبریز گزارنی چاہیے۔ آنے والی نسلوں کے لیے اس سے بہتر اور کوئی میراث نہیں ہوسکتی۔ یونس اُمرے کے نزدیک سب انسان برابر ہیں، لیکن ہر ایک کا عمل انھیں بہتر یا بدتر بنا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خام خیالی ہے کہ انسان گناہگار پیدا ہوا ہے۔ اور گناہ اس کی سرشت میں ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ حلم، تواضع، عفو، درگزر انسانیت کا خلاصہ ہے۔ وہ اس مروجہ روایتی نظریہ کی شدت سے مذمت کرتے ہیں کہ اللہ کے یہاں بخشش حاصل کرنے کا راستہ بہت خطرناک اور تنگ گلی سے گزرتا ہے اور نجات مختلف فرقوں کے لوگوں کے لیے ان فرقوں کے امیروں اور اماموں کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ ہر فرقہ کا یہ سمجھنا کہ وہی صحیح راستہ پر ہے اور دوسرے فرقوں کی منزل جہنم ہے، کُھلی گمراہی ہے۔ سارے مذاہب انسانی برادری کی وحدت کا درس دیتے ہیں اور ان کی یکجائی کے بطن سے خالق و مخلوق سے سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ دینِ حق سر میں ہوتا ہے، سرپوش اور جبہ و دستار میں نہیں۔ فرماتے ہیں:

میرے قریں تو مذہب و مسلک اور کسی کا جدا نہیں ہے دین سے میرے
سارے مذاہب باہم ملکر ایک اِکائی بن جائیں تو کوکھ سے اس کی عشقِ حقیقی پیدا ہوگا
سچے دین کا مسکن سر ہے
جو دستار کہ سر پہ سجی ہے اس میں دین نہیں ہے۔

-----

وہ انتہا پسندی کو شیطنت اور عدم مساوات کو انسانی اقدار کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے دعوت و تبلیغ کا کام لیا محکوم و مظلوم و مجبور کے حقوق کے علم بردار اور زمینداروں اور جاگیرداروں کی اصلاح کے آرزومند تھے۔ ان کی نظر میں حاکم اگر راہِ راست پر اور عادل ہو تو محکوم بھی نیک اور صالح ہونگے۔

حاکم، جب تو سیدھی راہ چلے گا لوگ بھی صالح ہو جائیں گے
تو شاطر، مکار ہو گر خود کیسے پھر وہ نیک بنیں گے؟

-----

یونس اُمرے کی شاعری ترک قوم کی بے باکی، آزادی و خودداری اور صوفیاء کے قلندرانہ مزاج کی آئینہ دار ہے۔ چھوٹے بڑے، طلبا و اساتذہ، وزرا ور سفارت کار، امام و مقتدی، کسان و دہقان سب ہی اپنی گفتگو کو پُر تاثیر بنانے کے لیے یونس کے اشعار حسن افزائی کے لیے بطور نگینہ استعمال کرتے ہیں۔ ترکی زبان کی شعری تاریخ میں یونس ایک ایسی نئی روایت کے بانی ہیں جس کی ابتدا بھی انھوں نے کی اور اس روایت کو نقطۂ عروج پر پہنچانا بھی ان ہی کا کمال ہے۔ ترک دانشور و محقق طلعت سید ہلمان کے قول کے مطابق گزشتہ سات صدیوں پر محیط ادبیات اسلام میں یونس اُمرے ہی سب سے زیادہ قد آور و ہر دلعزیز عوامی شاعر ہیں۔ اسلامی دنیا میں وسطِ ایشیاء برصغیر پاک و ہند میں بطور خاص صوفی شعراء نے ایک بیش بہا قیمتی اثاثہ چھوڑا ہے مگر سولھویں صدی کے اوائل سے اٹھارویں صدی کے وسط تک مغلیہ دورِ حکومت کے زیر اثر برصغیر کے اکثر و بیشتر شعراء کے زبان و بیان میں فارسی بندشیں اور تراکیب کی آمیزش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب و اقبال جیسے عظیم شعراء کے مقام و کلام اور ان کی تشریحات پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ اس کے برعکس چونکہ یونس امرے نے اپنی مادری اور عوامی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اس لیے دنیا عرصہ تک ان سے ناآشنا رہی اور اب جب ان کے کلام کو دوسری زبانوں کے علاوہ بطور خاص انگریزی تراجم نے متعارف کرایا تو دنیاء ادب میں ان کا ممتاز مقام اور بلند مرتبہ متعین ہو سکا ہے۔ خیال رہے کہ انگریزی زبان مشرقی فکر کی باریک بینی اور لطافتِ بیان، سوز و ساز و گداز کے اظہار کے لیے تنگ داماں ہے، اس لیے انگریزی تراجم اور اصل کے درمیان ایک حجاب حائل رہتا ہے۔ اردو میں نظیر اکبر آبادی جیسے اور بھی چند عوامی شاعر ہیں لیکن یونس اُمرے اس اعتبار سے مختلف و منفرد ہیں کہ انھوں نے بتانِ رنگ و نسل کو توڑ کر انسانی اخوت، ملی وحدت اور خزینہ معرفت کی میراث چھوڑی ہے۔ یورپی تنقید نگاروں نے جب یونس ایمرے کو دریافت کیا تو ان کے نزدیک یونس کے مزاجِ شعری کی گونج کو تین مغربی شعرا کے کلام میں پایا گیا۔ ان میں ایک اطالوی شاعر سینٹ فرانسس اَسّیسی تھا جو حسنِ فطرت کا شیدائی اور جس کے

کلام میں عارفانہ رنگ نمایاں ہے، دوسرے انیسویں صدی کا برطانوی شاعر ولیم بلیک ہے جس نے شاعری میں منفرد تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ اپنے عہد کی بے حسی، بے روح اور میکانیکی زندگی کے خلاف احتجاج بلند کیا۔ تیسری شخصیت انیسویں صدی ہی کے نوبل انعام یافتہ آئرش اساطیری شاعر ولیم بٹلر کی ہے جس کی غنائیہ شاعری سے نہ صرف خواندہ بلکہ ناخواندہ طبقہ بھی یکساں لطف اندوز ہوتا ہے۔ یونس امرے کی نمایاں و منفرد خصوصیت یہ ہے وہ انتہائی نرم اور شبنمی لب ولہجہ میں اپنے عہد کی بے روح مروجہ قدامت پرستی اور باہمی اختلاف پر دلگیر ہیں۔ اگر آپ یونس امرے، مولانا رومؒ، اور اقبالؒ کے کلام کا تقابلی مطالعہ کریں تو آپ پر یہ راز فاش ہوگا۔ یہ بادہ نوش ایک ہی ساقی اور ایک ہی میخانہ الست کی صہبا سے مخمور ہیں، انسان کی اصلاح کی تڑپ رکھتے، امت کی زبوں حالی پر نوحہ کناں اور اس کو اس کے اصلی اور گمشدہ مقام پر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ یونس اُمرے حیران بھی ہیں اور خوش بھی کہ ان کا حق آشنا دل کائناتِ عشق و معرفت کا ایک بیکراں سمندر اپنے پہلو میں رکھتا ہے، اپنے ہم مسلک منصور حلاج کی طرح وہ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| مجھ جیسا اِک دُرِ یتیم اور گوہر یکتا | قلزم نے کب دیکھا ہوگا |
| شورِ طلاطم، سرکش موجیں | اپنے اندر دیکھ رہا ہوں حیراں شاداں |
| قلزم گیر ہو جو اِک قطرہ ہے | میں وہ قطرۂ بے پایاں ہوں |
| قلزم میری ذات میں پنہاں | میں قطرہ بھی، میں قلزم بھی |

-----

یونس اُمرے کے شعری سرمایہ کے احاطہ کا ایک مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ ''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے''۔

---

نوٹ: یہ مضمون ڈاکٹر جمیل احمد صاحب، صدر شعبہ اردو، جامعہ واشنگٹن کی توجہ کا مرہونِ منت ہے جن کی مدد سے ترکی ادب پر تحقیقی مواد میسر آسکا۔ ڈاکٹر خلیل طوقار صاحب، صدر شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ترکی ناموں کو اردو کا قالب دیا اور حوالہ کے لیئے اپنا مضمون فراہم کیا۔ (مقالہ نگار)

## کتابیات


طوقار، ڈاکٹر خلیل، ''ترکی صوفی شاعر یونس اُمرے'' سہ ماہی ریسرچ جرنل ، بزم اقبال۔جلد: نمبر۳۔۴ [جولائی۔ستمبر ۱۹۹۸ء] صفحات

طوقار، ڈاکٹر خلیل۔ ''ترکی شعراء کے کلام میں پیغام محبت واخوت، اظہار اتحاد و یکجہتی''۔ سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد [جولائی۔ستمبر ۲۰۱۳ء] صفحات ۱۰۸۔۱۲۹

Asya, Firat. Yunsu Emre: the great Turkish mystic, selected articles translated from Turkish by Ceviren. Ankara,Turkey: Feryal Malbaasi, 1991

Helminski, Kabir, and Refit Algan, The Drop that became the sea: Lyric poems of Yunus Emre, translated from the Turkish, Putney, VA: Threshold Books, 1989.

Smith, Martin, The Poetry of Yunus Emre, a Turkish Sufi Poet. Berkley, CA: Univ.of California Press, 1993.

Koprulu, Mehmed Fuad. English mystics in Turkish literature: tr, & ed. By Gary Leiser and Robert Dankoff. NY: Routledge,2006.

Baskal, Zekeriya. Yunus Emre: the sufi poet in love. Ny: Blue Dome Press, 2010.

Encyclopedia of Religion, 1993. Volume 15-16, "Yunus Emre " pp.544-545.

Derin, Suleman, "The tradition of sulh among the sufis; whith special reference to Ibn Arabi and Yunus Emre. Journal Academci Studies. Volume 27, No. 7, (Nov.2005.Jan.2006): p.1-13

ترجمہ: محمد طارق علی

# فرانسس ڈبلیو پری شٹ (امریکہ)

# رلف رسل کا مطالعہ غزل

معروف ادبی جریدے ''اینول (Annual)'' کے قارئین یہ بات جانتے ہوں گے کہ رلف رسل کی مشہور کتاب ''اردو ادب کی جستجو'' (The Pursuit of Urdu Literature) پر ولیم ایل ہناوے نے ۱۹۹۴ء میں تبصرہ کیا تھا جو تجزیاتی نوعیت کا تھا۔ اس پر رلف رسل نے اپنے تاثرات ''اینول'' کے ۱۹۹۵ء کے شمارے میں پیش کیے عنوان تھا ''فرانسس ڈبلیو پری شٹ اور ولیم ایل ہناوے کے جواب میں''۔ اس میں رسل نے پیش کردہ تجربات کی بنیاد پر ہم دونوں کی خوب کھنچائی کی ہناوے کی شامت اُس کے مذکورہ تبصرے کی وجہ سے آئی جب کہ میری خبر اُس تحقیقی کام پر لی گئی جو میں نے کئی سال کی مشقت کے بعد مکمل کر کے چھپوایا تھا اور اس میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ سماجی حقائق کے برعکس اردو شاعری میں غزل کا ادبی مقام اور فنی ہیئت کی اصل حقیقت کیا ہے اپنے جواب میں رلف رسل نے موضوع کے حق میں جو دلائل دیئے اُن کی بنیاد پر اس نے ہمیں ردِعمل ظاہر کرنے کی دعوت بھی دی۔ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے میں اب یہاں موضوع کے اہم نکات پر بات کروں گی لیکن صرف اپنا نکتہ نظر پیش کروں گا۔ اِن نکات پر میری پروفیسر ہناوے سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

تقریباً تیس سال قبل رالف رسل اور خورشید الاسلام نے اپنی مشہور کتاب ''تین مغل شاعر'' (۱۹۶۸ء) میں میر تقی میر کے بارے میں پہلی بار یہ بات لکھی کہ وہ ایک مثالی کلاسیکل غزل گو شاعر ضرور تھا لیکن اس کی شاعرانہ عظمت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق قدیم دور کے جنسی فحاشی کے مخالف ہندوستانی معاشرے سے تھا اُس نے ٹوٹ کر جس لڑکی سے عشق کیا وہ اس کی کزن تھی، لیکن تاعمر اُس کے لیے لاحاصل رہی۔ اس عشق نے میر کو حقیقتاً پاگل کر دیا تھا۔

تاہم اصل زندگی کا یہ جذباتی تجربہ اس کی شاعری کا مرکزی نقطہ یا محور بن گیا۔ وہ اپنی ناکام محبت کا سارا درد سمیٹ کر شعروں کے روپ میں ڈھالتا رہا اور یوں اس نے اپنی شاعری کو جذبے کی مثالی گہرائی، دلی خلوص اور ایک حد تک آن بان عطا کی۔ گو میر کا اسلوب بہت سادہ اور پُر کشش تھا، تاہم میرے نزدیک اس کی تخلیقات ایک صحیح الدماغ آدمی کی کاشوں ایسی نہ تھیں۔ اور یہی وہ ایک بات ہے جس نے مجھے میر کے بارے کچھ لکھنے کی تحریک دی اور ایک ادنیٰ گریجوایٹ طالب علم ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی زندگی کا حقیقتاً پہلا عالمانہ رنگ و انداز کا مقالہ لکھا۔ اس میں میں نے میر کی شعر گوئی کو اپنا موضوع بنا کر اس کی تخلیقی حدود پر بحث کی۔ اپنی اس جرأت مندانہ تحریر پر مجھے اس وقت جتنی ہیجان خیز خوشی حاصل ہوئی اسے میں آج تک نہ بھلا پائی در حقیقت میں میر کے فن کی جتنی بڑی معترف تھی، اتنا ہی زیادہ اس سے اختلاف بھی رکھتی تھی۔

۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی رلف رسل کی تازہ کتاب "Hidden in the Lute" یا (جس پر میں نے اسی جریدے میں کسی جگہ تبصرہ بھی لکھا ہے) میں مصنف نے ایک بار پھر اپنے غزل کے معاشرتی تصور کا اعادہ کیا ہے۔ کہ "غزل محبت کے بارے میں ایک خاص تصور کو لے کر آگے چلتی ہے بالکل ویسا ہی تصور جو ازمنۂ وسطیٰ کے یورپی معاشرے میں پایا جاتا تھا'' اور وہ یہ کہ محبت کسی طرح بھی درست جذبہ نہیں اور معاشرے میں اس جذبے کی شدت صورتِ حال کو واضح کرتی ہے۔۔۔۔'' محبت کو بندھے ٹکے اُصولوں کی پابند سوشل زندگی کے خلاف ایک خطرہ سمجھا جاتا تھا (صفحہ ۱۲۹) جب اس جذبے کو دبانے میں ناکافی ہوتی تھی تو سخت سزائیں دی جاتی تھیں (صفحہ ۱۲۹)۔۔ پکڑے جانے پر پیار کے دونوں متوالوں کو ان کے خاندان والے قتل کر سکتے تھے'' اس ماحول میں عورتوں کے لیے خطرات خاص طور پر زیادہ تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک عورت اپنے عاشق سے عشق کے دوران اس بات کی ضرورت محسوس کرتی تھی کہ خواہ اس کی محبت کو زِدہی کیوں نہ کرنا پڑے، پہلے اس عاشق کی ثابت قدمی کو آزمایا جائے اور پھر وہ اس سے ایسا سلوک کرتی تھی کہ جسے مرد ''ظلم عظیم'' گردانتا تھا۔ ایسا سلوک اس وقت جاری رہتا

تھا جب تک عورت کو یہ اعتبار نہیں آجاتا تھا کہ مرد پر کچھ بھی کیوں نہ آبنے، وہ اسی کا وفادار رہے گا'' (۱۳۱) یہاں میر تقی میر کی مثال بطور خاص پیش کی جا سکتی ہے۔ جو ''معاملاتِ عشق'' نامی کتاب میں ''اپنی داستانِ عشق خود بیان کرتا ہے''۔ میر کی تصنیف کردہ اس کتاب کو رلف رسل ایک معتبر خودنوشت سوانح حیات سمجھتا ہے۔ رسل کے نثری ترجمے کے مطابق، میر عشق میں اپنی کیفیت دل کچھ اس طرح بیان کرتا ہے: ''میں اُس (محبوبہ) کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا اور اس کے بغیر مَر جاؤں گا۔'' رسل مزید لکھتا ہے ''وہ اپنی غزلوں میں اسی خیال کو مسلسل پیش کرتا ہے'' (ص ۱۳۵) تاہم رسل نے یہ بات نہیں لکھی کہ دراصل اردو کا ہر کلاسیکی غزل گو شاعر اپنے کلام میں یہی کچھ کہتا ہے۔

اس طرح میؔر کی حد تک یہ بات ایک مسئلہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اُس کے اپنے اعترافِ عشق کو ایک طرف رکھ دیں اور ہمیں کچھ خارجی ذرائع سے اُس کے عشق کی بابت یہ پہلے ہی سے معلوم ہو جائے۔ (اور چند ثانیوں کے لیے ہم سوچ لیتے ہیں کہ ہمیں یہ بات بیرونی ذرائع ہی سے ملی ہے) کہ وہ اپنی کزن کو بہت شدّت سے چاہتا تھا، تب بھی ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس کے اشعار کا پس منظر اُس کی نجی زندگی سے متعلق سہی پھر بھی وہ غزل کے روائتی اشعار لگیں گے۔ تاہم شہرت کلام اپنی جگہ، میر کے مختلف منتخبہ اشعار بھی یہ بات ثابت نہیں کرتے کہ وہ بالخصوص اس کی اپنی زندگی کے عشقیہ پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ یعنی واقعیت'' لیے ہوئے ہیں۔ سو شاعری اور سوانح کا باہمی تعلق کلیتہً یک طرفہ سا ہے۔ ہم یہ بات کہنے کی کوشش یا دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ کسی سوانح کے ذریعے شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ (جیسا کہ مفروضہ طور پر ''خارجی'' ذرائع سے حاصل ہونیوالی معلومات کی روشنی میں ہم نے میؔر کے چند اشعار کا مختلف انداز میں مطالعہ بھی کیا ہے) لیکن اصل بات یہ ہے کہ شاعری کے ذریعے کسی کے حالاتِ زندگی کا پتہ لگانا محض خواب دیکھنے والی بات ہے۔ یہاں میں یہ بات حتمی طور پر کہنا چاہوں گی کہ اگر ہم روایات کی روشنی میں شاعری کو اپنی تسلی کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں شاعر کے چند ایسے منتخب

حصوں کے مطالعے کی ضرورت نہیں جو کسی نقادانہ فتوے کے مطابق بعض سانحی یا معاشرتی حوالوں سے کچھ معلومات فراہم کرتے ہوں اور یہ بھی کہ شاعری کے مطالعے کے لیے پسند یا انتخاب اہمیت رکھتا ہے رسل میر کے اپنے اشعار کو ہرگز قابل اعتنا نہیں سمجھتا جن میں کسی ''خوب صورت لونڈے'' کو محبوب کا درجہ دیا گیا ہے۔ رسل میر کے ان اشعار کو بھی اہم نہیں گردانتا۔ جن میں شاعر ترک اسلام کا اس طرح دعویٰ کرتا ہے گویا وہ واقعی ''مرتد'' تھا۔

رلف رسل میر کے مذکورہ مضامین والے اشعار کو دو طرح لیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اردو شاعری کی روایت پسندی کو تسلیم کرتا اور یہ مانتا ہے کہ ''روایات کا استعمال محض روایات کے استعمال کے سوا کچھ اور نہیں۔ اگر شاعر ایسا کچھ لکھتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اس لیے کہ وہ جن سماجی حالات میں لکھ رہا ہے ضروری نہیں کہ اس کی کہی ہوئی کسی بات کا اطلاق ان حالات پر ہو یا نہ ہو (صفحہ ۹۸) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے انداز کے مطابق استعاروں کا استعمال بھی کرتا ہے مثال کے طور پر شاعری میں نظر آنے والے ایک جذباتی عاشق ہی کو لے لیجیے۔ وہ کوئی چھیل چھبیلا بانکا جوان ہے یا محض کوئی ٹرک ڈرائیور، اس بارے میں قاری کو کچھ علم نہیں ہوتا'' سو شاعری ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ شاعر اصل میں کن ذاتی یا سماجی حالات کو سامنے رکھ کر اشعار تخلیق کر رہا ہے۔ ہمیں اشعار کے ذریعے زیادہ بہتر اور عمدہ معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں لیکن یہ ہمیں سوانحی حالات کا امتیاز یا انہیں شناخت کرنے کی فہم نہیں دیتے۔''

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے رسل کہتا ہے۔ ''وہ جذبات کیا ہوتے ہیں جن کا اظہار شاعر روایات کے ذریعے کرتے ہیں (صفحہ ۹۸) میرے نزدیک یہ سوال ذرا غیر متعلق سا ہے تقریباً سبھی کلاسیکل غزل گو شاعر اپنے اپنے کلام میں ایک ہی قسم کے بنیادی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً والہانہ لگاؤ عشق میں ثابت قدمی، مصائب و مشکلات، جدائی کی تڑپ وغیرہ۔ پھر ان کیفیات کے اظہار میں وہ مختلف صوفیانہ رنگ بھی پیدا کرتے ہیں۔ شاعر اپنے کلام میں کیوں کر جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس بات کے تجزیے سے ہم ہرگز یہ جاننے پر قادر نہیں ہو

سکیں گے کہ میر اور غالب کیوں کر اپنے ہم عصروں سے بلند نظر آتے ہیں۔ اپنے اس تجزیئے کے ذریعے ہم اُس کشش کی بھی تشریح نہیں کر سکیں گے جو جگہ بہ جگہ برپا ہونے والے ''طرحی شاعروں'' میں پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم یہ تجزیہ کریں کہ ان کلاسیکی شاعروں نے اپنے اپنے مخصوص طرز ہائے کلام کیوں کر اپنائے، شعروں کی بُنت کیسے کی اور اپنے ہم عصروں کی قدر یہ شاعری کو کیوں کر جانچا، تب ہم ان اساتذۂ فن کی شان کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔

رلف رسل اس بات کا تہیہ کیئے ہوئے ہے کہ دنیائے اردو غزل کو سماجی حالات سے جتنا ممکن ہو سکے۔ الگ کر کے پرکھے اور سمجھے لیکن ساتھ وہ یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ اگر ہم اردو غزل کی روایات فارسی اور ترکی کی ادبی روایات کے سلسلوں سے جُڑے سِروں کو الگ کر کے بھی دیکھیں ''تب بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ ایرانیوں ترکوں اور عربوں کو یہ روایت ملی کہاں سے؟ وہ ان روایات کے ذریعے کن حقیقی تجربات کی نمائندگی کرتے ہیں؟'' رسل کے سے نظریوں کو ''امتیاز پسندی'' ایسے مشکل سوال کا سامنا رہتا ہے تو ''معیار'' سے متعلق فیصلے کیوں کر کیئے جائیں۔ اگر پوری اردو شاعری ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرتی حالات ہی سے پھوٹتی ہے اور ایک وسیع تر مفہوم کے مطابق، تمام شاعر ان ہی حالات سے ابھر کر نکلتے اور ان حالات کے تجربوں سے گزر کر معتبری کی سند پاتے ہیں تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کون سے شاعر کن کن شاعروں کے مقابلے میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔

رسل کے معاملے میں لگتا یوں ہے کہ ایک بڑے ادبی رتبے کو پرکھنے کی کسوٹی صرف ایک خاص قسم کے اخلاص ہی کو سمجھا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں اُس کا اپنا ایک جامع سا بیان کچھ یوں ہے ''وہ ایک چیز جو بڑے شاعروں کو بڑا بناتی ہے، یہ ہے کہ وہی کچھ وہ لکھیں جسے وہ خود اہمیت دیتے ہیں اور وہ چیز کسی نہ کسی نداز میں ان کے اپنے تجربے میں آئی ہو (صفحہ ۱۰۴) کسی شاعر کی قدر کا اندازہ لگانے کے لیے جو کوئی بھی اس کسوٹی کو استعمال میں لائے گا، اُسے جلدی ہی علم ہو جائے گا کہ یہ قطعی طور پر ایک الجھن اور غیر مفید ہے لیکن رسل اسی اصول کو لے کر آگے چلتا اور

اسے ایک خاص جذبے یا احساس کی قوت کے ساتھ منتقی کر دیتا ہے۔ یہ اس کی گہری ذاتی خواہش کا نتیجہ ہے وہ کہتا ہے" وہ ایک سبب کہ یہ بات کیوں میرے ذہن میں آئی ہے اور میں کیوں یہ جانتا ہوں کہ عظیم شاعروں کو یہ ادراک ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں کیا کہتی ہیں۔ یہ ہے کہ اُنھیں اس بات کی آگہی ہے کہ میں بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں بلکہ میرا ایمان ہے کہ محبت کسی بھی رنگ کی ہو، غیر مشروط طور پر اچھی ہوتی ہے، خواہ وہ جنس مخالف سے محبت ہو یا ہم جنس پرستی والا لگاؤ ہو میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ انسان دوستی کا جذبہ گو میری حد تک مذہبی بنیاد پر نہیں ہے،۔لیکن یہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک لازوال طرز عمل ہے۔ مجھے بنیاد پرستی سے نفرت ہے اور صرف اس بات کو درست سمجھتا ہوں کہ عام لوگوں سے برتاؤ کے دوران ہم پوری سچائی سے کام لیں اور جن آدرشوں کو صحیح سمجھتے ہیں، ان کو تمام تر خلوص کے ساتھ سر بلند رکھنا چاہیے خواہ اس کے لیے کیسی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ کوئی بھی شخص ایسا قابلِ تسلیم ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ بڑے غزل نگار شاعران باتوں پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔"

بے شک یہ تمام اعتقادات بہت دل نشیں ہیں، ایسے کہ ان میں سے کئی ایک کو بہت سے لوگ مانتے ہیں لیکن اس حقیقت کو سمجھنے میں ہمیں کوئی دیر نہیں لگتی کہ مرزا غالبؔ بہادر شاہ ظفر سے کیوں بڑا شاعر تھا تاہم جب میر، غالبؔ اور ایسے ہی دیگر اساتذہ کی فنی خوبیوں کو دریافت کرنے، ان کا تجزیہ کرنے اور ان خوبیوں سے لطف اٹھانے کی بات آئے گی تو اس صورت میں ظفرؔ اور غالبؔ والی کسوٹی کام نہیں آئے گی۔

ظاہر ہے کہ رلف رسل نے از خود بڑے شعراء کے سر اپنے "انسانیت نوازی" والے خیالات کو منڈھ دیا ہے اور ان خیالات یا اصولوں کی مدد سے اس نے ان کی عظمت کی ایک کسوٹی تیار کی ہے لیکن وہ دراصل یہ بات بتانے سے قاصر رہا کہ بڑے شعراء کرام تو حقیقتاً پہلے ہی ان خیالات سے متفق ہیں۔ سو محض اتنا کہہ دینا کہ "وہ ایک چیز جو بڑے شاعروں کو بڑا بناتی ہے" ایک کم تر سی بات لگتی ہے۔ صرف ایک دلیل جو وہ اپنی بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے بڑی

''خاموش'' یا کمزور سی ہے یعنی ''کوئی بھی شخص ایسا قابلِ تسلیم ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ بڑے غزل نگار شاعران باتوں پر ایمان نہیں رکھتے تھے''۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فقط یہی ایک جملہ کوئی بہت مضبوط دلیل نہیں ہے اور اس کی کہی ہوئی وہ انسانیت دوستی والی محض ایک بات ہمیں باور کرانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اردو کے بڑے شاعر اپنی اصل زندگی میں وہی تھے جو کچھ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کہتے تھے۔ (انھوں نے جو کچھ اپنی غزلوں میں کہا اسی پر ایمان رکھتے تھے'') یہ ناممکن سی بات ہے صنفِ غزل ایک بہت ہی روایات سے معمور طرز اظہار ہے۔ اس کے چیدہ اشعار شخصی ایقان سے تشکیل پاتے ہیں منتخب اشعار دنیا کے کسی بھی موضوع سے آراستہ کیئے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ شخصی عقائد بھی اشعار میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر ذہنی طور پر تن درست تھا یا سودائی، مقید تھا یا آزاد، مذہباً کیا تھا ہندو یا کچھ اور۔ زندگی سے ہار چکا تھا یا واقعی زندہ تھا۔ غزل کی تغیر پذیری والا مزاج ایک نہ ختم ہونے والے جادو کی طرح ہے۔ اپنے موضوعات کے اعتبار سے غزل ایک جگمگاتی دنیا ہے کیونکہ اس میں انسانیت کے دکھ سمٹ آتے ہیں، نامکمل خواہشوں والے انسانی تجربے اس کا حصہ بنتے ہیں اور پھر طرز بیاں بھی ایک ہی طرح کا نہیں، اس میں مجازی رنگ بے شمار اقسام کے ہیں جو کسی بھی شخص کی جذباتی اور ذہنی رویوں کا احاطہ کرتے ہیں یہی نہیں اس میں ایسے مضامین بھی باندھے جاتے ہیں جو دھڑکنوں سے لبریز چاہتوں کی تمام شعوری حدوں یا قانون شکن روائتوں کو قاری کے سامنے لا رکھتے ہیں غزل کے اشعار کی عمدگی پُر جوش اور موثر زبان کے استعمال پر منحصر ہے۔

میر تقی میر اور اسد اللہ خاں غالب اگر زندہ ہوتے تو وہ رلف رسل کے بنائے ہوئے کسی اصول یا پیمانے کو اپنی شاعری کی تشریح یا اپنے کلام کے معیار کو جانچنے کے لیے اس کی کسی کسوٹی کو ہرگز سنجیدگی سے قبول نہ کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دونوں اور دیگر اساتذہ محض اپنی اپنی شاعرانہ شان پر بہت فخر نہ کرتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنا فنی معیار اونچا کرنے بلکہ اپنے شاگردوں کے فن میں بھی مہارتیں پیدا کرنے کے لیے اپنا بہت سا وقت اور زر صرف کرتے تھے تاکہ طرحی

مشاعروں کے دوران براہ راست مقابلوں میں برتری ثابت کی جا سکے۔ ایسے مقابلوں میں یہ اساتذۂ فن نہ صرف اپنے بلکہ مدِ مقابل شعراء کے مقام کا جائزہ معاشرتی میل ملاپ، انسانیت نواز خیالات، جذباتیت اور خلوص کی فراوانی کے پیمانے سے نہیں بلکہ لسانی اور تخیل کی بلندی اور فنی مہارت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرتے تھے۔ اپنی کتاب "Nets of Awareness" میں مَیں نے ہندوستان میں اُس وقت کے ادبی ماحول میں جنم لینے والی فنی تکراروں/ مباحث، یا ہمی اصلاح اور تنقیدی تجزیوں کا فی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کاموں میں بڑے بڑے استادانِ فن بڑی سنجیدگی سے حصّہ لیا کرتے ہے۔ تاہم خوش قسمتی سے ہم یک طرفہ طور پر شاعروں کی فنی قابلیتوں کا اندازہ لگانے کے چکر میں نہیں پڑے۔ گو ہمیں اس بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں کہ بڑے شاعر حضرات اپنے فن کے بارے میں کتنا پُر یقین ہوتے تھے۔ ہمیں یہ معلومات تذکروں، خطوط، کہاوتوں اور ادبی مضامین وغیرہ کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں، میں نے اپنی مذکورہ کتاب میں کچھ دستاویزی ثبوت بھی پیش کیے ہیں اور آئیندہ برسوں میں تذکروں کے مطالعے کے بعد مزید ثبوت مہیا کیے جائیں گے۔

---

نوٹ: یہاں یہ دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ رلف رسل اور فرانسس ڈبلیو پری شٹ دونوں نقاد پرانے قریبی دوست ہیں۔ کلاسیکل اردو غزل ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور وہ دونوں چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر ان کی بحث و تکرار کبھی ختم نہ ہو، زندگی بھر چلتی رہے۔ (رسل اب اس دنیا سے سدھار چکے ہیں)

# شاکر کنڈان

## رائدِ سیف و قلم ۔۔۔ نطشے

Nietzsche signed up for one year of voluntary service with the Prussion Artillery Division in Naum Bung, How-ever a' bad riding accident in March 1868 left him un-fit for service.(again) He served on the Prussian side during the Prussian war of 1870 to 1871 as a medical orderly. In his short time in the military, he experienced much and witnessed the traumatic offects of battle. (Wikipedia, Encyclopedia)

ول ڈیورانٹ (Will Durant) اسی مضمون کی نسبت سے لکھتا ہے کہ:

''نطشے جب ۲۳ سال کی عمر کو پہنچا تو قانون کے مطابق اسے فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ اگر چہ اس کی بینائی بھی کمزور تھی اور وہ ایک بیوہ عورت کا اکلوتا بیٹا تھا جو کہ اس نے بھرتی کے وقت بتایا بھی لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی ساڈوا اور سیڈان کے اسی دور میں فلاسفرز کو بھی اس لیے فوج میں لیا جاتا تھا کہ دشمن کی ایک آدھ گولی کو تو روکیں گے ہی۔ وہ کچھ ہی عرصہ بعد گھوڑ سواری کے دوران گرا جس سے اس کی چھاتی پر شدید چوٹیں آئیں اور اُسے فوج سے فارغ کر دیا گیا اور اس نے فوج میں بہت کم عرصہ ملازمت کی لیکن سپاہی کی زندگی سے اسے اُنس ہو گیا جس میں حکم کے ساتھ ہی تعمیل، تحمل، نظم و ضبط جیسی زندگی نے اس کے دل کو موہ لیا۔''

اور پھر ساری زندگی وہ سپاہیانہ سوچ کے ساتھ کاربند رہا حتیٰ کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پروفیسری کے زمانے میں بھی پروفیسر کم اور جنگجو زیادہ تھا اور جن افراد کی بھی اس نے

تعریف کی یا جو شخصیات اس کا آئیڈیل تھیں ان میں جنگ باز فوجی زیادہ تھے وہ سپاہی، اشرافیہ اور جمہوریت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''سپاہی کا مقام بورژوا سے بلند تر ہے لیکن اشرافیہ سے کم تر۔ ایسا آجر جو انسانوں کو نفع اندوزی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے رتبہ و منزلت میں اس جرنیل سے کم تر ہے جو میدان جنگ میں انسانوں کو شہرت و حشمت کی دوائے بیہوشی کا ٹیکہ لگا دیتا ہے غور کیجیے کارخانے میں کام کرنے والے لوگ کس طرح خوش خوش میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں نپولین قصاب نہ تھا بلکہ نسل انسانی کا محسن تھا اس کی قیادت میں سپاہی مرتے تھے تو عسکری جاہ و جلال اور طمطراق کے ساتھ مرتے تھے نہ کہ شہروں میں افلاس زدہ بھوکوں کی طرح۔ لوگ گروہ در گروہ جنگ کے خون آشام دیوتا کی خدمت میں جا کر حاضر ہوتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ میں خطرہ ضرور تھا لیکن کم از کم انسان کو اُکتا دینے والے پیشوں سے رہائی تو ملتی تھی ایک دن آئے گا کہ لوگ نپولین کی عزت کریں گے کہ اسی نے دنیا میں انسان کو سپاہی کا ایسا مقام عطا کیا تھا کہ اس کا رتبہ تاجر اور بنیئے سے بڑھ گیا تھا جن لوگوں کو یہ مرض لاحق ہو گیا ہو کہ روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہوں مزے کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو گئے ہوں اور نفرت کے سزاوار بن گئے ہوں اور ان کے لیے لڑائی بہت اچھا علاج ہے کہ اسی کے لیے وہ جبلتیں پھر عمل پیرا ہوتی ہیں جو امن کے زمانہ میں خوابیدہ رہتی ہیں۔ جمہوریت میں جو نسوانیت کا عنصر ہے اس کا توڑ لڑائی اور عمومی بھرتی ہے۔ جب کسی معاشرے کی جبلتوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ لڑائی اور تسخیر کو خیر باد کہہ دیں تو سمجھ لیجیے کہ زوال شروع ہو گیا ہے اور اب یہ معاشرہ جمہوریت کے قیام اور تاجروں کی حکومت کے لیے تیار ہے۔''

نطشے کو رائدین جدیدیت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے وجودی فکر کی توسیع کی اور منطقی اقدار کے خلاف فرد کی بے شمار صلاحیتوں اور زندگی کے جبر اور صعوبتوں کی ایک ساتھ نمائندگی کی

اس کے مطابق انسان دنیا میں بالکل بے سہارا ہے اور اس احساس ناکامی کو ختم کرنے کے لیے وہ طاقت کے حصول کا عزم کرتا ہے اور آخر میں انسانیت سے بالاتر انسان یا سپر مین بن جاتا ہے یہی سپر مین یعنی فوق البشر ہونے کا فلسفہ اس کو ایک ایسے مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ بے سرو پا باتیں شروع کر دیتا ہے وہ روایتی اخلاقیات اور مذہبی عقائد پر یقین نہیں رکھتا اور آدمی کو نیستی (Nothingness) کی دنیا میں دیکھتا ہے مزید یہ کہ وہ شرک کی حد کو پہنچ جاتا ہے اس کے مشرکانہ نظریات سے اس کے دوست بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے ایک ایسے شخص میں جو حقیقی زندگی میں کسی کیڑے مکوڑے کو مارنے کی جرات بھی نہیں رکھتا تھا وہ اپنے نظریات سے آسمان کو مسلنے پر اتر آیا تھا اور وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ "خدا مر گیا ہے" اس کے دوست ویگنر نے تو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ "نطشے پاگل ہو گیا ہے"

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا ایک ہی دوست جو باقی رہ گیا تھا نطشے اس سے بھی ملنے سے اجتناب برتنے لگا۔ لیکن ویگنر کی یہ بات سچ ثابت ہوئی اور وہ ایک دن اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ نطشے کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا لیکن وہ مذہب سے اتنا دور ہو گیا تھا کہ انجیل کے بارے میں لکھتا ہے:

"جوں جوں انسان انجیل پڑھتا چلا جاتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی روسی ناول کی فضا قائم ہوتی جا رہی ہو ایسا لگتا ہے کہ انجیل روسی مصنف دوستو وسکی کے خیالات کا سرقہ ہے اس قسم کے خیالات صرف ادنیٰ درجہ کے انسانوں کو پسند آ سکتے ہیں اور ایسے زمانہ میں مقبول ہو سکتے ہیں جب حکمرانوں نے زوال پذیر ہو کر حکومت کرنا ہی چھوڑ دیا ہو۔"

دراصل نطشے بچپن سے لے کر آخری لمحوں تک جن حالات سے گزرا وہ اس کی سوچ کو، دکھوں اور غموں کے علاوہ کسی اور سمت لے جا ہی نہیں سکتے تھے اس نے صعوبتوں اور مشکلوں کے شدید ادوار سے گزر کر اپنے آپ کو منوایا۔ نطشے جس دن یعنی ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوا اس دن پروشیا کے بادشاہ فرڈرک ولیم کی انچاسویں (۴۹) سالگرہ منائی جا رہی تھی سو اسی نسبت سے نطشے

کے والد نے اس کا نام فریڈرک ولیم نطشے رکھا نطشے کا والد جس کا نام وکی پیڈیا میں کارل لڈوگ جبکہ ۲۰ عظیم فلسفی میں نطشے لکھا ہے پادریوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جب کہ نطشے کی ماں کے خاندان کے اکثر لوگ اور والد بھی پادری تھے یوں فریڈرک نطشے ددھیال اور ننھیال دونوں سلسلوں سے ایک مکمل مذہبی خاندان کا چشم و چراغ تھا اس کی پیدائش سیکسونی (Saxony) کے صوبے پروشیا کے شہر لیپزگ (LaipZig) کے نزدیک روکن (Roken) کے ایک چھوٹے سے گاؤں روئین کے مقام پر ہوئی دو سال بعد ۱۸۴۶ء میں اس کی بہن الزبتھ فارسٹر نطشے پیدا ہوئی۔ جب کہ ایک بھائی لڈوگ جوزف ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوا۔

نطشے کی عمر ابھی پانچ سال تھی کہ اس کا والد ۱۸۴۹ء میں وفات پا گیا پھر ایک سال بعد اس کا چھوٹا بھائی بھی یہ دنیا چھوڑ گیا۔ اب نطشے گھر کی چار خواتین یعنی والدہ، دو پھوپھیاں اور ایک بہن کے ساتھ گھر میں رہ رہا تھا ان عورتوں نے اس کے بہت ناز اٹھائے۔ یہی ماحول کا اثر اسے نسوانیت اور نفاست کی طرف لے گیا۔ نطشے کو پہلے ایک بوائز سکول میں اور پھر ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کروایا گیا۔ بعدازاں اس نے ۱۸۶۴ء میں نامبرگ شہر سے گریجویشن کیا۔ اس عمر میں نطشے کو مذہب سے لگاؤ تھا وہ انجیل کا بہت زیادہ مطالعہ کرتا تھا اور اس کے ساتھی اسے چھوٹا پادری کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

گریجویشن کے بعد اس نے بون یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن ایک سمسٹر ہی مکمل کر پایا تھا کہ ماں سے ناراضگی کے باعث اس نے تعلیم چھوڑ دی اور یونیورسٹی آف لیپزگ میں آ گیا یہیں اس کی پہلی تصنیف شائع ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں اسے فوج میں جانا پڑا جہاں سے وہ مارچ ۱۸۶۸ء میں واپس لوٹا اور دوبارہ اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اسی دوران اس کی ملاقات موسیقی کے استاد الاستاذہ رچرڈ ویگنر سے ہوئی جو یونیورسٹی کے نزدیک ہی رہائش پذیر تھا۔ نطشے نے اس یونیورسٹی میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ تجربہ حاصل کیا اور روایتی تعلیم سے ہٹ کر بہت کچھ سیکھا۔ اس کا لسانیت میں یونیورسٹی کے ذہین ترین طالب علموں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے شاعری،

سائنس، یونانی ولاطینی زبانوں کا مطالعہ کیا۔اس کی بینائی بہت کم تھی اور وہ اتنا کمزور تھا کہ سورج کی روشنی سے اس کا سر چکرانے لگتا اور درد اتنا شدید ہوتا کہ چیخنے لگتا یوں بغیر روشنی کے کمرہ اس کی آماجگاہ ہوتا تنہائی کے ایسے لحات کتنے کٹھن ہوتے ہیں یہ وہی بتا سکتا ہے جس پر بیت رہے ہوں۔لیکن نطشے نے اس تنہائی سے نمٹنے کے لیے موسیقی سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا جب وہ سازوں سے دل بہلا رہا ہوتا تو خود کو خوابوں کی دنیا میں پاتا اور پھر یہی خوابوں کی دنیا ہی اس کی زندگی بن گی وہ خیالوں اور خوابوں میں گم اپنے اندر ایک توانائی محسوس کرتا خیالوں خیالوں میں آباؤاجداد کی مہمیں اور جنگیں لڑا کرتا جس سے اس کے اندر تشدد پیدا ہوتا گیا لیکن جسمانی طور پر وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا تھا۔شاید اس کی کمزوری اس کے متشدد ہونے کا سبب تھی۔اس نے موسیقی کی ایک دھن بھی تیار کی جس کا نام 'دکھ' رکھا۔یہاں اتنا بتا تا چلوں کہ یہ تبدیلی اس میں اٹھارہ سال کی عمر میں آئی تھی جب وہ گریجویشن کر رہا تھا حالانکہ اس سے پہلے بائبل کا مطالعہ اور مذہب سے اسے ایک قربت تھی لیکن اچانک ہی اس کا مذہب کے روایتی خدا سے اعتماد اٹھ گیا اور اس نے ایک نئے خدا کی تلاش شروع کر دی پھر تمام عمر وہ اس کوشش میں مصروف رہا کہ جسمانی اور معنوی طور پر سخت کوشی کے مرحلے طے کرے تا کہ اس کی ذات معیاری مردانگی کا نمونہ بن جائے وہ لکھتا ہے۔

''جو اوصاف مجھ میں نہیں ہیں میرے لیے وہی فضیلت اور وہی خدا ہے''

نطشے چونکہ جوان تھا اور جوانی کے اپنے بھی کچھ خواب اور کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور جو وہ پورے نہ ہوں تو انسان کی زندگی نئے نئے اور عجیب عجیب راستوں پر چل پڑتی ہے اب نطشے نے شراب پینی شروع کر دی تھی گندے لطیفوں سے دل بہلاتا اور فحش شاعری کرتا۔اپنی بے بسی کو مٹانے کے لیے وہ کبھی کبھی فاحشہ عورتوں کے پاس بھی چلا جاتا۔باٹرن کی کتاب ''چائلڈ ہیرولڈ'' ان دنوں کافی مشہور تھی جس میں عنفوان شباب کی للکار تھی۔بلکہ اسے عنفوان شباب کی بائبل کہا جاتا تھا نطشے نے اسے خاص طور پر پڑھا لیکن۔۔۔۔ یہ سب کچھ چند مہینوں میں ہوا اور وہ پھر اپنی

دنیا میں لوٹ آیا جہاں وہی تنہائیاں تھیں اور وہی سوچیں۔

نطشے نے ابھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں لی تھی اور وہ زیر تعلیم تھا کہ ایک اچھی پیشکش ہوئی جسے اس نے قبول کر لیا اور بیسل یونیورسٹی میں استاد مقرر ہو گیا ابھی اس کی عمر پچیس سال بھی نہیں ہوئی تھی یہ سلسلہ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۹ء تک رہا جب کہ اسی دوران اسے دوبارہ فوج میں طلب کر لیا گیا لیکن فارغ ہونے کے بعد وہ پھر یونیورسٹی میں واپس آ گیا اب اس کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں گزرنے لگا اور اس نے بہت زیادہ کام کیا۔

۱۸۷۹ء نطشے کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس سال اسے درد کے ایک سو سے زائد دورے پڑے۔ سردرد کی اس بیماری کے بارے میں ڈاکٹر نے اسے مزید تشویش میں ڈال دیا۔ اس نے نطشے کو تنبیہ کی کہ اس کا دماغ بتدریج مفلوج ہو سکتا تھا وہ پہلے ہی بہت کمزور تھا اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہو کر مرنے والا ہے اس کی عمر ۵۳ سال تھی اور اسی عمر میں اس کا والد بھی فوت ہوا تھا نطشے نے پروفیسر شپ کو الوداع کہہ دیا اور سازگار موسم کی خاطر میرین بار چلا گیا مگر وہاں کی دھوپ بھی اس کی برداشت سے باہر تھی لہٰذا اس نے خود کو چوبارے میں بند کر دیا اور موت کا انتظار کرنے لگا اس نے اپنی بہن سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد صرف میرے دوستوں کو تابوت کے قریب آنے کی اجازت دو گی اور عوام کو میری لاش سے دور رکھو گی۔ کیونکہ وہ خواہ مخواہ ہر بات کی کرید کرتے ہیں اور دیکھنا کوئی پادری یا کوئی اور شخص میری قبر پر کھڑا ہو کر جھک نہ مارے کہ میں اس وقت مدافعت نہ کر سکوں گا میں کافر اور مُشرک ہوں اور اسی حیثیت سے مجھے قبر میں اتار دینا"۔

لیکن اس کے بعد اس نے اپنی فوق البشر کی فلاسفی پر سوچنا شروع کیا۔ اس نے اپنے ہی اس قول پر عمل کر کے زندہ رہنا شروع کر دیا کہ " کائنات میں اگر کوئی حقیقی دیوتا ہے تو وہ خود انسان ہے۔"

گویا اس میں زندہ رہنے کی ایک خواہش سی پیدا ہو چلی تھی اور وہ یورپ کے مختلف مقامات پر پھرتا رہا۔ ۱۸۸۲ء میں اس کی ملاقات ایک دوشیزہ لوسلومی سے ہوئی۔ نطشے اور سلومی نے یہ گرمیاں تھرنجیا اور ٹاٹنبرگ میں اکٹھے گزاریں اس سے نطشے کے اندر محبت کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ سلومی کو اپنا سمجھنے لگا لیکن اس نے شادی کی درخواست کی تو سلومی نے انکار کر دیا اس پر بھی نطشے ناامید نہیں ہوا بلکہ خوش فہمیاں دل میں لئے مزید آگے قدم بڑھایا جس پر سلومی نے بالکل ہی دھتکار دیا اور جب اس نے ایک دوسرے آدمی سے شادی کر لی تو نطشے شکستہ دل، ناکام محبت کو سنبھالے واپس اپنی راہ پر لوٹ آیا۔ محبت کی اس ناکامی کے بعد اس نے ساری زندگی مجرد گزار دی۔ شادی کے بارے میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''تو جوان ہے اور چاہتا ہے کہ شادی کرے اور پھلے پھولے لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ آیا تو ایسا شخص ہے کہ تجھے بچے پیدا کرنے کا حوصلہ ہو؟ کیا تو فاتح ہے؟ کیا تو نے اپنے نفس کو مطیع کر لیا ہے؟ اپنے حواس کو مسخر کر لیا ہے؟ کیا تجھے اپنی فضیلتوں پر حکومت کرنے کا ملکہ حاصل ہو گیا ہے؟ یا یہ بات ہے کہ تیری تمنا احتیاج پر مبنی ہے یا تو جانوروں کی طرح افزائش نسل کا خواہاں ہے؟ کیا تو تنہائی چاہتا ہے یا اپنے آپ سے برسرپیکار ہونے کا متمنی ہے؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ تیری فتوحات اور تیری آزادی اولاد کی خواہاں ہو تو اپنی فتوحات اور اپنی آزادی کی یادگار کے طور پر عمارات زندہ تعمیر کر۔ اس تعمیر کا اسلوب ایسا ہو کہ تو دور کی منزلوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھے لیکن یہ ضروری ہے کہ تو پہلے خود اپنی روح اور اپنے جسم کو طاقتور بنا لے صرف یہی نہیں کہ تو اپنی نسل پیدا کرے گا بلکہ تیری اولاد انسانیت کی بلندیوں کی طرف بڑھے گی میری نظر میں شادی یہ ہے کہ دو نفوس مل کر ایک ایسی مخلوق پیدا کریں جو اپنے خالق سے افضل وارفع ہو جو لوگ انسانیت کی بلند منازل کی طرف رواں ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ شادی درحقیقت احترام یک دیگر ہے کیونکہ ایک اعلیٰ تر مخلوق کی ضامن ہے۔''

اس تحریر کو سامنے رکھ کر اگر نطشے کے شادی نہ کرنے کے فیصلے پر غور کیا جائے تو اس کی سوچ، بیماری، لاغر پن، ہر پل کے دکھ، نسوانیت کا عمل دخل، اس کی مجبوریاں اور معذوریاں سب اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ فیصلہ صحیح تھا کیونکہ سلومی نے اس سے دوستی تو کی لیکن جب نطشے کے قریب ہو کر اسے مکمل طور پر پرکھا تو اس کے عادات وخصائل اور کمزوریوں کے باعث شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک بار نطشے کی بہن نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا کہ ''فلسفی کے لیے بیوی کی بجائے، بہن زیادہ اچھی ہوتی ہے'' لیکن بہن آخر کب تک بھائی کے لیے اپنی خواہشات اور امنگوں کو قربان کرتی رہے اسے تو نظام فطرت کی لاج بھی رکھنی ہے اور یہ ہوا کہ ۱۸۸۶ء میں الزبتھ کی شادی برہارڈ فاسٹر نامی شخص سے ہوگئی جو یہود دشمن تھا جسے نطشے ناپسند کرتا تھا کیونکہ یہودیوں اور غیر یہودیوں دونوں کے لیے اس کے دل میں کوئی غصہ یا کوئی تلخی کبھی نہیں رہی۔ الزبتھ شادی کے بعد خاوند کے ساتھ پیراگوئے چلی گئی اس نے بھائی کو خراب صحت کے باعث اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن وہ نہ مانا وہ یورپ کو چھوڑ کر کہیں اور جانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اُسے کسی کل چین نصیب نہیں تھا لہذا سوئٹزرلینڈ، وینس، جنیوا، نائس، میرین بیڈ اور ٹیور بن تک کا سفر کرتا رہا۔ اور اپنے سکون اور چین کی راہیں تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر جس قدر بے سکون ہوتا قلم میں اتنی ہی روانی آجاتی اور سوچ میں نئے نئے بھنور بنتے۔ نئے فکری زاویے اور نئے نئے پہلو اس کے سامنے آتے۔

۱۸۸۱ء کا سال نطشے کے لیے ذرا بہتر رہا اس کی صحت بھی قدرے بحال ہوگئی سو اس نے اپنے آپ کو لکھنے پڑھنے کے لیے وقف کر دیا۔ شاید جس طرح طوفان آنے سے پہلے سمندر میں خاموشی اور سکون آتا ہے نطشے کے لیے یہ سال ایسا ہی تھا اور وہ دانشور تھا اس بات کو جانتا تھا لہذا کسی طوفان کی آمد سے پہلے وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اور واقعی اس سال اس نے بہت کچھ لکھا۔ پھر وہ اپنی سوانح حیات لکھنے پر غور کرنے لگا۔ کہ ۱۸۸۹ء کا آغاز ہوگا اس وقت وہ ٹیورین میں مقیم تھا نئے سال کا آغاز اس کی زندگی کی بچی کھچی رعنائیاں، سکون بلکہ عام دکھ، درد اور غم چھین کرلے گیا۔

''۳ جنوری ۱۸۸۹ء کو جب اس کی عمر ۴۵ سال تھی اس کو ذہنی دورہ (مرگی) پڑا وہ پیانو پر

بیٹھا موسیقی کی جنونی سرمستی میں کنجیوں کی تختی پر ہاتھ مار رہا تھا۔اس کے گال سرخ ہو رہے تھے "رات ہو گئی ہے تمام بہتے ہوئے چشموں کا شور بڑھ گیا ہے۔۔۔رات ہو گئی ہے عاشقوں کے سارے نغمے جاگ اٹھے ہیں"۔۔۔میں ڈائیونی سس ہوں۔۔۔وہ چلایا۔۔۔"میں خوشی کا خدا ہوں"

اور یہ اس کے نظریہ فوق البشر کی انتہا تھی۔اب وہ طوفان آ گیا تھا جو سمندر کی خاموشی کے بعد آنا ہوتا ہے۔۔۔نطشے کمرے میں گرتا پڑتا کسی طریقے سے پہنچا اور دوستوں کو دیوانوں کے سے خطوط لکھے۔اس نے واگنر کو صرف چار لفظ لکھے "میں تمہیں چاہتا ہوں"

برینڈر کو ایک طویل تر خط لکھا جس کے خاتمے پر اس نے اپنے لئے "مصلوب" کا لفظ استعمال کیا۔ برخ ہاٹ اور اوور بیک کو ایسے عجیب و غریب مکتوب لکھے جو انہیں ۶ جنوری کو ملے۔۔۔اوور بیک فوراً ٹیورین پہنچا اور اسے باسل میں لے جا کر ایک پاگل خانہ میں داخل کروایا جہاں سے اس کی والدہ فرانزسکا نے اسے جینا کے ایک کلینک میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو اسے نامبرگ میں اپنے گھر لے گئی اس دوران اس کے دوستوں اوور بیک اور گاسٹ نے اس کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کے بارے میں رابطے شروع کر دیئے۔

۱۸۹۳ء میں نطشے کی بہن الزبتھ بھی پیراگوئے سے اپنے خاوند کی وفات کے بعد واپس آ گئی اس نے پھر بھائی کی دیکھ بھال کا ذمہ اپنے سر لیا اور ساتھ ہی اس کے کام کا مطالعہ شروع کر دیا۔

۱۸۹۷ء میں نطشے کی والدہ فوت ہو گئی تو نطشے کو ویمر منتقل کر دیا گیا۔اس پورے عرصے میں کبھی کبھی نطشے کو ہوش آتا تو وہ کوئی نہ کوئی بات کر دیتا ایک دن اس کی بہن اسے دیکھ کر رونے لگی تو اس نے کہا:

"الزبتھ کیوں روتی ہو؟ کیا ہم خوش نہیں؟

ایک بار کتابوں کی باتیں ہو رہی تھیں تو اس کے زرد چہرے پر جیسے روشنی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے کہا "میں نے بھی بعض اچھی سی کتابیں لکھی ہیں"

نطشے کی دیوانگی کا عرصہ گیارہ سال پر محیط ہے۔۔۔اور بالآخر فرزانگی میں لحہ لحہ مرنے والا یہ شخص دیوانگی کی اتنی مدت سکون سے گزار کر ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گیا اس کی وفات کے بعد اس کی بہن نے اسے روکن کے چرچ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کیا اور بعدازاں اپنے بھائی کی سوانح عمری لکھی جب کہ اس کا کام اس کی زندگی میں ہی ترتیب دے دیا تھا۔نطشے کی جو کتب ہمارے سامنے آئیں ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

1. Birth of Tragedy(1872) 2. Thoughts out of season (1873 and 1876) 3. Human, All to Human,(1978) 4. Day break (1881) 5.The joy fall wisdom 1882 6. The Gay science. (1882 and 1887) 7. Thus spoke zarathustra (1883) 8. Beyond Good and Evil (1886) 9.On the Gerealogy of Morals (1887) 10. The case of Wagner (1888) 11. The Twilight of the idols (1888) 12. The Anti Christ. (1888) 13. Ecce Homo. (1888) 14. The will to power.(1889)

آخری کتاب نطشے کی بہن نے مرتب کی اور اس میں اس کا جو بھی مواد الز بتھ کو ملا شامل کیا۔ ان کے علاوہ نطشے کی تحریروں پر اس کے نظریات پر اور اس کی شخصیت پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔جن میں سے چند معروف کتابیں یہاں درج کی جاتی ہیں

1. The philosophy of Nietzsche by Mencken (2) Neitzsche the thinker, by Baltor (3) The portable Nietzsche, by walter kaufmann (4) Life of Friedrich Nietzsche by Halery (5) The Wagnar Nietzche correspondence (6) The young Nietzsche by Elisabeth Forster Nietzsche.

سیدعابدعلی عابد لکھتے ہیں کہ نطشے کے تعارف کے لیے بہترین تالیف "Beyond Good and Evil" ہے جب کہ (The will to power) میں نسبتاً زیادہ مواد ہے۔

نطشے فلسفہ، نفسیات، موسیقی، ادب اور شاعری کے علاوہ لسانیات میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے اس نے بہت سے نئے خیالات دیئے اگر چہ وہ تضاد کی زد میں رہے بہت سے ناقدین نے انہیں قبول نہیں کیا لیکن ان کو بہر حال بحث کا حصہ ضرور بنایا گیا اور اس سے بھی انکار نہیں کہ اپنے عہد پر اس کو گہرا اثر تھا نہ صرف اس دور کے فلاسفرز بلکہ ادیبوں اور فنکاروں پر بھی نطشے کی فکر اور سوچ کے دائرے کو بڑھانے کے لیے اس کی بہت سی کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی شائع ہوئے اردو زبان میں بھی اس کی کچھ کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں لیکن جس نے زیادہ شہرت پائی ''زرتشت نے کہا'' یہ کتاب ایرانی پیغمبر زرتشت کی زبان میں نطشے کے اپنے اقوال ہیں اس نے اپنے گیتوں کو جس طرح ایک پیغمبر کی زبان سے ادا کرایا بڑی عجیب او بذات خود متنازعہ بات ہے اور غالباً نطشے کا یہی وہ نظریہ ہے جو اُسے Good And Evil کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے ایک گیت کا نثری ترجمہ ملاحظہ کیجئے

''دیکھو دیکھو زرتشت پہاڑوں سے اتر کر شہر کے دروازوں کی طرف آرہا ہے جنگل میں وہ ایک راہب گوشہ نشین سے ملا تھا جو اپنی دعائیں پڑھ رہا تھا اس نے پادریوں کو دیکھا جو قربانیاں دے رہے تھے اور اب جب کہ وہ شہر میں آیا تو وہ تاجروں، ماؤں اور بیٹیوں کو دیکھتا ہے جو جھکے ہوئے ہیں اور خدا سے پناہ مانگ رہے ہیں کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں تک ابھی یہ خبر پہنچی ہو کہ ''بھگوان مر گیا ہے'' نبی زرتشت نے اس پرانے قصے کو دفن کر دیا ہے ایک نیا زمانہ شروع ہو گیا ہے سارے دیوتا مر کھپ گئے ہیں کیا اب ہم چاہتے ہیں کہ فوق البشر زندہ رہے؟ تمام مخلوق اشیاء اب تک اپنے آپ سے آگے نکل گئی ہیں زندگی کی طوفانی لہریں اوپر ہی اوپر کو اٹھتی ہیں۔۔۔ اچھا تو کیا تم اس عظیم چڑھاؤ کے اتار ہی پر مطمئن ہو؟ کیا تم یہ چاہو گے کہ آدمی سے آگے نکلنے کے بجائے پیچھے جاؤ اور حیوان بن کر رہ جاؤ؟ بات اب یہاں نہ رکے گی۔ انسان کے آگے بوزنے کی کیا حیثیت ہے؟ یہی ناں کہ وہ تمسخر کا نشانہ ہے اور شرمناک وجود ہے! یہی حالت فوق البشر کے مقابلے میں

انسان کی ہوگی۔۔۔ تمسخر کا نشانہ اور شرمناک وجود"۔

حوصلہ کرو میرے ہم جنسو! وہ زنگ آلود اور بوسیدہ قدریں تار تار کر ڈالو جنھوں نے انسانی نسل کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے بار بار خود کہو اور اس پر فخر کرو۔ میں تم کو نہ صرف خود ہی کہنے بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے کا بھی حکم دیتا ہوں بات یہ ہے کہ تمہارے خیالوں اور جذبوں کے پیچھے ایک قادر مطلق دیوتا چھپا ہوا ہے۔۔۔ اور اس کا نام۔۔ میرے بھائیو۔۔۔ نفس ہے وہ تمہارے بدن میں رہتا ہے۔۔۔ وہ تمہارا بدن ہے۔۔۔ وہ مسلسل تم سے کہتا ہے "اپنی مسرت تلاش کرو!" بار بار وہ تم سے کہتا ہے کہ جب سے انسانیت معرض وجود میں آئی ہے انسان نے اپنے آپ سے بہت کم لطف اٹھایا ہے میرے بھائیو! یہی ہم سب کا گناہ آدم ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ لہو انسان کی روح ہے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دلوں میں پائی جانے والی نفرت اور حسد پر شرمسار نہ ہو نفرت اور حسد کرنا شاندار ہے تم مجھ سے پوچھتے ہو کیا وہ اچھی علت ہے جو جنگ کو بھی محترم بنا دیتی ہے؟ میں تم کو جواب دیتا ہوں کہ وہ اچھی جنگ ہے جو علت کو محترم بنا دیتی ہے۔

یاد رکھو میرے بھائیو! کہ انسان برابر نہیں ہیں ابدی انصاف کا کہنا یہی ہے کہ مضبوط اور طاقتور بنو، نڈر بنو، میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ چھوٹے لوگ جس شے کو گناہ کہتے ہیں اس پر ہنسو اس کا تمسخر اڑاؤ۔ تم جو خودی کو مقدس اور خدائی قرار دینے والے ہو تم خود غرض، شہوانیت اور ہوس اقتدار کو کھلے عام انسانوں کی سچی خوبیاں قرار دو گے لو میں انسانوں کے درمیان پھرتا ہوں اور وہ میرے لیے مستقبل کے ریزے ہیں میں زندگی کے عروج سے آگے دیکھتا ہوں میں انسانوں کی ایک نئی عظیم تر اور زیادہ انفرادیت پسند نسل کی آواز بنتا ہوں ان کے حصول قوت کے ارادے کی آواز۔۔"

نطشے اپنی اس تخلیق کو ایک وژن قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"کیا انیسویں صدی کے آخر میں کسی کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ شاعر جو زیادہ محنت کش عہد میں رہتے تھے انھوں نے الہام کے بارے میں کیا کہا ہے، اگر نہیں تو میں بتاتا ہوں۔۔"

''الہام کی کیفیت وہ ہوتی ہے جب کوئی بہت ہی زیادہ ہلا دینے والی اور بے چینی پیدا کرنے والی چیز ایک دم سے دکھائی دینے لگتی ہے اور جس کی آواز سنائی دینے لگتی ہے اتنی صحیح اور بالکل مناسب طور پر کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔۔۔''

یہ ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ جس کے خوفناک دباؤ سے کبھی کبھی آنسو بہنے لگتے ہیں اور اس دوران آدمی غیر ارادی فوری ردعمل یا ارادی بے عملی کے درمیان معلق رہتا ہے یہ ایک ایسا احساس ہے جو آدمی کو بالکل اپنے سے الگ کر دیتا ہے ہر چیز بغیر ارادے کے وقوع پذیر ہوتی ہے جیسے کہ کسی کو مکمل آزادی مل گئی ہو طاقت ہو گئی ہو اور روحانیت حاصل کی گئی ہو امیج اور شباہتیں ایک دم وارد ہوتی ہیں آدمی کو یہ خیال نہیں رہتا کہ کون سا عکس ہے اور کون سی شباہت۔ ہر چیز فوری طور پر بالکل صحیح اور سادہ الہام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔'' جس طرح شادی کے بارے میں نطشے کا زاویۂ فکر اوپر بیان ہو چکا ہے اسی طرح عورت کے بارے میں بھی اس کے خیالات کچھ اچھے نہیں تھے اپنی اسی کتاب ''گفتۂ زرتشت'' میں وہ کہتا ہے کہ:

''عورتیں دوستی کی قابل نہیں۔۔۔۔ یہ جنگجو انسانوں کی تفریح طبع کے لیے ہیں'' وغیرہ وغیرہ (Beyond Good and Evil) میں وہ لکھتا ہے۔

''ہمیں عورت کو اپنی مملوکہ تصور کرنا چاہیے۔ جیسے اہل مشرق اسے ایک شے مصرفہ سمجھتے ہیں''

حالانکہ یہ اس کی غلط فہمی ہے دراصل میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نطشے کو جن حالات سے واسطہ پڑا اور جو محرومیاں اس کے حصے میں آئیں ایک حساس شخص ہونے کے ناطے وہ اپنے اندر کا زہر اگلتا رہا۔ یہ صرف اس کا مسئلہ ہیں ہر حساس اور محروم شخص جب سوچتا ہے تو وہ مثبت حوالے سے پیک (Peak) پر ہوتا ہے یا منفی حوالے سے۔

نطشے پر بہت تنقید ہوئی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا:

''بات یہ تھی کہ نطشے بیمار رہتا تھا۔ اس لیے تنہائی پسند ہو گیا تھا پھر اس کا مزاج بھی اعصابی تھا۔ اسے انسانوں کی عمومیت اور سُستی کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ

نکلا کہ وہ یہ سمجھنے لگا کہ جلیل القدر فضائل وہ ہیں جو تنہا رہنے والے آدمیوں میں پائے جاتے ہیں شوپنہار نے یہ کہا تھا کہ فرد نوع میں مدغم ہو جاتا ہے نطشے نے کہا کہ فرد کو تمام معاشرتی قیود سے دامن بچا کر آزادی حاصل کرنی چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ آزادی غیر متوازن ہو گی وہ محبت میں ناکام ہوا تو عورتوں کے خلاف ایسی تلخ باتیں کہہ ڈالیں جو ایک فلسفی کو زیب نہیں دیتیں اور نہ کسی انسان کے شایان شان ہیں۔ اسے ماں باپ کی محبت نصیب نہیں ہوئی اور دوستی سے بھی محروم رہا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ زندگی کے بہترین لمحات کا دارومدار دوستی اور اخوت پر ہوتا ہے یہ لمحات تسخیر کائنات اور جنگی فتوحات کے ذریعے حاصل نہیں ہوتے۔ اس نے عمر بھی کم پائی اس لیے اس کی بالغ نظری بھی کمال تک نہ پہنچی یہی وجہ ہے کہ اس کے بیانات نیم صداقت کے مقام سے دانش وری کی منزل تک نہ پہنچے ممکن ہے وہ اور زندہ رہتا تو اپنے نظام کے منتشر اجزاء کو ہم آہنگ فلسفیانہ نظام کی صورت عطا کر سکتا۔ جو الفاظ اس نے یسوع مسیح کے لیے استعمال کیے تھے وہ اس پر زیادہ صادق آتے ہیں اس نے بڑی جلدی وفات پائی اگر وہ زندہ رہتا تو خود ہی اپنا مسلک بدل لیتا کہ اس میں اپنا مسلک بدلنے کی طاقت اور شرافت نفس موجود تھی لیکن موت کو کچھ اور ہی منظور تھا"۔

ہر نقاد نے جو معاشرتی عزت و احترام کا خواہاں ہے نطشے کی تردید کی ہے لیکن اس کے باوصف یہ فلسفی جدید قسم کی شاہراہ پر سنگ میل کی طرح کھڑا ہے اس کی نثر جرمنی کے لوگوں کی نثری تخلیقات کا نقطہ عروج ہے اس نے اخلاقی نظام کے مخفی ریشے اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے رکھے کہ اس سے پہلے کسی مفکر نے یہ کام یوں نہ کیا تھا اس نے اخلاقیات کے دائرے میں ایک نئی قدر داخل کی جو اس سے پہلے نامعلوم تھی۔ یعنی اشرافیہ۔۔۔۔۔

اس نے اپنی صدی میں نفیس ترین نثری نظم لکھی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس نے یہ کہا کہ انسان کا مقام یہ ہے کہ انسانیت کے موجودہ مقام سے آگے نکل جائے اس کا اسلوب کلام تلخ تھا لیکن اس کے خلوص میں کوئی شک نہیں۔

نطشے کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ شخص اسلام کا مطالعہ کر لیتا تو اس کی فکر موجودہ فکر سے یکسر علیحدہ ہوتی۔ اب اس نے جو عیسائیت، عورت، مساوات، اشتراکیت اور جمہوریت کے خلاف زہر اگلا، اسلامی تعلیم اس کی سوچ میں مثبت تبدیلیاں لے آتی بہرحال اس مخالف رویے کے علاوہ اس نے ایسے نکات پر بھی تو بات کی ہے کہ جن پر عمل کر کے ایک بہترین معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

حضرت علامہ اقبال نطشے سے اس وجہ سے متاثر تھے کہ اس نے مغرب کو کھول کر ہمارے سامنے کر دیا لیکن جہاں تک اس کی ضد پر بات کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ اگر وہ میرے عہد میں ہوتا تو میں اس کو مقام کبریا بتاتا اور پھر وہ یہ نہ کہتا کہ "خدا مر گیا ہے" اقبال یہاں اسے مجذوبِ فرنگی کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں　　تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

-----

اقبال کے ان اشعار پر میں اس مضمون کو ختم کرنا چاہوں گا۔ یہ اشعار آپ نے نطشے کے لیے اس کے نام سے لکھے ہیں۔ اور یہاں اسے حکیم کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہیۓ اسرار لاالہٰ کے لیے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکر بلند　　کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی　　ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لئے

-----

## ماخذات


Wikipedia, the free Encylopedia (luter net)　۱

The story of philosophy(part II) will Durant, Simon and Schuster U.S.A 1933　۲

۳ ۲۰ عظیم فلسفی۔ مترجم قاضی جاوید۔ تخلیقات، علی پلازا۔ ۳ مزنگ لاہور۔ ۲۰۰۱ء

۴ رائدین جدیدیت۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی۔ مکتبہ صریر۔ فیڈرل بی ایریا کراچی۔ ۲۰۰۲ء

۵ داستان فلسفہ۔ مترجم: سید عابد علی عابد۔ مکتبہ اردو لاہور۔ بار دوم ۱۹۶۳ء

۶ کلیات اقبال (اردو) حضرت علامہ اقبال۔ سروسز بک کلب راولپنڈی۔ بار سوم ۱۹۹۵ء

۷ ماہنامہ ماہِ نو۔ لاہور۔ اپریل ۱۹۸۹ء

۸ ماہنامہ صریر کراچی۔ (سالنامہ) جون و جولائی ۲۰۰۴ء

۹ ماہنامہ اوراق لاہور (سالنامہ) جنوری ۱۹۸۹ء


## غیر مطبوعہ/ترجیحاً تازہ نگارشات

ہم اپنے معزز معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ ''الاقرباء'' کو صرف ایسی نگارشات نظم و نثر مرحمت فرمائیں جو غیر مطبوعہ اور ترجیحاً تازہ تخلیقات ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم بعض ایسی نگارشات کو شائع نہیں کر سکے ہیں جن کی قبل ازیں اشاعت ہمارے علم میں آئی ہیں۔ بہر حال ہم شکر گزار ہوں گے اگر ''الاقرباء'' کے لیے ترسیلات پر ''غیر مطبوعہ'' کے الفاظ لکھ دیئے جائیں۔ (ادارہ)

ترجمہ

محمد طارق علی

# ولی عالم شاہین (کینیڈا)

## کینیڈا میں اُردو

کنیڈا کے دارالحکومت میں ہر سُو خزاں چھائی ہوئی ہے۔ تمام درخت برہنہ ڈھانچوں کے مانند کھڑے ہیں اور بے مہر، سرد زمستانی ہوائیں ہی کبھی کبھی سوکھے پتوں کو اڑا کر اِدھر اُدھر بکھیر رہی ہے۔ پارلیمنٹ ہل پر عین اس جگہ کے ساتھ جہاں کنیڈین قانون ساز اسمبلی بیٹھتی ہے، ایک کشادہ ہال میں اردو کے ایک شاعر اپنی غزل سرائی سے ماحول کو گرم کئے ہوئے ہیں۔ ہال شاعری کے شائق حاضرین سے کچھا کچھ بھرا ہے۔ آج تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۱ کی، دن اتوار کا اور شام کی بساط تیزی سے لپٹتی جارہی ہے۔ اگلے روز پورے کنیڈا میں ''ری ممبرنس ڈے'' کی چھٹی ہے۔ لوگ آرام سے ہال میں بیٹھے گوش برآواز ہیں۔ نیم شی کا وقت قریب آچکا ہے لیکن لوگوں کو گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔

محفل مشاعرے کی ہے، موقع بھی خاص ہے، مہمان خصوصی بھی موجود ہیں، کون ؟ احمد ندیم قاسمی! پوری دنیائے ادب آج ان کی پچھترویں سال گرہ منا رہی ہے۔ قائد اعظم یونی ورسٹی اسلام آباد کے پروفیسر فتح محمد ملک صدر مجلس ہیں۔ برصغیر سے تعلق رکھنے والی دیگر نام ور ادبی شخصیات بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کے نام ہیں: ڈاکٹر قمر رئیس، شہزاد احمد، محسن احسان، جان ایلیا، سحر انصاری اور سلمان عباسی۔ شمالی امریکا میں رہنے والے جانے پہچانے اردو شاعر بھی آئے ہوئے ہیں۔ خاص خاص نام یہ ہیں۔ پروفیسر ایم۔ ذکی، حنیف اصغر، حفظ الکبیر قریشی، شاہین، اشفاق حسین، عبدالقوی ضیا، نزہت صدیقی، تسلیم الٰہی زلفی، حافظ اشتیاق طالب، ارشد عثمانی، مطلوب حسین اور خالد فرید۔

کوئی دو ہفتے قبل بھی رائٹرز فورم کے زیر اہتمام ہالی ڈے ٹورنیٹو میں احمد ندیم قاسمی انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں بہت سے مقررین نے اس پاکستانی معزز مہمان کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس محفل کے اختتام کے ساتھ ہی حاضرین کی موجودگی میں خالد سہیل اور بیدار بخت نے معزز مہمان کا لائیو انٹرویو لیا تھا۔

کنیڈا میں ایسی ادبی محافل کم یاب نہیں۔ اس ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ ہے اور یہ سب لوگ بڑے شہروں جیسے ٹورنٹو، مانٹریال، اوٹاوا، ایڈمنٹن، ونی پگ، وینکوور کے علاوہ ملک کے جنوب مغربی حصے کے چند چھوٹے شہروں میں بھی موجود ہیں۔ اسی لیئے کنیڈا میں اردو زبان اور ادب ترقی کے اچھے مدارج پر ہے۔ گو اس ملک میں شجر اردو کی عمر زیادہ پرانی نہیں، محض تیس سال کا عرصہ گذرا ہے اور خوب برگ و بار نکال رہا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کینیڈا کا اپنا ادب جو انگلش اور فرنچ زبانوں میں ہے، آج کل اپنے عروج پر ہے جب کہ نصف صدی پہلے کنیڈین ادب صرف ان پُرانی کتابوں کے اوراق میں محفوظ تھا جو لوگوں کی نجی لائبریریوں میں، نظر انداز حالت میں پڑی تھیں۔ لوگوں کو ان کی ادبی وثقافتی اہمیت کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ کنیڈا کے تعلیمی اداروں نے بھی انھیں کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھا تھا۔ سوسنا موڈی کی کتاب (۱۸۵۲ء) "Roughing in the Bush" سے لے کر ہف میکلے لن کی (1945) "Two Solitudes" تک اور ابتدائی دور کے لکڑی کے بنے ہوئے جانوروں کے نمونوں سے لے کر نئے دور میں ''گروپ آف سیون'' کی مصورانہ برش کاری تک اب کنیڈین آرٹ، ادب وثقافت کی اصناف کی الگ الگ شناخت اور قدریں متعین کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ مارگریٹ تے اپنی کتاب (۱۹۷۲ء) "survival" میں نوآبادکاری نظام کی تکذیب کی ہے کہ اس کے مسموم اثرات کی بدولت کنیڈا میں فن وثقافت کے شعبوں میں قابلِ ذکر ترقی نہ ہو سکی۔

آج سے ایک سو چھیالیس سال پہلے یعنی ۱۸۶۷ء میں کنیڈا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے

وجود میں آیا۔ آزادی کے سو سال بعد کنیڈین ادب نے اپنی شکل اور وضع اختیار کرنی شروع کی لیکن ملک کا دانش ور طبقہ ادب کی ترقی کی رفتار پر ہرگز مطمئن نہ تھا اور وقتاً فوقتاً ملک کے پرنٹ میڈیا میں ایسی تحریریں چھپتی رہیں جن میں ادب کی غیر تسلی بخش صورت حال پر افسوس اور دکھ کا اظہار کیا گیا۔ مثلاً آج سے قریباً چالیس سال پہلے کے کنیڈین اخبارات و جرائد میں اسی نوعیت کے مضامین خاصے تسلسل سے شائع ہوتے رہے۔ زیادہ تر لکھنے والے تھے: رونالڈ سدر لینڈ، ٹونی کلگالن، مارگریٹ ایٹ ووڈ، نارتھ روپ فرائی وغیرہ انھوں نے بڑی دردمندی سے کنیڈین ادب کی زبوں حالی کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا کہ ادب کی ترقی کے لیے ہمیں وہ سبھی کچھ کرنا ہے جواب تک نہیں کیا گیا۔ ادب کے بغیر ہماری قومی شناخت ادھوری یعنی دنیا کی دیگر آزاد اقوام کی طرح نہیں ہے۔ ہمیں خصوصاً شاعری پر توجہ دینی ہوگی اور شاعروں اور دیگر اہلِ قلم کو سننے اور سمجھنے والے قارئین کی ایک بڑی تعداد کو سامنے لانا ہوگا۔

مندرجہ بالا معلومات سے کنیڈا کے ادبی ماحول کے اس مجموعی تناظر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں جس میں اردو نے جنم لیا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ ان کنیڈین مصنفین کو جو غیر سرکاری زبانوں میں لکھتے ہیں اور ان میں اردو بھی شامل ہے، نہ تو ملک کے اصلی ثقافتی اور لسانی ورثے کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی انھیں معاشرے میں وہ عزت و مقام حاصل ہے جو کنیڈین قلم قبیلے کے بڑے دھارے سے تعلق رکھنے والوں کو حاصل ہے۔ سو دیگر زبانوں میں لکھنے والے لے دے کر صرف ''ترجمہ کاری'' کے ذریعے ہی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور وہ بھی ایک محدود طریقے سے ترکِ وطن کے ذریعے کسی ملک میں جا کر بس جانے کے بعد پرانے بندھنوں کو جوڑے رکھنا اور نئے تعلقات بھی بنانا بہت مشکل کام ہے۔ عموماً ایک خاص نسلی یا اقلیتی گروپ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم معاشرے سے زیادہ کٹے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اصلی وطن اپنے قاریوں، میڈیا اور اپنے ہم عصروں، غرض ہر اُس چیز سے بچھڑ چکے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے تخلیقی صلاحیتیں ابھر اور نکھر سکتی تھیں۔

اس مضمون میں مختصراً اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ اپنی عمر کے گزشتہ تیس سال کے دوران اردو زبان و ادب کو کینیڈا میں کس طرح تحفظ و ترقی ملی۔ دستیاب معلومات مکمل اور جامع نہیں چنانچہ اس مضمون میں غلطیوں اور بھول چوک کا امکان ہے۔ اُن بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے جن کا یہاں ذکر ہے، نام مناسب ترتیب کے ساتھ نہیں ملیں گے اور ممکن ہے کہ یوں بعض دوستوں کی دل آزاری ہو، تاہم پیشگی معذرت!

کینیڈا کے دارالحکومت اوٹاوا میں سب سے پہلے اردو مشاعرے کا اہتمام اس وقت کے پاکستانی ہائی کمشنر کی بیگم محترم شائستہ اکرام اللہ نے ۱۹۵۲ء میں کیا تھا۔ حاضرین میں مندرجہ ذیل احباب/اہلِ قلم شامل تھے۔ شاہد سہروردی، راحت سعید چھتاری، ریاض الدین احمد، سیود احمد، احسان الحق انوار، ارشد مرزا، اعجاز احمد ناٹک، ماجد علی (زہرہ نگاہ کے شوہر)، سعد خیری (راشد الخیری کے فرزند) شریف احمد اور سیّد معین اشرف (جو اوٹاوا میں ۱۹۵۱ء سے مقیم تھے) ارشد مرزا بڑے اچھے شاعر تھے بعد میں ٹرام کے ایک حادثے شدید زخمی ہو کر چل بسے۔ اس مشاعرے کی روئیداد ریڈیو پاک کراچی سے نشر ہوئی اور ماہ نامہ ''ماہِ نو'' میں ایک مضمون بھی چھپا۔

ستر کی دہائی میں اردو زبان و ادب نے خاصی تیزی سے ترقی کی یہاں چند اہم ادبی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا جائے گا جن سے اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ نئے ماحول میں جنم لینے کے بعد یہ زبان کس طرح آگے ہی آگے کی جانب قدم بڑھاتی چلی گئی۔
۱۹۷۷ء میں اوٹاوا علامہ اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت بڑے شایانِ شان طریقے سے منایا گیا مثلاً کتابوں کی شاندار نمائش، مشاعرہ اور ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا۔ یہ مذاکرہ کینیڈا۔ پاک دوستی انجمن کی جانب سے اوٹاوا یونی ورسٹی کیمپس میں منعقد کیا گیا جس میں کینیڈا اور امریکا بھر سے آئے ہوئے سکالر، ادیب اور شاعر شریک تھے۔ مذاکرے کی پوری کارروائی کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ خاص بات یہ تھی کہ کینیڈا میں ایرانی سفیر فضل اللہ رضا کے علاوہ حفیظ ملک عبدالقوی ضیاء، ایم ایچ کے قریشی اور ایک لوکل سکالر نے اس میں مقالے پیش کیے۔ مشاعرہ خوب بارونق تھا اس میں منیب

الرحمٰن، عنائت حسین شاداں، عبدالقوی ضیا، شاہین، ایم ایچ کے قریشی، عرفانہ عزیز، مامون ایمن، محمد علی رضا، روشن شرما، افتخار حیدر، رشیدہ سیال فقیر سہگل، خالد فرید وغیرہ نے شرکت کی۔

اگلے سال بھی بڑی رونق دار محفلیں برپا ہوئیں۔ مقامی افسانہ نگار اور ایڈیٹر ماہ نامہ ''ملاقات'' عبدالرحیم انجان کی دعوت پر فیض احمد فیض بطور مہمان خصوصی نومبر ۱۹۷۸ء میں ٹورنٹو آئے تو بڑا پرجوش استقبال ہوا۔ اردو کے نامور ناول نگار عزیز احمد بھی جو ٹورنٹو یونی ورسٹی میں اسلامی مطالعات کے پروفیسر تھے، تشریف لائے۔ وہ کینسر کے مریض تھے، ڈھانچہ بن چکے تھے چلنے سے عاجز تھے لیکن انھوں نے فیض کے مشاعرے کو مس نہیں کیا اور ان کی شاعری پر ایک پیپر پڑھا۔ اور چند ہفتے بعد ہی عزیز احمد چل بسے۔

۱۹۸۰ء میں فیض احمد فیض نے پھر ٹورنٹو کو رونق بخشی۔ ۲۵ اکتوبر کو انھوں نے ایک مشاعرے کی صدارت کی جس کا مقامی اردو سوسائٹی نے اہتمام کیا تھا۔ شریک ہونیوالے شاعروں میں نمایاں نام یہ تھے: اختر الایمان، سردار جعفری، کیفی اعظمی، واجدہ تبسم، جمال زبیری مینا قاضی، بے کل اتساہی، عزیز قیسی، شاہین، انجم ایچ قریشی، اے کیو ضیا' اشفاق حسین، اشتیاق طالب، ابرار حسن، عقیلہ شاہین، نزہت صدیقی، تزئین حنا، افضل امام، جوش مندوزئی اور طلعت اشارت۔

اطہر رضوی اور اشفاق حسین، دو معروف ادب نواز شخصیتوں کی دعوت پر پاکستانی شعراء کا ایک گروپ کنیڈا کے دورے پر آیا۔ ان میں ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی، حمائت علی شاعر، صہبا اختر اور پروین فنا سید ایسے غزل گو شامل تھے۔ انہوں نے کنیڈا کے کئی اہم شہروں کا دورہ کیا جو ۲۳ اگست ۱۹۸۱ء کو وینکوور میں جا کر ختم ہوا۔ وہاں انھوں نے (ماسوائے ضمیر جعفری) ایک مشاعرہ پڑھا۔ چند مقامی شعرا بشمول خلیل الرحمٰن چشتی، حزیں لکھنوی اور بسمل لکھنوی نے بھی مہمانوں کا ساتھ دیا۔

اسی سال ۳ اکتوبر کو پاکستان۔ کنیڈا فرینڈ شپ سوسائٹی وینکوور نے ایک مذاکرے اور

بعدازآں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ مذاکرے میں کئی پیپرز پڑھے گئے۔ ولی عالم شاہین نے اردو مین لکھا ایک مقالہ پڑا، عنوان تھا ''غزل اور اس کا ارتقا''۔ دیگر پیپروں کے عنوانات تھے ''فیض احمد فیض کی سیاسی شاعری'' (اشفاق حسین)، ''مجاز'' (طارق رافع) ''ن۔م۔ راشد کی شاعری پر ایک نظر'' (ابرار حسن) اور ''کلیم اعجاز کی شاعری کے خدوخال'' (افضل امام)۔

اردو سوسائٹی آف کنیڈا نے ۲۶۔۲۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو ٹورنٹو میں اردو مشاعرے کے علاوہ پہلی اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ سوسائٹی کے صدر حفیظ الکبیر مہتم تھے پاکستان اور بھارت سے نام ور ادبی شخصیات شریک ہوئیں مثلاً فیض احمد فیض، جمیل الدین عالی، ادا جعفری، احمد فراز، گوپی چند نارنگ اور ان کے علاوہ شمالی امریکا کے چند خاص خاص شاعر۔ اردو زبان و ادب کو چاہنے والے دو اہم نام بھی تھے۔ این میری شمل اور کارلو کپولا۔ مندرجہ ذیل پیپر پڑھے گئے:

''جدید اردو شاعر کے رجحانات'' (گوپی چند نارنگ) ''ترقی پسند تحریک کے اردو شاعری پر اثرات'' (علی سردار جعفری)، ''مشاعرہ ایک ادارہ'' (منیب الرحمٰن) ''ترقی پسند شاعری کی تاریخ'' (کارلو کپور) ''اردو شاعری میں تصوّف کا تصوّر'' (این میری شمل) ''کلاسیکل اردو شاعری میں جدیدیت'' (حفیظ الکبیر قریشی)

رائٹرز فورم آف پاکستان کنیڈینز نے پاکستان۔ کنیڈا ایمٹی فورم کے تعاون سے ۱۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں مندرجہ ذیل پیپرز پڑھے گئے ''کنیڈا میں اردو ادب کا ارتقا'' (اے کیو ضیا)، کنیڈا میں اردو اور اس کے بین الاقوامی تعلقات'' (رئیس امروہوی) ''پاکستانی ادب میں جمالیات'' (محمد علی صدیقی)، بیسویں صدی کے اختتام پر اردو شاعری۔ پاکستان کا منظر'' (شان الحق حقی) ''پاکستان اور بھارت میں اقبال کا تقابلی مطالعہ (جگن ناتھ آزاد) کانفرنس میں پینل مباحث خوب رہے۔ شرکاء تھے: محمد عمر میمن، اختر احسن، حسن عابد، افتخار عارف، شاہین اور فاروق حسن، اس سے قبل مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا شعرا تھے: رئیس امروہوی، شان الحق حقی، حسن عابد، جگن ناتھ آزاد، منیر نیازی، کشور ناہید، صہبا

اختر، صہبا لکھنوی، افتخار عارف، مجیب خیر آبادی، عزیز الحسن اور طلعت اشارت۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء کو ایک نوجوان اور باصلاحیت شاعر اختر آصف نے سکار بورو کے مقام پر جوش ملیح آبادی کی پانچویں برسی کے موقع پر ایک شعری محفل سجائی۔ مہمان شعرا کو جوش کا ایک مصرعہ طرحی مشاعرہ کے لیے دیا گیا۔ "آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو" شائقین نے جوق در جوق شرکت کی اچھے سے اچھا کلام پیش کیا گیا۔ شاعر حضرات واشنگٹن، بالٹی مور، نیویارک، نیو جرسی، شکاگو کے علاوہ اوٹاوا، ہملٹن، سدبری، ٹورنٹو، برانٹ فورڈ اور دیگر علاقوں سے تشریف لائے۔

اردو سوسائٹی آف کنیڈا نے ۴۔۲ نومبر ۱۹۸۴ء کو ایک مذاکرے، مشاعرے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ مذاکرے میں کُل چار پیپرز (تین انگلش اور ایک اردو) پڑھے گئے۔ ان کی تفصیل: "کلچر کی تشریح" (حفظ الکبیر قریشی)، "اردو میں لغت نویسی کی مشکلات" (شمس الرحمٰن فاروقی) "کولمبیا یونیورسٹی میں اردو کی تدریس" (فرانسس پری شٹ) اور "میر و غالب کی شاعری میں محبوب کا تصور" (ایس آر فاروقی)۔ مشاعر کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ شعراء تھے: کلیم اعجاز، بےکل اتساہی، اشتیاق طالب اور حفظ الکبریٰ قریشی۔

رائٹرز فارم آف پاکستانی کنیڈینز نے ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو علی سردار جعفری کے ساتھ شام منائی۔ اسی دن لاہور میں فیض احمد فیض انتقال کر گئے۔ ٹورنٹو میں بھی ابھی محفل شعر جاری تھی کہ انتقال کی خبر نے سبھی حاضرین کو غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا۔ فیض کنیڈین اردو ادب کا ایک بہت بڑا حصہ تھے۔ ان کے چلے جانے سے یہاں کی دنیائے اردو غم و اندوہ میں ڈوب گئی۔

ٹورنٹو میں ۸ دسمبر ۱۹۸۴ء ایک عظیم الشان مشاعرہ برپا ہوا۔ بڑے نامی شاعر اس میں موجود تھے مثلاً: جمیل الدین عالی، علی سردار جعفری، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، تسلیم الٰہی فاضلی اور ان کے علاوہ شمالی امریکا سے بھی بہت سے مہمان شعرا نے شرکت کی۔

مذکورہ بالا ادبی محفلوں کی بدولت کنیڈا میں اردو ادب کی شان میں اضافہ ہوتا رہا۔ بعد کے آنے والے سالوں میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا ادب کی روشنی پھیلتی رہی۔ قلم بدست ادیب و شاعر

حضرات اپنا اپنا حصہ ڈالتے اور اس روشنی کو توانائی مہیا کرتے رہے اب یہاں کے ادبی حلقوں میں یہ سوچ ابھر رہی ہے کہ تمام ادبی سرگرمیوں کی تفاصیل کو ایک مختصر سے پیپر میں سمویا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا آنے والے دنوں میں "کینیڈا میں اردو" کے موضوع پر ایک مبسوط و مفصل کتاب ترتیب دے کر یہاں کی ادبی تاریخ کو محفوظ کر لیا جائے تو یہ ایک صائب کام ہوگا۔

کینیڈا میں اچھے اور نام ور قلم کاروں کی تعداد قابلِ رشک ہے۔ ان میں بہت سے سکہ بند نام بھی ہیں۔ ان کی شہرت نہ صرف کینیڈا میں بلکہ اس سے باہر بھی ہے۔ ان کا ادبی کام اپنی قدر کے اعتبار سے ان کے ہم رتبہ اہلِ قلم کی جو برصغیر ہندو پاک میں موجود ہیں تخلیقات سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں ان چیدہ چیدہ ہستیوں کے نام درج کر دیئے جائیں جنھوں نے کینیڈا کی سرزمین پر اردو ادب کا برگ سبز لگایا اور شبانہ روز محنت کر کے اپنے خون سے اس کی آبیاری کی۔

**نثر نگار:** بہت سے آب دار نام ہیں چند ایک دیکھیئے: شان الحق حقی، اختر جمال، شاہد حسین رزاقی، شاہین، عرفانہ عزیزی، فاروق حسن، اختر رضوی، اشفاق حسین، عبدالقوی ضیا، نور احمد شیخ، بیدار بخت، خالد سہیل، مظفر اقبال، جاوید دانش، رضا الجبار، افتخار حیدر، حفظ الکبیر قریشی اکرام بریلوی، سلطان جمیل نسیم، سیّد معین اشرف، سید خورشید عالم، سید تقی عابدی، نزہت صدیقی، عابد جعفری، شکیلہ رفیق، افضال نوید، نسیم سیّد، اشتیاق طالب، حنیف اشعر، جوش مندوزئی، تسلیم الٰہی زلفی، جگدیش مہتہ درد، کلونت سنگھ ندیم پارمر، شمس جیلانی، ابرار حسن، تبسم افضال ملک، اور نیلوفر تیموری۔ یہ سب جانے مانے اہلِ قلم اور شائع شدہ تحریروں کے مصنف ہیں۔ شان الحق حقی ایسے نام ور اہل قلم کے قلم سے درجنوں کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اسی طرح عزیز احمد مرحوم نے اردو ناول اور افسانے میں بڑا نام کمایا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ایک بہت اہم مصنف سمجھے جاتے ہیں۔

**شاعر:** کینیڈین شعری دنیا میں بہت سے جگمگاتے نام ہیں۔ ان میں سے چند ایک عزیز احمد (مرحوم) مظفر اقبال، اکرام بریلوی، رضا الجبار، انور خلیل شیخ، شکیلہ رفیق، خالد سہیل، جاوید

دانش، سید معین اشرف، عبدالرحیم انجان، نیلوفر تیموری، نوشاد علی، نوشاد صدیقی، عابد جعفری، تبسم بانو اور فیصل فارانی۔ اختر جمال اور سلطان جمیل نسیم یہ دونوں نام ور افسانہ نگار، حال ہی میں شعر گوئی کو بھی اپنا چکے ہیں۔

**ادبی تنقید، تبصرہ اور مضمون نگار:** اس میدان میں یہ اہم نام سامنے آتے ہیں۔ شان الحق حقی، عروج اختر زیدی، اظہار رضوی، اشفاق حسین (مرحوم) عبدالقیوم لودھی (مرحوم) اے کیو ضیا (مرحوم) سید خورشید عالم، ساجدہ علوی، جلال الدین ایس حسین، نذرت یار خان، مظفر اقبال، محمد فیاض، فاروق حسن، ایم ایچ کے قریشی، خالد سہیل، منیر پرویز، لنڈا وال، انور نسیم اور ولی عالم شاہین۔

**مترجم:** کینیڈا کے ادبی ماحول میں ترجمے کا بہت اہم مقام ہے۔ اس کام کے ذریعے بہت سے اہل قلم نے ثقافتی، ادبی اور لسانی سطحوں پر اپنا اپنا خاص نام اور پہچان بنا رکھی ہے۔ مثلاً بیدار بخت، کیتھلین گرانٹ جیگار، ڈیرک ایم کوہن، لیزلی جے وگنے، ایم ایچ کے قریشی، فاروق حسن، سٹینلے راجیوا، کارلا پیٹی فج، کامران مرزا، نذرت یار خان، شہلا برنی، کینتھ بریانٹ، اے کیو ضیا، نازنین صادق، خالد سہیل لنڈا وال، ضمیر احمد اور ولی عالم شاہین۔

**مطبوعات:** وقت کے ساتھ ساتھ اردو بولنے اور لکھنے والوں کی ترجمانی کے لیے کئی اخبارات و جرائد منصۂ شہود پر نمودار ہوئے۔ ان میں سے کئی ایک تین سے دس سال کی زندگی پا چکے ہیں۔ اکثر مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ چند نام یہ ہیں: الہلال، امروز، پاکیزہ انٹرنیشنل، ملت، لیڈر، صحافت، سخنور، ایسٹرن نیوز، آواز، وطن، آفاق، ترجمان، پارس، اردو ٹائمز، پاکستان پوسٹ وغیرہ، یہ سب اخبارات و جرائد اردو بولنے والے طبقے کی ادبی اور ثقافتی خدمات سرانجام دیتے ہیں علاوہ ازیں اردو داں طبقے کی اہم خبریں بھی شائع کرتے ہیں۔ آج سے کوئی ۴۰/۳۵ سال قبل دو ادبی جریدے ''صہبا'' اور ''ملاقات'' کے نام سے ٹورنٹو سے نکالے گئے تھے گو ان کی طبعی عمریں دو تین سال سے زیادہ نہ تھیں لیکن یہ جب تک جیے، انھوں نے اردو داں تارکین وطن کی

ادبی اور سوشل خدمات سرانجام دیں۔ اردو وسط ستر کی دہائی میں اردو کے نام کو بلند کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک سہ ماہی اردو مجلّہ ''اردو انٹرنیشنل'' بھی اردو کے فروغ کے لیے نکالا گیا تھا۔ ولی عالم شاہین نے بھی انگلش جریدہ ''اردو کینیڈا'' کے نام سے شروع کیا۔ اس پرچے نے اردو سے نابلد طبقے کو اس زبان سے متعارف کرانے کا اہم کام سرانجام دیا۔ ۹۰۔۱۹۸۶ء کے مختصر سے عرصے میں اسے ایک باوقار ادبی جریدے کا رتبہ حاصل رہا۔

آج کل ایک اہم بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کو انٹرنیٹ کے ذریعے بہت ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے کئی ویب سائٹس کام کر رہی ہیں۔ اردو کے بے شمار شاعر و ادیب انٹرنیٹ کی دنیا میں موجود شائقین کو اپنے تخلیقی کام سے محظوظ کر رہے ہیں۔ یوں پرنٹ میڈیا کے علاوہ انٹرنیٹ بھی بہت موثر کردار ادا کر رہا۔

-----

ڈاکٹر مظہر حامد

# اقبال کے بعد طویل نظم ۔۔۔ ایک جائزہ

اقبال کی طویل نظموں کے پس منظر میں سیاسی، تہذیبی اور صیہونی اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال کی طویل نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ، طلوع اسلام، ذوق و شوق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی ان نظموں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''علامہ اقبال نے زیر مطالعہ طویل نظمیں ۱۹۳۵۔۱۹۱۱ تک کے عرصے میں مختلف اوقات میں لکھیں۔ نظموں کی تفہیم اور بہتر مطالعہ کے لیے سب سے پہلے یہ کام کرنا ضروری ہے کہ ان کا پس منظر کیا ہے اور یہ نظمیں لکھتے ہوئے شاعر کی نظر کن حالات و عوامل اور اثرات پر تھی۔ اس سلسلے میں ہمیں عالم اسلام کی مختصر تاریخ خصوصاً بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نظر ڈالنا ہوگی۔''

طویل نظموں میں اقبال کی فکری بلند پروازی، حُسن فطرت کی تعریف، وطن پرستی اور نظریات، اس کے علاوہ نظریۂ حیات کی ترسیل ملتی ہے۔ اقبال کی نظم شکوہ اور جواب شکوہ میں ڈیڑھ سال کا وقفہ ہے۔ ان نظموں میں تخیل کی پرواز، پیکر تراشی اور خطابیہ انداز نہایت دلکش اور موثر انداز میں ہوا ہے۔ نظموں میں بے تکلفانہ طرز اور اضطرابی کیفیت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ بے چینی ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب تھی۔ ان حالات کے پیش نظر اقبال نے جدید علوم سے استفادہ کیا اور اس روشنی میں اپنی قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلائے۔ زندہ قوموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ظاہر میں تو وہ ترقی کر رہے ہیں لیکن ان کے دل ایمان سے خالی ہیں۔ ملت اسلامیہ کو مخاطب کر کے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو طاقت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اقبال معاشرتی قدروں کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھ کر اسلامی تہذیب کا احیاء

چاہتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا یہ کہنا اپنی جگہ درست ہے کہ:

''اقبال اپنے تخلیقی پیکروں کی تخلیق سے صرف اپنے دل کو ہجوم جذبات سے ہلکا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ وہ تمدنی قدروں کو بھی تقویت پہنچانا چاہتے ہیں۔ جس تمدنی گروہ سے اس کا تعلق ہے اس کی روایتوں اور اخلاقی ذمہ داریوں کو وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کے آرٹ میں شخصی اور داخلی عنصر کے علاوہ اجتماعی پہلو بھی موجود ہے۔ وہ محض تفنن طبع کے لیے شعر نہیں کہتے بلکہ اپنے مقاصد کے لیے ایک وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہ مقاصد اس قدر بلند ہیں کہ ان کی بدولت خود ان کا آرٹ سر بلند ہو گیا۔''

اقبال نے اپنے آرٹ کو پیش کرنے کے لیے جن نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ اسے طویل پیرایہ میں ہی ادا کیا جا سکتا تھا۔ یہ اقبال ہی تھے کہ انہوں نے آنے والے شعراء کے لیے طویل نظمیں کہہ کر اپنے مقاصد اور جذبات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اقبال کے بعد طویل نظم میں کئی معتبر نام آتے ہیں۔ جنھوں نے اس کو خوب نبھایا ہے ان میں جوش سرفہرست ہیں۔

## جوش ملیح آبادی:

بیسویں صدی میں اقبال کے بعد دوسرا بڑا نام شاعری کی دنیا میں جوش ملیح آبادی کا لیا جاتا ہے۔ جوش کے مزاج کو دھنک رنگ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک طرف وہ اپنی نظموں میں حُسن پرستی، بادہ نوشی اور رومان پروری کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔

''میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب''

جوش کے متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''رُوحِ ادب'' ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے مجموعے شائع ہوتے رہے۔ حرف و حکایت، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، آیات و نغمات، رامش و رنگ، نجوم و جواہر، عرش و فرش، سُنبل و سلاسل، نقش و نگار، سموم و صبا میں جوش نے اپنی طویل نظموں میں رومانی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ پھر قومی

آزادی میں شامل ہو کر انقلابی نظمیں لکھیں۔ فطری مناظر کی دلکش منظر کشی کی جوش نے خمریات میں بھی اضافہ کیا ہے۔ انقلاب پر بحث کرتے ہوئے علی سردار جعفری کے خیالات ملاحظہ کیجئے۔

"انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے خول میں سب سے پہلے اقبال نے استعمال کیا اور سیاسی انقلاب کا تصور بھی اردو شاعری اور اقبال ہی نے عطا کیا۔ سرمایہ دار، مزدور، زمیندار اور کسان، آقا، غلام، حاکم ومحکوم کی باہمی کشاکشی کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبال نے نظمیں لکھیں۔ لیکن اس کے بعد بھی "شاعر انقلاب" کے خطاب کا حقدار جوش کو سمجھا گیا۔"

علی سردار جعفری نے کس قدر مدلل اور جامع تبصرہ پیش کیا ہے۔ ان کے اس اقتباس کی روشنی میں تقلید کا جو رجحان دیگر شعراء کے ہاں دیکھنے میں آیا، اس کے سرخیل اقبال ہی ہیں۔ گو کہ جوش نے کئی جگہ اقبال کی تقلید سے انحراف کیا ہے لیکن جوش کی نظموں میں کلیتاً اقبال ہی کا پرتو ہے۔ وہ اقبال کے اثرات سے خود کو بچا نہ سکے۔ مثلاً

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
اقبال

پانی کا طلبگار ہو جس کھیت کا دہقاں اُس کھیت میں پانی کے عوض آگ لگا دو
جوش

-----

بہرکیف یہاں ہم جوش کی طویل نظموں کا ذکر کرتے ہیں۔ جوش کی چند طویل نظمیں جن میں رومانی، انقلابی اور سیاسی پس منظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| وحدت انسانی | ۶۳ بند | الہام وافکار |
| مُردوں کی دھوم | ۲۱ بند | الہام وافکار |
| رشوت | ۳۲ بند | سموم وصبا |
| برستی ہوئی آنکھیں | ۹۳ بند | سموم وصبا |
| شکر پروردگار | ۹۱ بند | سموم وصبا |

ان طویل نظموں میں تنوع اور رنگا رنگی کے علاوہ انسانی اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سماجی اور عمرانی معاملات کو جس خوبی سے شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے وہ انہی سے مخصوص ہے۔ حُسن و عشق جوش کے خاص موضوعات ہیں اس لیے وہ رومانی شاعر کی حیثیت سے بھی مشخص ہو چکے ہیں۔ ''جنگل کی شاہزادی'' اس کی واضح مثال ہے۔ ''مُردوں کی دھوم'' ایک تنقیدی نظم ہے، اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قوم جو بظاہر زندہ ہے اُن پر مردنی چھائی ہوتی ہے۔

جو زندہ ہے مُردے کا اٹھاتا ہے وہ لاشہ زندوں کو ہیں، کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے مُردے

-----

نظم ''رشوت'' خاصی طویل ہے، نظم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ رشوت لینے کے کیا کیا طریقے وضع کیے گئے ہیں، جوش نے رشوت کو ناسور سے تعبیر کیا ہے۔

حال کے سکّے کو ماضی کا جو سکہ دیکھ لے سو روپے کے نوٹ کے منہ پر دونی تھوک دے

-----

''وحدت انسانی'' میں جوش نے انسان کو انسانیت کا درس دیا ہے۔ مختلف استعارات، تشبیہات اور مثالوں سے انسان کو افضل ترین مخلوق ظاہر کیا ہے۔ نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

-----

اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش نے انسانی احترام کو فوقیت دی ہے۔ جوش کی نظموں میں شباب بھی ہے اور انقلاب بھی، مناظر فطرت کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ غلامی اور آزادی پر بھی بڑی جاندار نظمیں کہی ہیں۔ غرض کوئی پہلوان کی نظموں میں تشنگی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

ان کی انقلابی نظموں میں تیزی وتندی کے علاوہ جارحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ لہجہ میں تلخی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ خاص کر سیاسی نظموں میں یہ لہجہ اور کرخت ہو جاتا ہے۔ ''حرفِ آخر'' جوش کی طویل نظم ہے مگر نامکمل رہی۔ اس میں انہوں نے عقل پرستی کو اہمیت دی ہے۔ علی سردار جعفری نے چند بند اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں حوالہ کے طور پر دیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''اس میں علمی سنجیدگی، فلسفیانہ وقار، تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت، پُرشکوہ ترنم اور پُرعظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کے امتزاج کا وہ معجزہ ہے، جو اردو شاعری اس سے پہلے پیش نہیں کر سکی تھی۔''

## ساغر نظامی

ساغر نظامی ہمہ جہت اور نابغۂ روزگار حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ نظم ونثر میں خوب سے خوب تر لکھا۔ ان کی کتاب ''بادۂ مشرق'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تو پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی اور ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں جو منظوم کلام ہمیں ملتا ہے اس روشنی میں ساغر نظامی ایک سچے محب وطن کے طور پر سامنے آئے درحقیقت وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔

دوسرا مجموعہ ''موج وساحل'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں قومی نظمیں، غزلیں اور گیت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی طویل نظموں میں ''پُجارن''، ''بھکارن''، ''شکنتلا، کالی داس کی ''ابھے گیان شکنتلم'' کا اردو ترجمہ ہے۔

''مشعل آزادی'' ایک طویل نظم ہے۔ یہ ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے، رزمیہ طرز اختیار کیا گیا ہے۔ سماجی ومعاشرتی تناظر کو پیش نظر رکھا ہے ساغر نے اپنی نظموں میں انسانیت عظمیٰ کا وقار، بغاوت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی فکر کے تانے بانے بُنے ہیں۔ شکنتلا اور انارکلی میں وہ ایک شاعر رومان کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جبکہ ''مشعل آزادی'' اور ''نہرو نامہ'' میں وہ شاعر انقلاب کی حیثیت سے اقبال کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''نہرو نامہ'' طویل

نظم ہے۔ اس میں مختلف بحریں ملتی ہیں۔ ساغر کا یہ جذباتی شاہکار ہے جو نہرو سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ نہرو سے جو عقیدت ساغر کو تھی اس کا اندازہ ذیل کے چند شعروں سے ہو جاتا ہے۔

زندگی اس کی آئینہ خانہ — جس میں عکسوں کی ایک دنیا تھی
ہندو افریشا کا عکس جمال — حریت اور نجات کے خدوخال
وہ پیامی بقائے باہم کا — جس نے طوفاں کے رُخ کو موڑ دیا

-----

''مشعل آزادی'' میں ساغر نے ظلم واستبداد کے خلاف اپنی فکر اور زور قلم سے کام لیا ہے۔

چلے چلو دوستو کہ وحشت نشان ہے یاترا ہماری
ملے ہیں تاج وکلاہ مٹی میں تخت ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں
قدم قدم پر کھنڈر ہیں محلوں کے راستے سرخ ہو رہے ہیں
فضا تصور کی کانپتی ہے مگر ہمارا سفر ہے جاری

-----

اس نظم میں جذبہ سرفروشی، ظلم وتشدد کے خلاف باغیانہ تحریکوں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی کے شہداء پر نوحہ کناں بھی ہیں۔ ساغر کی فکر اور تخیل کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''ساغر کا تخیل نئے دور کی آواز ہے، وہ نئے دور کا پیامبر ہے، وہ ہر جگہ انسان کے شعور، اس کی زندگی، اس کے ارتقاء اور اس کی خلاقانہ قوتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ انسان کی عظمت کا معترف ہے، وہ اسے مجبور اور بے بس نہیں سمجھتا، قضا وقدر کا غلام دیکھنا نہیں چاہتا، وہ انسان کو نئے جہان کا خالق اور پروردگار تسلیم کرتا ہے۔ ساغر کی شاعری میں ایک ترقی یافتہ انسان کے تابندہ خدوخال نظر آتے ہیں۔''

ساغر نظامی نے اپنی طویل نظم ''مشعل آزادی'' کو مختلف عنوانات سے سجایا ہے۔ مثلاً

نیرنگ آزادی، ارژنگ غلامی، رازداں، دریا، شعلہ کا سفران عنوانات کا اپنا ایک پس منظر ہے۔ غرض ان تمام حیثیتوں سے ساغر نظامی کی نظم نگاری میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا جوذکر ہمیں ملتا ہے اس سے دلی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل ساغر نے نظموں میں تنقید سے کام لیا ہے۔ ان کی نظموں میں جو طنز کارفرما ہے وہ فرقہ پرستوں اور مفاد پرستوں کے خلاف ہے۔ وہ ایک ایسی جمہوریت کے داعی ہیں جو انسان کی فلاح اور آزادی کے لیے ہو۔ ان کی نظموں میں سب سے زیادہ طاقتور جذبہ انسان دوستی اور حب الوطنی کا ہے۔ ساغر نظامی طویل نظم نگاری میں اپنی ایک شناخت اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کارناموں کو کسی بھی طور بھلایا نہیں جاسکتا۔

## حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کو ملّی شاعر بھی کہا جاتا ہے اور رزمیہ شاعر کی حیثیت سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیچرل شاعری میں بھی اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں اظہار کا منفرد انداز پایا جاتا ہے۔ نظموں میں سادگی اور بے ساختہ پن کے ساتھ آفاقی احساسات کا اظہار بھی ہے۔ اس نوع کی نظموں میں ''صبح وشام کہسار''، ''تصویر کشمیر''، ''شام رنگیں''، ''جلوۂ سحر''، ''بنجارہ پربت'' اور ''برسات'' اعلا معیار کی نظمیں ہیں۔ لیکن حفیظ کی طویل نظموں میں ''شہسوار کربلا'' اور ''شاہنامہ اسلام'' کو فوقیت حاصل ہے۔ شاہنامہ میں تقریباً آٹھ ہزار شعر قلمبند کیے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

تمنا ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں — دل سنگیں سخن کو آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے — کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسیِ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

-----

ہندوستان کی سیاسی وسماجی صورت حال کے پیش نظر حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو

کر قومی نظمیں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ حفیظ کے فن کے بارے میں اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے لفظ پر، مصرع دوسرے مصرع پر اور شعر دوسرے شعر پر اضافہ کرتا ہے۔ جس سے دیدہ و دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لطافت، سادگی اور دلاویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں، منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے۔''

حفیظ میں یہ تمام خوبیاں اقبال کے توسط سے آئیں کیونکہ وہ اقبال کی شاعری اور ان کی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ اقبال کے اثرات قبول کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کو منظوم پیرائے میں ادا کرنے کا خیال آیا۔ جو نہایت مشکل کام تھا لیکن قدرت نے یہ کام حفیظ پر سہل کر دیا اور پایۂ تکمیل کو پہنچا، یہی وہ طویل نظم ہے جو تا ابد یاد رکھی جائے گی۔

## جعفر طاہر

جعفر طاہر کے ہاں متعدد طویل نظمیں ہیں، ۔ طویل نظمیں لکھنا بھی ایک فن ہے۔ طویل نظم نگاری میں جعفر طاہر نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک منظوم ڈراما ''معجزۂ فن'' کے نام سے لکھا ہے انہوں نے طویل نظموں میں تاریخ، مذہب، فلسفہ و حکمت اور انسانی نفسیات کو تاریخی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے اس کی مثال نظم ''عراق'' ہے۔ واقعہ کربلا کی منظر کشی نہایت احتیاط سے کی ہے۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے اور دلچسپ بھی۔ اس نظم میں زیادہ تر عراقی بود و باش کو پیش نظر رکھا ہے۔ جگہ جگہ عربی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اقبال سے بے حد متاثر تھے اس تائید میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''جعفر طاہر نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں سے کلچر اور کلچر سے ادب کی نمو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں اور یہی ان کا ادبی کارنامہ ہے۔ پاکستان کی ثقافتی شناخت کے تخلیقی عمل میں وہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک نہیں ہوتے بلکہ اس

سارے عمل کے ساتھ اپنا ایک گہرا ثقافتی رشتہ پیدا کر لیتے ہیں۔ جب وہ پاکستان کی ثقافتی روح کو اپنی شاعری کا جامہ پہناتے ہیں چنانچہ پاکستان پر انہوں نے Canto لکھا، اس میں یہی تعلق ہمارے اجتماعی شعور میں ایک واضح صورت اختیار کرتا ہے اور جب یہ صورت حال ہے تو پھر جعفر طاہر پاکستانی ملی ادب میں اقبال کے قرب میں جگہ دیے جانے کا جائز حق رکھتا ہے۔''

جعفر طاہر نے ایک منظوم ڈراما ''معجزۂ فن'' کے نام سے لکھا جو خاصا طویل ہے۔ اور رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ ''پگمیلیاں'' اس نظم کا مرکزی کردار ہے اور یہ ایک بُت تراش ہے۔ اس کا زمانہ قبل مسیح ہے۔ مقام ایتھنز ہے۔ اس منظوم طویل ڈراما کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بت تراش ایک پیکر تراشتا ہے اور خود ہی اس پیکرِ بے مثال پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اس دیوی کے حضور دعائیں کرتا ہے اس کی چاہت میں صبح شام کرتا ہے۔ آخر کار اس مجسمہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ اب سراپا سیمیں بدن پری پیکر پگمیلیاں کی آغوش میں تھا، پھر اس نے باقاعدہ شادی کی اس مجسمہ کا نام ''گلاٹیا'' تھا۔ بہر کیف یہ نظم جعفر طاہر کی شاہکار نظموں میں سے ہے۔ تقریباً ۶۴ صفحات پر یہ نظم مشتمل ہے نظم کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

| | |
|---|---|
| ہر اشک مرا گوہر صد آب ہنر ہے | جو زخم ہے خورشید جہاں تاب ہنر ہے |
| کیا چیز ہے اللہ رے پیکر کدۂ خاک | ہر نقشِ نگیں دختر صد باب ہنر ہے |
| دل شمع طرب بن کے جلا بھی تو ہوا کیا | دل وہ ہے کہ جو مشعل محراب ہنر ہے |
| اے پیر مغاں بہر کرم کچھ تو ادھر بھی | سُنتے ہیں ترے پاس مئے ناب ہنر ہے |
| ہم خضر سے کم ہیں جو کریں خضر کی باتیں | قدموں کے تلے چشمۂ نایاب ہنر ہے |
| سینہ ہے کہ آئینہ اسرار جہاں ہے | کیا روشنی داغ جگر تاب ہنر ہے |
| یہ بات نہیں دیدۂ بیدار کے بس کی | اللہ رے کیا سلسلۂ خواب ہنر ہے |

اندازۂ فن کام نہیں بے ہنروں کا      یہ کارِ ہنر لائق اصحاب ہنر ہے
ناقدر[1] شناسوں سے تو ملتا نہیں طاہر      وہ سوختہ جاں ماہر آداب ہنر ہے

-----

یہ ایک تمثیلی نظم ہے۔ نظم میں ہر کردار جاندار ہے۔ غرض جعفر طاہر نے اقبال کے فکر وفن اور فلسفہ وآہنگ سے مکمل اکتساب کیا ہے۔ ان کی نظموں میں اقبال کی تقلید واضح نظر آتی ہے۔ خاص کر تشبیہات واستعارات اور خطیبانہ انداز اقبال سے مستعار لیا ہے۔ جعفر طاہر کی نظموں پر اقبال کی چھاپ گہری ہے۔

## علی سردار جعفری

علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا میں نمائندہ حیثیت اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سیاسی وسماجی انتشار پر جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمدرد انسان ہیں وہ انسان سے محبت کرتے ہیں اور اشتراکیت کے مبلغ ہیں۔ آزاد اور پابند نظموں میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے۔ یہ دکھی انسانیت کے علمبردار ہیں، ان کی نظموں کا موضوع انسان اور انقلاب ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات واستعارات اور علائم میں جو جدّت پائی جاتی ہے وہ اقبال کے افکار و خیالات کا ثمر ہیں اور ان کے اپنے مزاج کا خاصہ بھی ہے۔

''ان کی شاعری کا بنیادی مسئلہ طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مصائب ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی کشمکش سرمایہ دار لڑکوں اور لڑکیوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی موجودہ قدروں سے مطمئین نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں یہ قدریں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے ذہنوں کی پیدا کردہ ہیں۔''

---

[1] فاضل مقالہ نگار سے گزارش ہے کہ وہ اصل متن سے ''ناقدر شناس'' کی غلط ترکیب کی تصحیح فرمالیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اصل مصرع کچھ اس طرح ہو

''یوں قدر ناشناسوں سے ملتا نہیں طاہر'' (ادارہ)

انہی خیالات وموضوعات کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں نظامِ نو کی جو تشکیل کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غلامی ومحکومی کو بزدلی سمجھتے ہیں۔ ایک ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس میں دولت کی تقسیم، انسانیت کا وقار اور سامراجی طاقتوں کو نظموں میں موضوع بنا کر اپنے خیالات پیش کیے ہیں ان کی طویل نظموں میں ''ایشیا جاگ اٹھا'' اور ''پتھر کی دیوار'' نہایت اہم نظمیں ہیں ان نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پس منظر میں جس کرب اور بے چینی کو وہ ظاہر کر رہے ہیں وہ تابناک مستقبل کی روشن دلیل ہے۔ ''نئی دنیا کو سلام'' نظم میں سماجی ومعاشرتی پہلوؤں کو کردار نگاری اور جذبات نگاری سے مزین کیا ہے:

''نئی دنیا کو سلام'' واقعی ایسی نظم ہے جس میں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے۔ یہ نظم اپنی کردار نگاری اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی بہت اہم ہے۔ سردار کی اس طویل نظم کے علاوہ ''جمہور ایشیا جاگ اٹھا''، ''ہندوستان''، پتھر کی دیوار'' وغیرہ بھی طویل نظمیں ہیں جو کہ اپنے رنگ وآہنگ، موضوعات کی اہمیت اور وسعت کے سبب اُردو کی طویل نظموں میں خاص مقام رکھتی ہیں۔''

علی سردار جعفری کی نظموں میں اقبال کے آہنگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ نظموں میں اقبال کی تقلید مختلف انداز سے نظر آتی ہے۔ مثلاً ہئیت کے تجربے، تکنیک، بحروں مین اختراع اور اسلوب میں اقبال کی وسعت فکر کا دخل ہے۔ بنیادی طور پر یہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں گہرائی و گیرائی کے علاوہ وقت کی آواز، عصری گونج اور مظلوموں کی آہیں اور کراہیں محسوس کی جاتی ہیں۔ جبر واستبداد کی داستانیں، انسان کی گرتی ہوئی حالت، قومی وتہذیبی اقدار کا ختم ہونا سبھی کچھ نظموں میں نوحہ بن کر ظاہر ہوا ہے۔ اس لیے ان کی طویل نظموں میں دلی جذبات اور ذہنی اُپج کو اقبال کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

### حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر کی طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے اس نظم

کے ذیلی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ حرف زیاں، حرف حق، حرف وفا، یہ نظم موصوف نے اپنے بچوں کے حوالے سے نئی نسل کے نام کی ہے۔ ان کی نظمیں اس معیار کی ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اردو میں طویل نظم نگاری آزادی کے بعد بھی آب وتاب سے جاری رہی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آزادی کے حصول کے بعد اردو نظم میں کچھ ایسے رجحانات در آئے جس کا سلسلہ مغرب کی جدید طویل نظموں سے جا ملتا ہے اور طویل نظم صنعتی نظام حیات میں انسان یعنی فرد کی تنہائی، بے بسی، بے چارگی کے احساسات سے دوچار ہوئی۔ اس طرز کو جدیدیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر عصر حاضر کی طویل نظم نے اپنے خدوخال مرتب کیے۔ اس دور کی طویل نظموں میں فرد کی تنہائی، بے بسی، بے چارگی اور صنعتی نظام کی مشینی زندگی کی تصویریں بڑی واضح ہیں۔''

حمایت علی شاعر کی نظم میں بے بسی و بے چارگی کے تانے بانے نظر آتے ہیں نظم میں معاشرتی وسماجی عکس نہایت خوبی سے منعکس ہوا ہے۔

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو — سنو یہ میری نصیحت بھی ہے، وصیت بھی
کہ جبرِ وقت بھی تاریخ کا تقاضا ہے — اسے بھی مرحلۂ قرضِ جاں سمجھ لینا
مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو — میں آج اپنی کہانی سنا رہا ہوں تمھیں
وہ حرف جو کہ سنایا نہیں گیا تم کو — سنو کہ پہلے پہل میں سنا رہا ہوں تمھیں
مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو — تمھیں زمین پہ رہنا ہے آسماں کی طرح
یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز — کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

-----

اس نظم میں وہ سب کچھ موجود ہے جو موجودہ نسل کی ضرورت ہے۔ نظم میں تہذیبی اقدار کے ساتھ وطن سے محبت کا جذبہ موجزن ہے۔ ۱۰۵ اشعار پر یہ نظم محیط ہے۔ وہ شعراء جو طویل نظم

نگاری میں اعتبار رکھتے ہیں ان میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جان نثار اختر، اختر الایمان، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی، منظور حسین شور، ساحر لدھیانوی، یہ وہ شعراء تھے جو آزادی سے پہلے طویل نظم میں خاصا اضافہ کر چکے تھے۔ پھر آزادی کے بعد جن شعراء نے طویل نظم کو آگے بڑھایا ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، انجم رومانی، سلام مچھلی شہری، ضیاء جالندھری، منیب الرحمٰن، منیر نیازی، شاذ تمکنت، ادیب سہیل، عرش صدیقی، جیلانی کامران، حرمت الاکرام، بلراج کومل، جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد، جمیل ملک، عارف عبدالمتین، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جو طویل نظم کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دیئے گئے ناموں کی فہرست میں مزیدہ اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ اختصار کی وجہ سے چند نام دیئے گئے ہیں۔ ان شعراء نے طویل نظم میں جو اضافہ کیا ہے اسے اقبال کے وسیع تناظر میں اثرات کو قبول کرنے اور تقلید کرنے میں جو فخر و امتیاز کا اعتراف ہمیں ملتا ہے۔ یہی اقبال کی عظمت اور ان کی شاعری کا اعتراف ہے۔

-----

سیّدہ نغمہ زیدی

# اقبال اور اتحادِ بین المسلمین

قرآن حکیم میں خدائے بزرگ و برتر کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ اِخوَۃ" (سورۃ الحجرات۔آیت نمبر (۱۰)

ترجمہ: مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

سورۃ آلِ عمران میں میں مزید ارشاد ہوا۔

ترجمہ: تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفریق نہ پیدا کرو۔ اور اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمھارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔

اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ "مسلمانوں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ایسا ہے جیسے ایک دیوار کی اینٹیں۔ جن کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

"مسلمان قوم کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ جب جسم کے کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو تمام جسم اس میں شریک ہوتا ہے حکیم الامت۔ شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام کو بہ نظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے قرآنی مطالب و افکار کی روشنی میں اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔ ابتدائی کلام سے لیکر آخر تک اسلام اور ملتِ اسلامیہ سے گہری محبت و عقیدت اظہر من الشمس ہے۔ انھیں اس چیز کا گہرا ادراک تھا کہ مذہب اسلام ایک سرمدی و ابدی حقیقت ہے۔ اور اس کے اصول ہر زمانے کے انسانوں کے لیے یکساں مشعل راہ ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ جُوں جُوں علوم جدیدہ کی روشنی پھیلتی جائے گی۔ اسلام کی حقانیت بھی واضح ہوتی چلی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے خیالات کا مرکز و محور وحدت اسلامی کا تصور تھا اور وہ اس کے ان تھک مُبلغ تھے۔

اگرچہ ان تمام اشعار میں جو ۱۹۰۵ء سے پہلے لکھے گئے اقبال کے سیاسی خیالات کا مرکز وطن ہے اور وطنیت کے نہ صرف خود قائل ہیں بلکہ اوروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظمیں ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا اسلامی گیت، تصویرِ درد، اور نیا شوالہ وغیرہ میں وطن کی برتری اخلاص اور جذبے سے بیان کی گئی ہے۔ مگر ۱۹۰۷ء سے لے کر اقبال کی توجہ کئی سال تک بلادِ اسلامیہ، ملت اسلامیہ اور اتحاد بین المسلمین پر مرکوز رہی۔

یورپ کے زمانۂ قیام میں اقبال نے نظریۂ وطنیت کے مضر پہلوؤں کا قریب سے مشاہدہ کیا تو انھیں نظر آیا کہ اہلِ یورپ اس محدود تصور کی بدولت انسانی قدروں کو پامال کر کے خود بھی ہلاکت اور بربادی کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اسلام کے دیئے ہوئے نظریۂ قومیت کی طرف رُجوع کرنا پڑا۔ جو رنگ و نسل و زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدے کی بنیاد پر استوار ہے۔ اور اس میں جغرافیائی حد بندی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ غالباً اسی اثنا میں اقبال اتحادِ اسلامی کی تحریک سے جسے اہلِ یورپ نے پان اسلام ازم کا نام دے رکھا تھا، متاثر ہوئے۔ ان دونوں اثرات کا ثبوت اقبال کی اُس زمانے کی نظموں پیام عشق، عبدالقادر کے نام، صقلیہ وغیرہ سے ملتا ہے۔ غالباً قیام یورپ کے دوران مغربی ترقی اور معیار معاشرت کو دیکھ کر اقبال کو مسلمانانِ عالم کی پسماندگی و بدحالی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی ذلت و غلامی کا شدید احساس ہوا او وہ سنجیدگی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے ارتقا اور بقا کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ اپنی نظم پیام عشق میں انھوں نے واضح کیا کہ حقیقی چیز قومی وحدت ہے۔ افراد صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ باہم مل جل کر ایک قوم کی شکل اختیار کر لیں قوم باقی ہے تو افراد بھی باقی رہیں گے۔ اگر قوم باقی نہ رہی تو افرادِ قوم بھی مٹ جائیں گے۔ ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ مجاز کے طلسم میں آگ لگا دے اور قوم پر فدا ہو جائے۔ افراد کا وجود مجازی ہے اور قوم کا حقیقی یعنی اقبال مسلمانوں کو ایک قوم بننے کی تلقین کر رہے ہیں۔ یہی ان کے نظریۂ ملت کا آغاز ہے۔ ملاحظہ ہو:

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی　　فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

-----

ایک اور بات جس نے اقبال کو ملت اسلامیہ کی طرف جھکا دیا یہ تھی کہ وطن کی پس ماندگی کے مقابلے میں اسلامی ممالک میں مصطفیٰ کمال ۔ رضا خان پہلوی، امان اللہ خان، زاغلول پاشا، عبدالکریم اور ابن سعود کی سی اولوالعزم ہستیاں نظر آنے لگیں۔ اور وہ اُن سے متاثر ہو کر اپنی قلمی سرگرمیوں اور کوششوں کو ملتِ اسلامی کے اتحاد و اتفاق اور سیاسی بیداری کے لیے صرف کرنے لگے۔

اقبال نے اپنے اس عہد کی ذہنی کیفیت کا ذکر ایک جگہ اس طرح کیا ہے۔

''میں نے تہذیب مغربی کی کیفیت اور ملت اسلامیہ کی حالت دیکھ کر یہی فیصلہ کیا کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ہر ایسے مسلمان کو جسے قدرت سے کوئی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے چاہیئے کہ اپنی پوری طاقت مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کے لیے وقف کر دے۔ یہ ہزار نوبل انعامات سے بہتر ہے''

چنانچہ اس دور میں اقبال کا انداز تخاطب بدلا اور انھوں نے مسلمانوں کو اُن کا شاندار ماضی یاد دلا کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یہی جذبۂ محبت اسلام انھیں اس بات پر مائل کرتا ہے کہ وہ تمام اسلامی ممالک کو محبت اور اخوت کے ایک ایسے رشتے میں جوڑ دیں جو انھیں ایک مضبوط اور نا قابل تسخیر ملت بنا دے۔ انھوں نے مشرقی اقوام کے سامنے قومیت اور عالمگیر برادری کا اعلیٰ تصور پیش کیا۔ انھوں نے اس خیال کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا کہ مسلم ملت زمان و مکاں میں محدود نہیں ہے اس لیے دنیائے اسلام کے نا قابلِ تقسیم ہونے کے نظریے پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا مسلمان اپنے آپ کو ترکوں، عربوں، ایرانیوں، افغانوں اور ہندوستانیوں میں تقسیم نہ کریں۔

امت مسلم ز آیات خدا است — اصلش از ہنگامۂ قالو بلیٰ است

در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست — ملت اسلامیاں بود است و ہست

نیست از روم و عرب پیوند ما — نیست پابند نسب پیوند ما

-----

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

-----

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

-----

اقبال نے دنیائے اسلام پر نظر ڈالی تو انھیں وہ بھی انہی امراض میں مبتلا نظر آئی جن سے ہندوستانی مسلمان دوچار تھے۔ وہ ایسی ریاستوں میں تقسیم تھی جو خودغرضانہ جذبات رکھتی تھیں۔ بعض ریاستیں نسلی وجود کی بنا پر معدوم ہو رہی تھیں۔ عربوں اور ترکوں کی باہمی عداوت بھی تکلف دہ تھی۔ اقبال نے اپنا فرض سمجھا کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور نسل پروری کے خطرات سے آگاہ کریں۔ اس زمانے میں یورپ میں وطنی قومیت کا تصور ایک طرح کا سیاسی مذہب بن چکا تھا۔ خود وطنیت کا جو جواز بعض مسلم قائدین کی فکر میں ملتا ہے وہ اقبال کے یہاں نہیں کیونکہ اقبال کے نزدیک اسلامی اتحاد بجائے خود ایک سیاسی وحدت ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں۔ جن کی پختگی مرورِ ایام واعصاد سے متاثر نہیں ہو سکتی۔"

اقبال کے نزدیک عالم اسلام کا انتشار اہلِ مغرب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اُن کی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ اور انھیں متحد نہ ہونے دیا جائے۔ انھوں نے واضح کیا کہ ملت اسلامیہ کی طاقت کسی وطن سے نہیں بلکہ توحید اور وحدت ملت سے ہے اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔"

اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ اپنے ایمان وعقیدہ اور نظامِ حیات کی وجہ سے ملک ونسب پر انحصار رکھنے والی مغربی قومیتوں سے یکسر مختلف ومنفرد ہے۔ اُن کے نظریات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

اُن کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار　　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

-----

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے　　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

-----

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی اور ہے کہ وہ ترکی عجمی، ایرانی اور افغانی کے سارے امتیازات مٹا کر متفق اور متحد ہو جائیں اور اپنے آپ کو فقہی گروہوں میں بانٹنے کے بجائے رنگ ونسل کے تمام جھگڑے مٹا کر اصول دین کو اپنا لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری حج کے موقعے پر دیئے گئے خطبے کو نمونہ عمل بنائیں اور اس طرح مغربی طاقتوں کی اس سازش کو ناکام بنا دیں۔ جس کے تحت وہ انھیں تقسیم کر کے اُن کے وسائل پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک رنگ ونسل، قومیت اور تہذیب کی یہ تفریق خواجگی کے چُن چُن کر بنائے گئے مسکرات ہیں۔ ملت اسلامیہ کی تکمیل ہی ملت انسانیہ کی تشکیل ہے۔ کیونکہ اس کے گرد رنگ ونسل اور جغرافیائی حدود کا حصار نہیں جیسا کہ موجودہ قومیتوں کے گرد قائم ہے۔ دنیا کے مختلف گروہ خواہ وہ کسی نسل سے ہوں کسی خطۂ ارض میں آباد ہوں اور کسی معاشرت کے حامل ہوں اور ان کی زبانیں بھی کتنی ہی مختلف ومتضاد کیوں نہ ہوں مگر ایمان وتوحید کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب کا منصب ایک ہو جاتا ہے۔ نسل وقوم، تہذیب وتمدن اور اختلاف زبان کی کوئی مغائرت ان سب کے دلوں کو ایک بنانے سے نہیں روک سکتی۔ اقبال اسلام کی بقا مسلم اُمہ کے اتحاد میں دیکھتے ہیں زمانے کے انقلابات اور حوادث کے زیر اثر ملکوں کے جغرافیائی حدود بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت ملت اسلامیہ کا ہی حصہ ہے کہ وہ زمان ومکاں کی قیدوں سے آزاد ہے۔ اس کا وطن ہندو روم، شام و یونان نہیں جو فنا ہوتے رہتے ہیں بلکہ اس کا

ملجی و ماویٰ مسکن و وطن اسلام ہے۔ اس نظریے کے تحت اقبال کی خواہش ہے کہ وہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو کر چھوڑیں گے۔ اگر یہ کام مشکل ہے تو اس مشکل کو آسان کرنا ہی انکا نصب العین ٹھہرا ہے۔ اُن کے مندرجہ ذیل اشعار مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ربط و ضبط ملت بیضا سے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گزر

-----

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

-----

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

-----

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

-----

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

-----

اقبال کی مثنوی اسرار خودی اور رموزِ بے خودی کا مقصد بھی اتحاد بین المسلمین کی تاسیس اور استواری ہے۔ اسرار خودی سے افراد ملت اسلامیہ میں احساس خودی پیدا کر کے ان کی شخصیتوں کو اکمل اور ان کے خیالات کو ارفع کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح رموز بے خودی کا مطلب اختلاط افراد سے جماعت کی تشکیل اور پھر جماعت کی تکمیل ہے۔ اُن کے ہاں اتحادِ اسلامی کے لیے صحیح لائحہ عمل یہ ہوگا کہ اجتماعی وحدت کے احساس کی نشو و نما کی جائے۔ وہ مغربی قوموں کی ریشہ دوانیوں جارحیت اور اسلام دشمنی سے اچھی طرح واقف تھے وہ عالم اسلام کے سیاسی ابتلا پر بھی سخت رنجیدہ تھے اور اپنے اس رنج والم کو انھوں نے متعدد مقامات پر ظاہر کیا ہے۔ فلسطین، طرابلس ترکی، سوڈان مغربی طاقتوں کی جارحیت کا کئی بار شکار ہوئے۔ اقبال کے پیش نظر ساری صورت حال اپنی

عریاں حقیقتوں کے ساتھ موجود تھی کہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے اتحادِ اسلامی اور عالم اسلام کی قوت و مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں میں جگہ جگہ تفریق پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں عربوں اور ترکوں میں منافرت کے پس پشت بھی اُن کا ہاتھ تھا۔ مسئلہ فلسطین پر اقبال نے جو بیان دیا تھا اُس میں کہتے ہیں:

''فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں انقلاب و سیادت کی شکل میں اپنے ایک مقام کی متلاشی ہے۔''

وہ عربوں اور ترکوں کے درمیان حائل خلیج کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضرر رساں سمجھتے تھے۔ وہ تلقین کرتے ہیں کہ تمام مسلمان ممالک اپنی حدود میں اتفاق رائے کے رجحانات کو تقویت پہنچائیں اور پھر زیادہ سے زیادہ معاملات میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ اور یہی وحدت ان ملکوں کی استعماری قوتوں کی دستبرد سے انفرادی حیثیت کی حفاظت کی ضامن بھی ہوگی اور اجتماعی قوت کا سرچشمہ بھی۔ کیونکہ وحدت اسلامی کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی اور یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قائم کرے گی۔

۱۹۱۱ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں اقبال نے واضح طور پر تسلیم کیا کہ:

''مجھ کو ''پان اسلامسٹ'' ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔''

مگر اتحاد اسلامی کے اس مشن میں فرقہ بندی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کے خاتمے کے لیے اقبال تمام عمر کوشاں رہے۔ اُن کے نزدیک مسلمان فرقہ آرائی کی زنجیروں میں اسیر ہیں۔ اپنی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' میں وہ ان کی زبان سے اپنے نظریات کا پرچار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم کو دین کی تعلیم دینا تو نیکی کا کام ہے۔ مگر فرقہ بندی کے لیے زبان نہ کھولنا کیونکہ فرقہ بندی کے اندر قیامت کا ہنگامہ چھپا ہوا ہے۔ وہ بپا ہوگا تو سب کچھ ملیا میٹ کر ڈالے گا۔ یعنی باہمی

جھگڑوں میں مسلمان قوم تباہ ہو جائے گی۔ واعظوں کی تحاریر و تقاریر میں ایسی متنازعہ باتیں نہ ہوں جن سے لوگوں کے دل دُکھ جائیں۔ علمائے کرام کی تقریروں سے عوام میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو۔ کوئی ایسی بات زبان پر نہ آئے جس سے کسی کا دل دُکھے۔ اس لیے کہ دل دکھا کر میل جول اور اتحاد نہیں بڑھایا جا سکتا۔ مذہب کسی سے بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ فرقہ آرائی کے شجر کا پھل تعصّب ہے۔ اس تعصب نے آدم کو جنت سے نکلوایا۔ اُن کے نزدیک ہند کے فرقہ ساز آذری کر رہے ہیں۔ مسجد میں شیخ کی تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ گیا ہے۔ یعنی اُن میں پہلا سا مذہبی دم خم نہیں رہا۔ وہ اتحاد و اتفاق کی تعلیم دینے کے بجائے باعث نفاق بن رہے ہیں۔ علمائے دین نظری و فروعی مسائل کی بحث میں مبتلا ہیں۔ قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں جب کہ برہمن کا زنار کتنا پختہ ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے کافروں کے طور طریقے اپنا لیے ہیں اور کافروں نے مسلمانوں کا شیوہ اپنا لیا ہے جب کہ اس قوم کا نقصا و نفع ایک ہے۔ سب ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں حرم پاک بھی۔ نبیؑ سبھی، قرآن کریم بھی ایک ہے۔ پھر تفرقہ بازی اور فرقہ واریت کا زہر کیوں گھولا جا رہا ہے۔ دراصل ہم اسلامی نظریے کی آفاقیت اور عالمگیریت کو بھول چکے ہیں۔ دنیا کی کوئی قوم ہو اس وقت تک پھل پھول نہیں سکتی جب تک اُس میں فکری وحدت نہ ہو اگر ہم میں فکری وحدت ختم ہو جائے گی تو یہ قوم خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ٹوٹتی، اُڑتی، گرتی اور بکھرتی نظر آئے گی۔ اقبال کے نزدیک مسلمان قوم کی آبرو ملت کی جمعیت سے باقی تھی جب تک اتحاد رہا ترقی کرتے رہے مگر نفاق کی بدولت آج دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ قوم گویا جسم ہے اور افراد اعضائے قوم ہیں۔ کسی بھی عُضو میں تکلیف ہو۔ مگر آنکھ روتی ہے۔ اے نادان! مسلمانو تعصّب اور فرقہ واریت چھوڑ دو۔ اگر تم نے یہ بات نہ سمجھی تو تمہاری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں۔ اقبال نے فرقہ واریت کے خلاف اپنی بے شمار نظموں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غرۂ شوال، جواب شکوہ، شمع و شاعر اور تصویر درد جیسی نظموں کے مندرجہ ذیل اشعار اقبال کے خیالات کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

-----

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

-----

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

-----

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی کو روتا ہے غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

-----

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

-----

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

-----

اقبال کی چشم بصیرت نے آنے والے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ یہ قوم باہمی نفاق اور فرقہ واریت کا شکار ہو کر اسلامی اتحاد اور قومی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دے گی اور مسلم اُمہ کی مضبوطی اور ترقی و خوشحالی محض ایک خواب بن جائے گی۔ موجودہ عہد میں اقبال کے خدشات درست ثابت ہو رہے ہیں مگر وہ اندھیرے میں روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے مسلمانوں کو آپس میں محبت اور پیار کا درس دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک فطرت کا مقصود اور رمزِ مسلمانی محبت ہے۔ قرآن میں غوطہ زن ہو کر ہی مرد مسلماں کو وحدت کردار عطا ہو سکتی ہے۔ بیمار قوموں کی شفا محبت و الفت میں ہے۔ اور مسلمان اپنی تقدیر کو اُس وقت ہی بدل سکتے ہیں جب وہ باہمی نفاق کے بجائے اخوت اور بھائی چارہ اختیار کریں اور محبت کے شرر سے دلوں کو سراپا نور بنا دیں۔ مگر یہ کام ہر فرد کو کرنا ہے۔ کیونکہ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔

آج وطن عزیز میں آگ و خوں کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ مسلمان بھائی ایک دوسرے کے

گلے کاٹ رہے ہیں۔ درندے بھی انگشت بدنداں ہیں۔ مذہب کے نام پر انسانی خون بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ قوم کو اتفاق و اتحاد کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے زیادہ کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نظریات اقبال سے مستفید ہونے کا شرف عطا فرمائے۔ قوم کی نجات اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پر عمل کرنے میں ہی پوشیدہ ہے۔ ہر شخص کو تہہ دل سے اپنا محاسبہ کرنے اور کلام اقبال پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

-----

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

-----

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

-----

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

-----

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

-----

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

-----

درحقیقت موجودہ حالات میں قوم کے ہر فرد کو رحمت للعالمینؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ذات کو دوسروں کے لیے رحمت بنائیں۔ اور اتحاد و اتفاق کے ذریعے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں یہی عمل روحِ اقبال کی خوشنودی اور اللہ رسولؐ کی رضامندی کا باعث بن سکتا ہے۔ (تمت بالخیر)

## مسلم شمیم

# حیاتِ فیض، جہاتِ فیض

۱۹۳۰ء کی دہائی کے آغاز میں جناب فیض ادب کے افق پر ایک روشن ستارے کے مانند ابھرے اور دیکھتے دیکھتے ماہِ کامل اور پھر آسمانِ ادب پر مہرِ نیم روز کی صورت اپنی تخلیقی شعاعوں سے کائناتِ ادب کو منور کرنے لگے اور کچھ ہی عرصے میں جناب فیض نے ایک نظامِ شمسی کا روپ دھار لیا اور جس کے گرد متعدد سیارگانِ فکر وفن محوِ گردش نظر آئے۔ وقت کے ساتھ فیض کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں پوری دنیا میں فیض پر اتنا کثیر اور متنوع تحریری مواد وجود میں آیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ حال میں سید مظہر جمیل نے ایک معرکتہ الآرا کارنامہ تصنیف کیا ہے جو فیض کی سوانح عمری 'ذکرِ فیض' ہے، اُس کے 'حرفے چند' میں اُنھوں نے بیان کیا ہے۔

"فیض پر پہلا تحقیقی مقالہ پنجاب یونیورسٹی میں ایک طالبہ حنیفہ اختر نے ۱۹۶۷ء میں پیش کیا تھا اور ایم۔ اے کی سند پائی تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ مذکورہ مقالہ ہنوز کتابی صورت میں شائع نہیں ہوسکا اور نہ اب اُس کا کہیں سراغ ملتا ہے۱۹۸۳ء میں جامعۂ کراچی سے ایم۔ اے اردو کے سلسلے میں اشفاق حُسین نے ایک مقالہ 'فیض اور اُن کی شاعری' پیش کیا تھا جسے بعد میں ادارۂ یادگار غالب نے 'فیض۔ ایک جائزہ' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس مختصر سی کتاب میں سوانحی مواد کی گنجائش نہ تھی۔ بہر کیف تیس برس کے بعد اشفاق حسین نے اکادمی ادبیات پاکستان کے معروف سلسلۂ 'کتب' پاکستانی ادب کے معمار' کے تحت 'فیض شخصیت اور فن' کے عنوان سے کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کو فیض کی پہلی باقاعدہ مگر مختصر سوانح عمری کہا جاسکتا ہے۔

جناب فیض کے نواسے ڈاکٹر علی مدیح ہاشمی نے اپنے نانا کی بات ایک خوب صورت کتاب

انگریزی میں "The Way it was Once" لکھی۔ اُنھوں نے سید مظہر جمیل کی کتاب 'ذکرِ فیض' کی بابت اس کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے:

''فیض احمد فیض کی وفات کو تیس برس ہونے کو ہیں۔ جتنی شہرت اور پذیرائی اُن کو اُن کی زندگی میں حاصل ہوئی، وہ بہت کم شعرا کا حصہ رہی ہے، خاص کر برصغیر پاک و ہند میں جہاں شعرائے کرام کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اُن کے فن کو سراہا نہیں گیا۔ اس مقبولیت کے پیشِ نظر یہ بات حیران کن بھی ہے اور افسوس ناک بھی کہ فیض کی زندگی اور فن پر کوئی مفصل کتاب اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اُن کی زندگی پر سب سے عمیق کتاب ماسکو یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی 'پرورش لوح و قلم: فیض، حیات اور تخلیقات' ہے، لیکن یہ کتاب بھی صحیح معنوں میں ایک سوانحِ حیات نہیں ہے۔ ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جناب مظہر جمیل کی یہ نئی کاوش واقعی قابلِ ستایش ہے۔ مظہر صاحب پیشے کے لحاظ سے وکیل ہیں اور اس کی جھلک کتاب میں بھی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ بہت سی متفرق تحریروں کے نچوڑ کو ایک جگہ اکٹھا کیا ہے، اور جو حوالے اُنھوں نے اکٹھے کیے ہیں وہ مستقبل میں لکھنے والوں کے لیے بہت قیمتی ثابت ہوں گے۔ یہاں ایک دو اور چیزوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ فیض صرف برصغیر پاک و ہند ہی میں مقبول نہیں تھے، دنیا کے کسی بھی خطے میں جہاں اردو شاعر کو پڑھا اور سراہا جاتا ہے، وہاں فیض کا نام زندہ و تابندہ ہے۔ اس کی ایک وجہ بقول پروفیسر فرانسس پرچٹ (Frances Pritchett) کے فیض کی شاعری کلاسیک اور جدید کے درمیان رابطے کے مانند ہے۔ اُن کا طرزِ بیاں اور پیکر تراشی کلاسیکی شعرا خاص کر غالب سے متاثر ہے، جب کہ اُن کی شاعری کا موضوعِ سخن خالصتاً جدید ہے۔ بہت سے نقادوں نے برصغیر پاک و ہند کے عظیم شعرا کی فہرست میں میر۔ غالب اور اقبال کے بعد فیض کا نام گنوایا ہے، گو فیض نے ہمیشہ اپنی مخصوص کسرِ نفسی سے اس مماثلت سے انکار کیا تھا، البتہ اُن کا غالب اور اقبال دونوں

سے لگاؤ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اگر ہم (فیض کی خواہشات کے خلاف) اس بات کو تسلیم کرلیں کہ فیض کا شمار میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی فہرست ہی میں ہونا چاہیے تو ہمیں مظہر جمیل صاحب کو اس کام پر مزید داد دینی پڑے گی۔ اس کام کا ایک اور خوش آیند پہلو بھی ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ فیض کی زندگی ایک خاص سماجی اور سیاسی فلسفے کے زیرِ اثر رہی یعنی فلسفۂ اشتراکیت (Socialism) فیض نے تمام عمر اس جدوجہد میں حصہ لیا اور اس کی پیروی کی۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء کے ایک نامے میں فیض اپنی تاریخِ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفترِ بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اُن کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔"

اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا تاریخ کی کرشمہ سازی کہ ترقی پسند تحریک کے عمائدین میں سے بیش تر کا تعلق معاشرے کے اشرافیہ (Elite of the Society) سے تھا اور وہ مہاتما گوتم بدھ کی سنت پر عمل پیرا ہو کر مظلوم انسانیت اور جہل و افلاس زدگی کے شکار طبقات کے درد کا مداوا ڈھونڈنے نکلے اور اس مشن کی تکمیل کی راہ میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ اس باب میں سجاد ظہیر، علی سردار جعفری غلام ربانی تاباں، کیفی اعظمی، سبطِ حسن، حسن ناصر، حسن نعیم، پرویز شاہدی اور اس فہرست کے کتنے ہی نام لیے جاسکتے ہیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک۔ اینگلز اس قبیلۂ کشتگاں کے سرخیل تھے۔ سو فیض احمد فیض کے خاندانی سلسلے کو اسی حسب ونسب کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ فیض احمد فیض کے والد خان بہادر سلطان محمد خان، میر منشی عبدالرحمان والیِ افغانستان سابق سفیر دولتِ افغانستان لندن، سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ علم وادب سے انھیں بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر ڈاکٹر ضیاء الدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے

اُن کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے رکن انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمنِ حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرکردہ رکن تھے۔ اُن کی مشہور تصانیف میں افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمان کی سوانح عمری، جو انگریزی میں ہے، شامل ہیں۔ چوہدری سلطان محمد خان نے خاندانی پیشے زراعت کو چھوڑ کر فارسی۔ عربی اور انگریزی میں دست گاہ حاصل کی۔ افغانستان کے سرکاری وفد کی پیش کش پر وہ لاہور سے کابل گئے جہاں والی افغانستان عبدالرحمان نے اُنھیں چیف سکریٹری اور پھر سفیر بنا کر لندن روانہ کیا لندن کے قیام کے دوران آپ نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ یہاں آپ کی علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ خان بہادر لندن میں تین سال گزارنے کے بعد افغانستان واپس ہوئے جہاں آپ نے ایک وزیر زادی سے شادی کی، لیکن حکومتی سازشوں سے جان بچا کر راتوں رات افغانستان کو ترک کر دیا۔ دورانِ سفر آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ سیالکوٹ پہنچ کر اُنھوں نے بیرسٹر کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا اور یہاں دو شادیاں کیں جن سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چوہدری صاحب کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ فیض احمد فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ ہے۔

برصغیر کے مسلم معاشرے میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ تعلیمی زندگی کی ابتدا گھر یا مسجد میں قاعدہ بغدادی سے ہوتی تھی۔ اسی ثقافتی پس منظر میں فیض احمد فیض کی تعلیمی زندگی شروع ہوئی اور فیض احمد فیض نے ۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب گئے اور عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کی۔ ۱۹۲۱ء میں وہ سیالکوٹ کے اسکاچ کے مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹر میڈیٹ پاس کیا، اسی دوران علامہ اقبال کے استاد شمس العلما مولوی میر حسن سے باقاعدہ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں اُنھوں نے گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم۔ اے اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے کیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔

حصولِ تعلیم سے عہدہ برا ہو کر اُن کی معاشی زندگی کا سفر شروع ہوا اور فیض درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک فیض احمد فیض نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرر کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک وہ ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ فوج میں مشغول بکار رہے اور ۱۹۴۲ء میں بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازم رہے اور فوج کے شعبہ تعلقاتِ عامہ میں مشغول رہے جہاں ۱۹۴۳ء میں انھیں میجر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۴۴ء میں وہ لیفٹننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۹۴۷ء میں فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ لاہور واپس ہوئے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ ''ادبِ لطیف'' کے مدیر رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک اُنھوں نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شائع ہونیوالے روزنامہ 'پاکستان ٹائمز'، روزنامہ امروز' اور ہفت روزہ 'لیل ونہار' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۴ء تک وہ افرو ایشیائی سہ ماہی مجلّے 'لوٹس بیروت' کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک وہ پاکستان آرٹ کونسل کے سکریٹری مقرر رہے اور ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں محکمۂ اطلاعات ونشریات میں بطورِ اعزازی مشیر خدمات سرانجام دیں ۱۹۷۲ء میں وہ قومی ادبی اکادمی پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔

سلسلۂ معاش کے استوار ہونے کے دوران ہی فیض کی ازدواجی زندگی کا مرحلۂ خوش گوار شروع ہوا اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لندن نژاد خاتون مس ایلس جارج سے اسلامی شرع کے مطابق اُن کا عقد ہوا۔ ایلس، بیگم دین محمد تاثیر کی حقیقی بہن تھیں۔ شادی سری نگر کشمیر میں ہوئی، شیخ محمد عبداللہ نے نکاح پڑھایا۔ فیض کی والدہ مرحومہ سلطان فاطمہ نے ایلس فیض کا اسلامی نام کلثوم رکھا۔ فیض نے اپنے مجموعے 'دستِ صبا' کا انتساب کلثوم کے نام کیا۔ مرزا ظفر الحسن فیض کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''براتیوں میں جوش ملیح آبادی اور مجاز مرحوم بھی شامل تھے۔ فیض کے مالی حالات اتنے

سقیم تھے کہ وہ اپنے لیے کپڑے بھی نہ سلوا سکے، صرف ایلس کے لیے ایک انگوٹھی خرید سکے کیونکہ ایلس نے صرف یہی خواہش کی تھی کہ انھیں شادی میں انگوٹھی ضرور پہنائی جائے۔ متفرق اخراجات کے لیے فیض کو میاں افتخار الدین مرحوم سے تین سو روپے قرض لینے پڑے تھے۔ نکاح نامے پر فیض اور ایلس کے دستخطوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر تاثیر اور نور حُسین کے دستخط ہیں جو اُن دنوں سری نگر میں ہیلتھ انسپکٹر تھے، بیگم تاثیر کے بھی دستخط ہیں جو ایلس کی سگی بہن ہیں"۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اوائل ہی سے فیض اس تحریک کے جزوِ لاینفک رہے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے قیام میں سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ملک راج آنند اور دوسری تعلیم یافتہ شخصیات کے ساتھ فیض احمد فیض نے بھرپور تعاون کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک حکومتِ پنجاب لیبر ایڈوائزری کمیٹی کے وہ سرپرست رہے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر بنے اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۰ء تک اگزیکٹو کونسل عالمی امن کونسل کے رکن رہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے وہ ایرانی عوام، فلسطینی عوام اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک سے جڑے رہے اور ۱۹۵۸ء سے آخری عمر تک الفرو ایشیائی ادبی انجمن کے بنیادی رکن رہے۔ ۱۹۴۲ء میں فوجی ملازمت کے دوران انھیں MBE کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں لینن انعام دیا گیا فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں اُنھیں ادبی الفرو ایشیائی لوٹس انعام دیا گیا۔

فیض کی داستانِ حیات میں راولپنڈی سازش کیس ایک اہم واقعے یا حادثے کا بیانیہ ٹھہرتا ہے۔ فیض نے ۹ مارچ ۱۹۵۱ء سے ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء تک لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں چار سال ایک ماہ اور گیارہ دن کی قید کاٹی۔ یہ سازش، راولپنڈی سازش مقدمہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پہلے تین مہینے قیدِ تنہائی کی سزا ہوئی جس میں اُنھیں اپنے بیوی بچوں تک سے ملنے کی اجازت نہیں تھی، اُنھیں قلم اور کاغذ بھی استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ فیض کی بہت

سی نظمیں، جو ''زنداں نامہ'' میں ہیں، اسی قید کے زمانے میں اُنھوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ فیض ۱۹۵۸ء سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں رہا کیے گئے۔ یہ دور ایوب خان کی آمریت کا دور تھا۔

فیض کا حلقۂ ربط وارتباط شروع ہی سے وسیع اور متنوع رہا۔ وہ بے حد متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کا دائرہ تعلق عامہ کرۂ ارض کے وسیع ترین خطوں پر محیط تھا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کئی ملکوں کا دورہ کیا، بعض مقامات پر وہ طویل عرصے کے لیے مقیم ہوئے؛ انھوں نے مختلف سیاسی وادبی انجمنوں سے ارتباط رکھا، کئی یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچر دیے اور کئی کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کی جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدورں کے نمایندے کی حیثیت سے اُنھوں نے سان فرانسسکو اور ۱۹۴۹ء میں جنیوا میں شرکت کی اور ۱۹۵۸ء میں تاشقند اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک انگلستان میں قیام کیا۔ فیض نے روس کے تقریباً تمام بڑے اور مشہور علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ سیلون، کیوبا، مصر، لبنان، الجیریا، کینیڈا اور متعدد یورپی ملکوں کے مشاعروں، مباحثوں، کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے۔ اردو ادب کے وہ ایسے بڑے شاعر ہیں جو ملک اور بیرونِ ملک مختلف مقامات پر محفلیں سجاتے رہے۔ وہ ایک بین الاقوامی بلکہ عالمی منظرنامے کے تخلیق کار اور صاحب فکر و دانش بنے رہے۔

۱۹۴۸ء میں اخوان الصفا کے مشاعرے میں فیض نے جو پہلی غزل پڑھی، اُس کا پہلا شعر یہ تھا:

لب بند ہیں، ساقی! مری آنکھوں کو پلا دے        وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

------

اُن کی پہلی نظم 'میرے معصوم قاتل' ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالے 'راوی' میں شائع ہوئی یہ نظم نایاب ہے۔

فیض نے باقاعدہ کسی کی شاگردی نہیں کی۔ ایک سوال کے جواب میں فیض نے کہا، ''میں نے اپنے ذوق و وجدان کو رہبر اور خود تنقیدی و خود احتسابی کو شعار بنا کر ہمیشہ اپنے کلام پر نظر ثانی

کی۔ اس کے علاوہ چند مخلص اور قریبی احباب سے جن میں ایم۔ ڈی۔ تاثیر صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری اور کرنل مجید ملک بطور خاص قابلِ ذکر ہیں، مشورے کرتا رہا''۔ البتہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ فیض کے معنوی اساتذہ میں حماسہ کے شعرا، امراء القیس، حافظ، میر، سودا، انیس، غالب، نظیر، اقبال، حسرت کے علاوہ انگریزی شعر میں شیکسپیئر، شیلے، براؤننگ اور کیٹس قابل ذکر ہیں۔ اقبال کے 'پیام مشرق' کے انتخاب کے منظوم ترجمے میں فیض صوفی تبسّم اور کرنل مجید کی مدد کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ فیض کہتے ہیں:

''جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا، 'میاں! ٹھیک ہے، تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو، مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل و دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا، اس وقت یہ تضیعِ اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مفسر بھی ہیں تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا، 'طرح پر شعر کہو' ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا، فوراً اس طرف توجہ کرو، شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ گے'۔ مجھے یاد ہے، ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا۔ چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا چاندنی، بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سایے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُر اسرار منظر بن گئے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے، ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی۔ جب شہر کی گلیوں، محلوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت، کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آجاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ 'نیم شب، چاند خود فراموشی، بام و در خامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں''

فیض نے اعلیٰ تعلیم اور استادی کے دوران جم کر مطالعہ کیا۔ فیض کے بموجب انھیں بچپن سے مطالعے کا شوق تھا، چنانچہ وہ اکثر ناول اور کہانیوں کی کتابیں چھپ کر پڑھتے تھے والد کے کہنے پر انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ فیض کا یہ مطالعہ اُن کے قید و بند اور پردیس میں اقامت کے دوران میں جاری رہا۔ فیض اردو ادب کے علاوہ دنیائے ادب کے ممتاز اور انقلابی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے مطالعے میں ادب سائنس، فلسفہ، سیاسیات، نفسیات، تاریخ اور مذہب وغیرہ شامل تھے۔ فیض ایک من علم سے سومن تخلیق کا کام لیتے تھے۔ فیض کے ادبی مضامین جو ''میزان'' میں موجود ہیں، اُن کے ادبی، ثقافتی اور ترقی پسند نظریے پر اُن کی گہری واقفیت کی دلیلیں ہیں۔ فیض کا مطالعہ کتابی مطالعے سے زیادہ مجلسی اور مشاہداتی تھا۔ لاہور کے تین چار گھر جن میں صوفی تبسم، تاثیر اور پطرس بخاری وغیرہ محفلیں سجاتے تھے، علم و حکمت کی یونیورسٹیاں سمجھی جاتی تھیں جہاں علم و دانش کے خزانے لٹائے جاتے اور اُس علمی دولت کو لوٹنے والوں میں فیض بھی شامل تھے۔

فیض کے شعری مجموعوں میں 'نقش فریادی' (۱۹۴۱ء)، 'دستِ صبا' (۱۹۵۲ء)، 'زنداں نامہ' (۱۹۵۶ء)، 'دستِ تہِ سنگ' (۱۹۶۵ء)، 'سرِ وادیِ سینا' (۱۹۷۱ء)، 'شامِ شہرِ یاراں' (۱۹۷۸ء) 'میرے دل، میرے مسافر' (۱۹۸۱ء)، 'سارے سخن ہمارے' (کلیات۔۱۹۸۳ء)، 'نسخہ ہائے وفا' (کلیات۔۱۹۸۴ء) شامل ہیں۔ اُن کے نثری مجموعوں میں 'میزان' (تنقیدی مضامین۔۱۹۶۲ء) 'صلیبیں میرے دریچے میں' (خطوط۔۱۹۷۱ء)، 'متاعِ لوح و قلم' (۱۹۷۳ء)، 'مہ و سالِ آشنائی' (۱۹۸۰ء)، 'انتخابِ پیامِ مشرق' (۱۹۷۹ء) سفرنامہ 'کیوبا' (۱۹۷۳ء)، 'ہماری قومی ثقافت' (۱۹۷۶ء) شامل ہیں۔

فیض جوانی میں ناٹک دیکھتے تھے، چنانچہ کچھ ڈرامے لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے: (۱) 'دی احباب' ۱۹۳۰ء میں ''راوی'' میں شائع ہوا، (۲) 'شکست' ۱۹۳۱ء کی کوشش تھا، (۳) سانپ کی چھتری، (۴) 'ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے' اور

(۵) پرائیویٹ سکریٹری' لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے۔ یہ ڈرامے "متاعِ لوح و قلم" میں موجود ہیں۔ دو اور ڈرامے 'توہینِ عدالت' اور پنجابی ڈراما' بقول مرزا ظفر الحسن تلاش کے باوجود مل نہ سکے۔

عالمی ادب میں کلامِ فیض کے تراجم کا بیان بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے تراجم انگریزی، روسی، جاپانی، چینی، ترکی، جرمنی، فرانسیسی، نارویجن، سویڈن، ڈچ، سواحلی چیکوسلواکیہ، عربی، فارسی اور برِ صغیر کی تمام بڑی زبانوں میں بڑے پیمانے پر ہوئے۔ جناب فیض کو بیسویں صدی کے شعرا میں اس لحاظ سے بھی فوقیت اور برتری حاصل رہی جس سے اُن کی عالمی پیمانے پر پذیرائی اور اُن کے فنی کمالات کے اعتراف کا اندازہ ہوتا ہے اور جو اُن کی شاعری میں آفاقیت، امنِ عالم اور انسانیت دوستی پر دال ہے۔ فیض نے دو فلموں کے گانے اور مکالمے لکھے جو' جاگو، ہوا سویرا' اور دور ہے دُکھ کا دیس میں "Poems by Faiz" کے نام سے ۱۹۵۷ء میں وی۔ جی۔ کیرنن نے فیض کی شاعری کے انتخاب کا ترجمہ کیا جو فیض پر انگریزی میں پہلی کتاب ہے۔

ترقی پسند تحریک کا اہم ترین حوالہ اگر فیض احمد فیض ٹھہرتے ہیں تو خود فیض کا سب سے بڑا حوالہ ترقی پسند تحریک ہے۔ ترقی پسند نظریے اور آدرش کو فیض کے فکر و فن کا سرچشمہ اور بالیدگی کا وسیلۂ عظیم کہنا چاہیے۔ اُن کی تخلیقیت کی سحر کاری اور جلوہ سامانی اسی آدرش سے ماخوذ ہے فیض کی شاعرانہ عظمت و رفعت کو ترقی پسند تحریک اور نظریے سے جدا کر کے دیکھنا فکر و فن کے معیارِ جمال کے ساتھ کھلی ناانصافی ہوگی۔ اُن کی شاعری کی جمالیاتی دنیا میں جو حُسن اور روشنی ہے، وہ ترقی پسند آدرش کے مہرِ نیم روز کی عطا اور دین ہے۔ خود فیض نے اس باب میں اپنی داستانِ حیات اور تخلیقیت کے سفرِ ارتقا کی روداد میں بارہا غیر مبہم انداز میں اس نظریے سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ کمیونسٹ مینی فسٹو کے مطالعے کے حوالے سے ان کا ردِ عمل اور اُن کے مطالعے کے حاصلات کے ضمن میں اُن کا اظہار بڑی اہمیت اور معنویت کا حامل ہے جس کا ذکر کچھ صراحت کے ساتھ آگے آیا ہے۔

ترقی پسندیت اور ترقی پسند تحریک کی کہانی ساجی ارتقا کی کہانی کا اٹوٹ انگ ہے۔ سماجی

زندگی کے آغازِ سفر سے اس کہانی کی ابتدا ہوتی ہے۔ انسان جنگل اور غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں آیا اور ایک عرصۂ دراز تک کلی طور پر اجتماعی سماجی زندگی یعنی ابتدائی اشتراکیت کے عہد میں رہا اور یہ عرصہ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کش مکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کش مکش، آویزش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس کو معرکۂ خیر وشر بھی سمجھنا چاہیے۔ اس معرکۂ خیر وشر سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سماج سفر ارتقا پر گام زن ہے۔ سماجی ارتقا تغیر وترقی اور انقلابات کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا قانونِ فطرت کی عمل داری میں سرخ روئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انسان اور انسانی تمدن وتہذیب کا سفر ہمیشہ سے پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ سماجی زندگی کبھی زوال پذیر نہیں ہوئی۔ شعور وفکر اور ترقی کا سورج کبھی کسی خطۂ ارض پر روشن رہا کبھی کسی اور خطۂ ارض پر۔ ترقی پسند قوتیں ہر دور میں حاوی طاقتیں رہی ہیں۔ انسانی سماجی زندگی کبھی واپسی کے سفر پر گام زن نہیں ہوئی، یعنی سماجی زندگی نے کبھی رجعت پرستی کو قبول نہیں کیا۔ استحصالی طاقتوں اور ظلم وجبر کا دبدبہ وقت کے ساتھ سوالیہ نشان بنتا گیا۔ ادب میں ترقی پسندیت کی تحریک اسی تاریخی سلسلے کی کڑی ہے۔

برصغیر میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کا تنظیمی سفر ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا، مگر اس کے تخلیقی اور نظریاتی سفر کا باضابطہ آغاز افسانوں کی کتاب 'انگارے' کی اشاعت سے ہوا جسے ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیے۔ 'انگارے' کے مصنفین میں پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور صاحب زادہ محمود الظفر شامل تھے۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور ہندوستان کی فضاؤں میں اس کی صدائے بازگشت ایسی گونجی کہ ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب حکومت نے ضبط کر لی، کیونکہ اس افسانوی مجموعے میں صدیوں پرانی اقدار کے خلاف گویا علم بغاوت بلند کیا گیا تھا، چنانچہ معاشرے میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور مذکورہ مصنفین کے خلاف کفر والحاد کے فتوے جاری ہوئے، مگر "انگارے" کے مصنفین نے معذرت خواہانہ رویہ

اختیار کرنے کے بجائے کتاب کی ضبطی کے خلاف ردِعمل کا اظہار کیا اور اپنے دفاع میں ایک بیان اخبار 'لیڈر' الہ آباد میں شائع کیا۔ مذکورہ بیان میں پروفیسر احمد علی نے یہ تجویز دی کہ ایک League of Progressive Authors قائم کی جائے جو ''انگارے'' کے نظریاتی مشن کو آگے بڑھائے ڈاکٹر اختر حُسین رائے پوری کا مقالہ 'ادب اور زندگی' جو اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پہلے ہندی میں اور جولائی ۱۹۳۵ء میں اردو میں شائع ہوا، اُس نے نوجوان ادیبوں کی مذکورہ بغاوت کا ناتہ زندگی سے جوڑ دیا اور یوں بقول ڈاکٹر انور سدید ''وہ اساس دستیاب ہوگئی جس پر بعد میں ترقی پسند تحریک نے اپنا سفر جاری رکھا''۔ ترقی پسند تحریک کو جناب سبطِ حسن نے علی گڑھ تحریک کی توسیع قرار دیا تھا۔ اس کے تخلیقی سفر کے بنیاد گزاروں میں جوش ملیح آبادی، جن کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا، اور ترقی پسند افسانہ نگاری کے بانی منشی پریم چند کے نام شامل ہیں

ترقی پسند تحریک نے کم و بیش آٹھ دہائیوں کا سفر طے کرلیا ہے۔ ماہ و سال پر پھیلے ہوئے اپنے اس طویل اور صبر آزما سفر میں ترقی پسند تحریک علم و دانش اور شعور و آگہی کی نت نئی مشعلیں روشن کرتی ہوئی کٹھن اور دشوار گزار راہوں اور مرحلوں سے گزری اور سرخ روئی حاصل کی۔ یہ تحریک اپنے ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے عالمی ادبیات کی اُن تحریکوں میں شامل ہے جنھوں نے اظہار و اسالیب کے نت نئے جہانوں کی تعمیر و تشکیل کی اور جدید رویوں اور حسیت کو پروان چڑھایا۔ اس تحریک کی ۷۷ سالہ تاریخ دراصل اُن تخلیقی کارناموں کی تاریخ ہے جو ترقی پسند مصنفین نے جملہ اصناف ادب میں سرانجام دیئے اور مآل کار برصغیر ہندو پاک کی تمام زبانوں کے ادب کو بگی بندھی حدوں سے نکال کر زندگی کے ممکنہ گوشوں تک وسیع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ فکری سطح پر فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں پر نئی جہتوں اور امکانات کے در وا کر دیے اور اس طرح نئے طرزِ احساس اور نئی جمالیات کی اقدار مرتب کی ہیں۔ ترقی پسند تحریک ہماری ادبی تاریخ میں ایک نئے اور انقلابی موڑ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب سماجی زندگی کا ترجمان بن گیا، ادیب کو اپنی سماجی ذمہ داریوں کا ادراک ہوا، داخلیت پسندوں کے حصار سے نکل کر اُس نے

اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھا۔ یوں سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعیِ مشکور کا آغاز ہوا اس عمل سے تخلیق ادب انکشاف ذات تک محدود نہ رہا بلکہ ادیب کے لیے ایک سماجی فریضہ بن گیا اور ادب کا سماجی کردار اور منصب متعین ہوا۔

ترقی پسند تحریک میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شریک سفر تھے جن میں قوم پرست اہلِ فکر و دانش بھی شامل تھے اور تحریک آزادی اور جمہوریت کے داعی بھی۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین یقیناً کسی جماعت یعنی کمیونسٹ پارٹی کا ذیلی ادارہ یا اُس کا کلچرل ونگ (Cultural Wing) نہیں تھی بلکہ روشن خیالی اور خرد افروزی پر یقین رکھنے والے اہلِ قلم کا وسیع تر محاذ تھی۔ اس نکتے کی وضاحت سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں بڑی صراحت کے ساتھ کی ہے، اس کے باوجود یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء سے بالیدگی حاصل کی تھی جس انقلاب کا خیر مقدم علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہا تھا:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا　　آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

------

ترقی پسند تحریک کا آدرش اسی انقلابِ اکتوبر سے عبارت ہے۔ دنیا کو تبدیل کرنے کا مارکسی فلسفہ اُس وقت تک ہمارے لیے معنویت کا حامل رہے گا جب تک انسانوں کے ہاتھوں انسان کا استحصال ہوتا رہے گا اور جبر و جور اور عدم مساوات کی عمل داری قائم رہے گی۔ دنیا کو جبر و جور عدم مساوات اور استحصال سے پاک دیکھنے کا خواب ہمارے آدرش اور ہماری تخلیقیت کا سرچشمہ رہے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خواب کلیتہً کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا اور انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال کسی نہ کسی روپ میں جاری رہے گا، مگر ہم اپنے اس خواب کو اپنی حسیت، طرزِ احساس اور تخلیقیت کے جذبے سے جدا نہیں کر سکتے۔ ترقی پسند تحریک اس خواب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

فیض احمد فیض کی آغازِ سفر سے ترقی پسند تحریک سے وابستگی اُن کی شاعرانہ عظمت کا سر

چشمہ رہی ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ فیض احمد فیض روزِ اول سے ان کے اس مشن میں ہم قدم رہے تھے اور لاہور میں تمام تر رابطے ان کے ساتھ قائم ہوئے تھے۔ اُن میں علامہ اقبال سے ملاقات اور ترقی پسند تحریک کے لیے ان کی نیک تمنائیں اور اشیرباد کا حصول شامل تھا۔ بالفاظِ دیگر فیض احمد فیضؔ اس تحریک کے بانیوں میں سے ہیں اور میں فیض احمد فیض اور ترقی پسند تحریک کو ایک دوسرے کا جزوِ لاینفک سمجھتا ہوں۔ سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں فیض احمد فیض سے اپنی پہلی ملاقات اور لاہور میں قائم ہونے والے رابطوں اور حالات کا بڑے دلچسپ انداز میں اظہار کیا ہے جس میں صاحب زادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیات کے کچھ گوشے بھی قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے سامانِ انبساط فراہم کریں گے واضح رہے کہ صاحب زادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں بھی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔:

''لیکن قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں ہمیں غیر متوقع بلکہ غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے یک بارگی کہا؛ محمود ! وہ تمھارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نا، انگلش ڈیپارٹمنٹ میں، کیا نام ہے اُس کا؛ اور پھر میری طرف مڑ کر' میرے خیال میں تم اس سے مل لو'۔

محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں بولے، تمھارا مطلب ہے ہمارے انگریزی کے نئے لکچرار فیض احمد'۔

'اُنہہ!۔۔۔ ہوگا بھئی! کوئی بھی۔ نام مجھے یاد نہیں رہتا۔ وہ بولتا تو ہے ہی نہیں۔ تمھارے کالج میں وہی ایک لڑکا مجھے سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ بنے کو اُس سے ملنا چاہیے'۔

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور کالج کے وائس پرنسپل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور ذرا تیزی سے بولے تمھیں کیا معلوم میرے کالج میں کون سمجھ دار ہے اور کون نہیں! تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی ہو اُن کے نام تک تو تمھیں یاد

نہیں۔ اب کیا تھا۔ رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ میں آگئیں اور چمک کر بولیں، سب اُلّو بھرے ہیں تمھارے کالج میں! جنھیں الف کے نام ب تک نہیں آتا۔ پتا نہیں کس دُنیا میں رہتے ہیں! میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں، لڑکوں کی نہیں۔۔۔ نام جاننے کی کیا ضرورت ہے! صورت سے ہی پتا چل جاتا ہے'۔ اس پر بے ساختہ ہم سب کو ہنسی آگئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا، اچھا بھئی ! میں طے کروں کہ ان سمجھ دار فیض احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی۔

محمود نے جواب دیا میں نے تمھارے آنے سے پہلے ہی فیض سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمھارا بھی اُن سے ذکر کر دیا ہے۔' پھر اپنی ڈائری دیکھ کر کہا آج ساڑھے چار بجے چائے پر فیض آرہے ہیں'۔۔۔ بارے جب تیسرے پہر 'فیض احمد صاحب' سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا، یعنی فیض نہیں بولے۔ کسی نئے آدمی سے گفتگو کرنے اور اُسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے بھی نہیں آتا۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس میدان میں مجھ سے بھی بڑے اناڑی پائے جاتے ہیں۔

فیض کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اُس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ فیض شاعری بھی کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں تو بس وہ ادب خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ذہین نوجوان تھے جن میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحانات پائے جاتے تھے۔۔۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اُس وقت تک جو کیا تھا، سب بتایا اور اُن سے پوچھا کہ پنجاب میں اس کے کیا امکانات ہیں۔ فیض نے اپنے بشرے سے کسی خاص گرم جوشی یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے ہم سے اتنا کہا، لاہور چل کے دیکھتے ہیں میرے خیال میں وہاں کچھ لوگ تو شاید ہم سے متفق ہوں گے'۔ معلوم ہوتا تھا کہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ سنیں گے، مسکرائیں گے مگر بولیں گے نہیں۔ آخر کو رشیدہ چلا کر بول پڑیں، یہ

بھی خوب کہی، کچھ لوگ شاید متفق ہوں گے۔ جناب! ہمیں اس مینی فسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانی ہے۔

محمود اور میں رشیدہ کی اس حرکت پر گھبرا گئے۔ ابھی ہماری فیض سے بے تکلفی نہیں تھی اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی اور رشیدہ تھیں کہ اس ہمارے شرمیلے مہمان کی نقلیں کرنے لگیں اور اس پر فقرے چست کررہی تھیں لیکن انھیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی!

پھر بھی فیض ٹس سے مس نہیں ہوئے، البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مسکرائے اور بولے، لاہور چل کر کوشش کرتے ہیں، دیکھیں! کیا ہوتا ہے۔

ہم اپنے پروگرام کے مطابق دوسرے دن لاہور چل پڑے اور چراغ جلے وہاں پہنچ گئے۔ فیض اپنے گھر چلے گئے اور ہم تینوں سیدھے کنال بینک پر میاں افتخار الدین صاحب کی کوٹھی پر گئے۔ وہاں میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارٹی پر گئے ہیں اور کہہ گئے کہ ابھی آتے ہیں۔۔۔ دو تین دن کی دوا دوش کے بعد، جس میں اب میاں افتخار الدین بھی ہمارے ساتھ پورے جوش و خروش سے شریک ہوئے تھے، انھوں نے اُن پندرہ بیس آدمیوں کو جنھیں ہم سمجھتے تھے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں دلچسپی لیں گے، ایک ساتھ مل کر گفتگو اور مشورے کے لیے مدعو کیا۔ یہ اجتماع افتخار کے ہی گھر پر ہوا۔ اب یہ تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔ فیض نے تجویز کیا کہ صوفی تبسم کو اس وقت عارضی طور پر انجمن کا سکریٹری چن لیا جائے، جب انجمن کے ممبر بن جائیں گے تو اُس کے بعد باقاعدہ عہدے داروں کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صوفی صاحب نے پہلے انکار کیا لیکن بعد میں اصرار کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس چھوٹے سے جلسے کے ختم ہوتے ہوئے سورج ڈوب چکا تھا۔ سردی یک بارگی بڑھ گئی۔ لوگ جلدی جلدی رخصت ہونے لگے۔

ہم خوش اور مطمئن تھے۔ رشیدہ، فیض کو چھیڑ رہی تھیں۔ اب وہ حضرت بھی کسی قدر جھکے اور

بولنے چالنے پر رضامند سے معلوم ہورہے تھے، لیکن ہم میں سے کسی کے بھی یہ وہم وگمان نہیں تھا
کہ لاہور کی ادب پرور سرزمین پر یہ وہ پہلا لغزیدہ قدم ہے جو بعد کو اردو ادب کے کھلیان میں
سنہرے خوشوں کا اتنا بڑا انبار لگا دے گا۔ چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر، فیض،
بیدی، ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر، فکر، عارف، رہبر، اشک وغیرہ جیسے شاعروں
اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علم کو اتنا اونچا کیا کہ اُس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے
دوسرے حصے کے ادیبوں کے لیے قابلِ رشک بن گئیں۔"

معروف روسی دانش ور ڈاکٹر لدمیلا وسیلیو انے "پرورش لوح وقلم۔ فیض: حیات اور
تخلیقات" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے جسے پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی
پریس نے شائع کیا ہے۔ اس کے چوتھے اور پانچویں باب میں فیض کے ترقی پسند نظریے اور
تحریک سے وابستگی کے حوالے سے اُنھوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ 'آغازِ سفر' کے عنوان سے
ابتدائی سطور میں اُنھوں نے لکھا:

"ایم۔اے۔او۔کالج امرتسر میں فیض ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک تقریباً پانچ سال بحیثیت
لیکچرر برسرکار رہے۔ اس دوران اُن کی عادات و میلانِ طبع میں ناقابلِ شناخت حد تک
تبدیلیاں آئیں۔ اور بات صرف یہی نہیں تھی کہ ہمارا یہ نوجوان اب سنِ رشد کو پہنچ چکا تھا، اس
شہر میں دراصل ایک نئے فیض نے جنم لیا جو دنیا کو دوسرے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا تھا"

آگے چل کر محترم ڈاکٹر لدمیلا وسیلیو انے فیض کے بارے میں کتاب 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی'
کے مصنف ایوب مرزا کا بیان نقل کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

"پہلی محبت میں دونوں جہاں ہارنے کے بعد فیض امرتسر ایم۔اے۔او۔کالج پہنچے۔ اُن
کی عجیب کیفیت تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں کی نگاہِ دوررس نے اِس تنہا لیکچرار کو بھانپ لیا۔
پوچھا، 'معاملہ کیا ہے؟ کسی کام میں تیرا جی نہیں لگتا'، جب فیض نے جواب میں تکلف کیا تو
بلاتکلف بولیں، 'محبت میں ناکامی؟'، اور فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے

مشورہ دیا، یہ حادثہ تمھاری ذات واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر اتنا بڑا بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔ اُنھوں نے فیض کو ایک کتاب مطالعے کے لیے دی اور پھر ملنے کے لیے کہا۔۔۔ اُنھوں نے اُس کتاب کو پڑھا اور اُن پر چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ یہ کتاب (کارل مارکس کی) کمیونسٹ مینی فسٹو تھی'۔ [۵۰، ص: ۲۳۱]

بقول محترمہ ایوب مرزا، ادبی روایت کی تفصیلات ایک حد تک اُس سے مختلف ہیں جو کچھ فیض نے اپنی یادوں کے مجموعے 'مہ و سال آشنائی' میں لکھا ہے اور یہاں اس واقعے کا آہنگ بھی دوسرا ہے گو کہ ماہیت وہی برقرار رہتی ہے۔ متعلقہ حصہ بزبانِ فیض درجِ ذیل ہے:

"۱۹۳۵ء میں جب میں نے امرتسر کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں اُنھیں مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیقِ کار صاحب زادہ محمود الظفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا، لو! یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو، لیکن غیر قانونی کتاب ہے، اس لیے ذرا احتیاط سے رکھنا'۔ یہ کتاب تھی کیمونسٹ مینی فسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی بلکہ دو تین بار پھر پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، طبقے اور ذرائعِ پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقا، انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہ بہ تہ رشتے ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں اور یوں لینن کے اکتوبر انقلاب اور اُس کی انقلابی سرزمین سے واقفیت کی شدت سے طلب ہوئی"۔ [۱۶، ص ۹۱، ۱۰، ۱۱]

مذکورہ اقتباسات سے فیض کی ترقی پسند تحریک اور نظریے جن کی اساس مارکسی فلسفے پر استوار تھی، سے وابستگی واضح ہوتی ہے۔ ترقی پسندی فیض کی شاعری اور فکر و فن میں رچی بسی ہے،

بلکہ یہ کہنا میرے نزدیک زیادہ صائب رائے ٹھہرے گی کہ فیض ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند نظریے کی سب سے بڑی پہچان، سب سے بڑی علامت، اور سب سے معتبر ترجمان تھے۔ اس تناظر میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین سے وابستگی اور ناوابستگی کی کہانی کتنی بے معنی ہے، اس پر گفتگو کیا معنی رکھتی ہے، اس باب میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے جو اظہار کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''حال میں شائع ہونیوالی کتابوں میں اکثر یہ ذکر ملتا ہے کہ فیض تحریک سے، بہت جلد علاحدہ ہوگئے اور یہ کہ اُس میں اُن کی راست شرکت محض چند سال تک محدود رہی، لیکن یہ روایت کم از کم اس لیے صحیح نہیں ہے کہ پاکستان کی تشکیل کے بعد (یعنی انجمنِ ترقی پسند مصنفین ہندوستان کے قیام کے دس سال بعد بھی) فیض انجمن کی، جو اُن کے علاقے میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین پاکستان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی، تنظیم نو کے کام میں شریک تھے، نیز 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' کے صفحات پر اپنے مضامین کے ذریعے ملاؤں کے شدید حملوں کے خلاف سرگرمی سے انجمن کا دفاع کرتے رہے تھے۔ تحریک کی قیادت سے اُنھوں نے کلیتہً کنارہ کشی اِس واقعے کے بعد کی جس کی تفصیل خود فیض کے الفاظ میں درجِ ذیل ہے:
'ایک روز مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی صفدر میر صاحب صدر تھے۔ قاسمی صاحب نے اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشا ہے، آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اُس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف 'پاکستان ٹائمز' چلاتے رہے''۔

[۵۰، ص: ۱۳۸، ۱۳۹]

فیض کی نظر میں اہمیت ہمیشہ کام کو حاصل تھی، نام کو نہیں۔ وہ ہمیشہ ''تحریک'' اور تنظیم کے فرق کو ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ خود کو اول الذکر کا جزو گردانتے تھے جب کہ موخرالذکر کے تعلق سے اُن

کا رویہ جدلیاتی اور منطقی ہوا کرتا تھا۔ اس حوالے سے فیض کے یہ جملے بڑی معنویت کے حامل ہیں:

''تنظیمیں تو ختم ہوتی اور بنتی رہتی ہیں، لیکن تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔ ترقی پسندی ہم نے تو پیدا نہیں کی تھی، وہ تو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ حالات کے تقاضے نے ایک تنظیم کو جنم دیا اور پھر حالات ہی کی بنا پر تنظیم ختم بھی ہوگئی، لیکن تحریک کہاں ختم ہوتی ہے۔''

پاکستان کے مخصوص حالات کے تناظر میں ترقی پسند تحریک کی تنظیمی صورتِ حال جو پیدا ہوئی یعنی ۱۹۵۴ء میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا غیر قانونی اور کالعدم قرار دیا جانا، مگر ہندوستان میں اس کی تنظیمی تاریخ کسی سقوط و جمود کا شکار نہیں ہوئی۔ پاکستان میں بھی انجمن کی تنظیمی تاریخ میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں 'عوامی ادبی انجمن' کے نام سے احیا تاریخی حقیقت ہے۔ عوامی ادبی انجمن کے قیام کے سلسلے میں اس کا پہلا خفیہ اجلاس جو باکرانی روڈ لاڑکانہ کے ایک قریبی فارم ہاؤس میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت جناب فیض نے کی تھی اور جس کے شرکا میں اجمل خٹک، حبیب جالبؔ شمشیر الحیدری، حسن حمیدی اور دیگر نامور قلم کاروں کے نام اس وقت یاد آئے ہیں جو شامل تھے اُس اجلاس کا محرک اور کنوینر راقم (مسلم شمیم) تھا۔ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مذکورہ اجلاس کے شرکا لاڑکانہ کے ایک مقامی کالج میں کُل پاکستان بین اللسانی مشاعرہ میں شرکت کے لیے لاڑکانہ آئے تھے۔ مذکورہ کالج میں راقم لیکچرار اور غیر نصابی سرگرمیوں کا ناظم اعلیٰ تھا۔ عوامی ادبی انجمن کا منشور جناب سبطِ حسن نے تحریر کیا تھا اور پاکستان کی پانچ قومی زبانوں یعنی بنگالی، سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی میں ترجمے کے ساتھ ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا جس پر دستخط کرنے والوں میں فیض احمد فیضؔ، شیخ ایازؔ، میر گل خاں نصیرؔ، اجمل خٹکؔ، حسن حمیدیؔ، مسلم شمیم، ڈاکٹر رکن الدین حسانؔ اور دیگر اہلِ قلم شامل تھے۔ یہاں یہ بات بے محل نہیں کہ اس منشور پر دستخط کرنیوالوں میں حضرتِ جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے جنھوں نے کچھ اردو زبان کے پُر جوش حامیوں کے ورغلانے پر اپنے دستخط سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا تھا یعنی Withdraw کر لیا تھا۔ جوشؔ صاحب کو یہ بات بتائی گئی تھی کہ مذکورہ منشور میں اردو کو قومی زبان کے بجائے پاکستان

میں رابطے کی زبان کا درجہ دیا گیا تھا گویا زبانِ اردو کے ساتھ تعصب برتا گیا تھا اور ناانصافی کی گی تھی۔ بہرحال فیض احمد فیض کی عوامی ادبی انجمن کے قیام کے سلسلے میں اُس کے آغاز سفر سے عملی دلچسپی اور سرگرمی تاریخ کا حصہ ہے، لہٰذا ترقی پسند تحریک کی تنظیم سے اُن کی عدمِ دلچسپی، بے گانگی یا علاحدگی کی بات کتنی بے وزن ہے، اس پر تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس حوالے سے یہ بات معنویت کی حامل ہے کہ ترقی پسند تحریک آغازِ سفر سے بین الاقوامی ترقی پسند تحریک کی پیداوار اور حصہ رہی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں منعقد ہونیوالی کانفرنس جو فسطائیت کے خلاف ثقافت کے دفاع میں منعقد کی گئی تھی، اُس میں دنیا کے بڑے ادیبوں نے شرکت کی تھی جس کے شرکا میں سجاد ظہیر ملک راج آنند سمیت انجمن کے کئی اور بانی شامل تھے۔ بین الاقوامی ترقی پسند تحریک دنیا کے مختلف برِاعظموں میں مختلف ناموں سے سرگرم عمل رہی۔ ایفروایشیائی ادیبوں کی انجمن بھی اُس کا ایک حصہ ہے جس سے فیض احمد فیض کی تاحیات وابستگی رہی اور اُس کے ترجمان جریدے 'Lotus' کے وہ مدیر رہے۔ معروف و ممتاز مصنفہ اور دانش ور محترمہ زاہدہ حنا نے اپنی کتاب 'امید سحر کی بات سنو' جو ماضی قریب میں مارچ ۲۰۱۱ء میں فیض صدی کے حوالے سے شائع کی ہے، اُس میں ایفروایشیائی ادیبوں کی تنظیم کی بابت لکھا ہے:

''فیض صاحب خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو متحرک تھا اور کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ فیض صاحب کی انسان دوستی انصاف پسندی اور امن پروری اُنھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ ماسکو جانے والے تھے اور وہاں جانے سے پہلے ایفروایشیائی ادیبوں کی تنظیم کا مسئلہ نمٹا دینا چاہتے تھے۔ لاہور سے وہ تمام جید ادیبوں سے باتیں کر کے آئے تھے۔ کراچی میں اُن کے عاشق، اُن کے محب مرزا ظفر الحسن کے گھر پر سبطِ حسن، ہاجرہ مسرور شوکت صدیقی، حسن عابدی، جون ایلیا اور دوسرے ترقی پسند ادیب جمع ہوئے تنظیمی ڈھانچے پر باتیں ہوئیں۔ فیض صاحب، سبطے بھائی سے اصرار کر رہے تھے کہ کراچی میں انجمن کے قیام کی ذمہ داری وہ سنبھالیں اور سبطے بھائی یہ ذمہ داری

شوکت صدیقی کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ شاعروں کی تنظیمی صلاحیت کی میں کوئی خاص قائل نہیں ہوں، لیکن اُس شام مجھے اندازہ ہوا کہ فیض صاحب ان معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں، اور کیوں نہ رکھتے! ایک عرصے تک وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے وابستہ رہے تھے''۔

مندرجۂ بالا اقتباس میرے اس دعوے کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے کہ فیض احمد فیض اپنی زندگی کے آخری ایام تک ترقی پسند تحریک و تنظیم کے روح ورواں اور نفسِ ناطقہ بنے رہے۔ 'ادب کا ترقی پسند نظریہ' کے زیرِ عنوان جناب فیض نے اپنی کتاب میزان میں ترقی پسند ادب کے حوالے سے چند سادے فقروں میں تحریر کیا ہے:

''ظاہری طور پر ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو سماجی ترقی میں مدد دیں، ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔ ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے کلچر ترقی کرے اور رجعت پسند وہ تحریریں جو اِن رجحانات کی مخالفت کریں اور جن کی وجہ سے کلچر کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں''۔

جناب فیض کی شاعرانہ عظمت اور نظریاتی جہتوں کے حوالے سے یہ رائے زنی کی جانی چاہیے کہ فیض نے اپنے عصر کی اتنی موثر ترجمانی کی ہے کہ اُن کی ذات اُن کی زندگی میں ایک تحریک، ادارہ اور ایک روایت کا مرتبہ اختیار کر گئی۔ بیسویں صدی میں اقبال اور جوش کے بعد شاید ہی کسی شاعر نے اپنے معاصرین اور قارئین کو اس شدت اور اس گہرائی سے متاثر کیا ہو۔ فیض انسانی معاشرے میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ایک مثبت یعنی اشتراکی انقلاب کے داعی تھے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہو سکے جس کی بنیاد سماجی عدل و انصاف، مساوات اور شرفِ بشر پر استوار ہو۔ اس انقلابی امنگ کے باوجود اُن کے ہاں انقلابی گھن گرج کے بجائے ایک مترنم سرگوشی کا انداز ہے۔ اس انداز بیاں کو اُنھوں نے زندگی کو سب کے لیے بامعنی، بھرپور اور خوب صورت بنانے کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ اُن کی شاعری پھول کی پتیوں پر شبنم اترنے کی مثال ہے مگر اس کے باوجود اُس کی کاٹ آہنی ہے، کیونکہ فیض کی سرگوشی قاری اور سامع کے اندر ایک

ہلچل اور انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ انقلاب کے حوالے سے جو شور بلند ہونا چاہیے، وہ فیض کی شاعری میں نہیں بلکہ اُس کے اثرات میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ فیض کی نغماتی سرگوشی کو اپنے اندر اتارے جانے والے باطن میں قیامت برپا ہوتی ہے، اس کو فیض کے مثبت عینی اشتراکی انقلاب کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ فیض نے پاکستان اور تیسری دنیا بلکہ پوری دنیا کو فن اور جائیت اور انسان کے روشن مستقبل اعتماد کی صورت میں بڑی ثروت مندی عطا کی ہے۔ اس تناظر میں اُن کی نظم 'وَیَبقٰی وَجْہُ رَبِّکَ' پڑھی جانی چاہیے:

'وَیَبقٰی وَجْہُ رَبِّکَ'

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے، حاضر بھی
جو منظر بھی ہے، ناظر بھی
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

جناب فیض سے میرے رابطے اور میری قربتیں ترقی پسند نظریے اور تحریک سے میری وابستگی جو ۱۹۶۰ء سے شروع ہوئی تھی، کی دین تھیں۔ لاڑکانہ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء کے دوران مجھے جناب فیض کی میزبانی کا شرف تین بار حاصل ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں کامریڈ لینن کی صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں منعقدہ اجلاس کی صدارت اُنھوں نے فرمائی جو لاڑکانہ پریس کلب کے وسیع و عریض لان میں منعقد ہوا تھا، جس کا محرک اور میزبان راقم (مسلم شمیم) تھا۔ کامریڈ لینن کے دیس سوویت یونین سے اُن کی غیر معمولی وابستگی کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے جس دیس نے اُنھیں

نوبل امن انعام کے ہم منصب لینن امن انعام سے نوازا تھا، جو فیض کی نظر میں بڑی قدر و قیمت کا حامل تھا۔ مجھ جیسے ہزاروں پرستارانِ فیض کو اُن کی توجہ، شفقت اور سرپرستی مذکورہ نظریاتی رشتوں کی دین اور عطا کہنا چاہیے۔

فیض احمد فیضؔ ترقی پسند فکر اور ترقی پسند ادبی جمالیات کے سب سے بڑے ترجمان اور ترقی پسند نظریات و روایات کے آغاز سفر سے تادمِ حیات معتبر ترین حوالہ رہے۔ انسان دوستی وطن دوستی اور امن دوستی اُن کے شاعرانہ ورثے کے عناصر ثلاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ فیض احمد فیض ترقی پسند شاعری کی بہترین روایات کے سب سے اعلیٰ منصب پر فائز تخلیق کار ہیں استحصال زدہ اور مظلوم طبقات کی آواز اُن کی شاعری میں روح درواں کا درجہ رکھتی ہے اور ویسے بھی اُن کی شاعری روحِ عصر کی بہترین ترجمان اور ضمیر وقت کی موثر ترین آواز تھی۔ یہ بات بھی غیر مبہم الفاظ میں کہی جانا چاہیے کہ انقلابِ اکتوبر کا آدرش یعنی اشتراکیت کا نظریہ فیض کا آدرش اور اشتراکی انقلاب فیض کا خواب ہے جس کی تعبیر کے لیے سرگرداں و سرگرمِ عمل تحریک یعنی ترقی پسند تحریک جس کا دائرہ اثر عہد بعہد وسیع تر ہوتا رہا ہے، فیض کا ورثہ ہے۔ اس ورثے اور آدرش کو اُن کے ہاں محبوب کا درجہ حاصل تھا۔ اس تناظر میں اُن کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں:

ناصحو ! پندگرو ! راہ گزر تو دیکھو — ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے

اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو — وہ تو وہ ہیں، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے

------

اب جناب فیضؔ ہمارے درمیان نہیں رہے اور وہ بھی امیر خسروؔ، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ ، اقبالؔ اور جوشؔ کی طرح ہماری تاریخ حصہ بن گئے ہیں، وہ تاریخ مردہ نہیں ہوا کرتی بلکہ ذہنی زندگی کی امین ہوتی ہے جس میں ہمارا جیتا جاگتا ماضی (Living Past) متشکل ہوتا ہے اور جس میں ہماری زندگی کا ایک Living Impulse قوتِ متحرکہ کی طرح زندگی کے سفر پیش رفت میں مشعلِ راہ بنا رہتا ہے اور حافظِ شیراز کے بقول:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما — ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

## حوالہ جات


۱ ''روشنائی'': سجاد ظہیر

۲ ''ترقی پسند ادب'' : علی سردار جعفری

۳ ماہ نامہ افکار، فیض نمبر

۴ ''امیدِ سحر کی بات سنو'' : زاہدہ حنا

۵ پرورشِ لوح و قلم فیض: حیات اور خدمات'': ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا

۶ اردو ادب کی تحریکیں'': ڈاکٹر انور سدید

۷ ''مہ و سالِ آشنائی'': فیض احمد فیض

۸ ''منزلیں گرد کے مانند'' خلیق ابراہیم خلیق

۹ ''فیض احمد فیض۔ شخصیت و فن'' اشفاق حسین

۱۰ ''فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ'' : خلیق انجم

۱۱ ''فیض فہمی'': ڈاکٹر سید تقی عابدی

۱۲ ''ذکرِ فیض'': سید مظہر جمیل

## سرور عالم راز سرور (امریکہ)

# اردو زبان کے تابعات

اردو میں ایک کثیر تعداد ایسے الفاظ کی استعمال ہوتی ہے جن کو تابعات کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر کام وام، انگڑ گھنگڑ، دم دُرود، اتھل پتھل، چال ڈھال وغیرہ۔ یہ تابعات وہ مرکب الفاظ ہیں جو دو مختلف الفاظ کے اشتراک سے بنائے جاتے ہیں اور اپنی اس مرکب صورت میں واضح اور معروف معانی مرتب کرتے ہیں۔ یہ معانی تابعات کے تشکیلی الفاظ سے مناسبت رکھ سکتے ہیں اور ان سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ تابعات کی بہت سی شکلیں ممکن ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ البتہ یہاں اتنا کہنا ضروری ہے کہ ان تابعات کی بنیادی شکل و ترکیب میں ایک لفظ عموماً اصل یا مالک کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا لفظ پہلے لفظ کی بگڑی ہوئی یا قدرے بدلی ہوئی شکل میں یا مطلق ایک نئی اکائی کی حیثیت سے اُس کا (یعنی پہلے لفظ کا) تابع ہوتا ہے۔ گویا وہ مذکورہ مرکب لفظ کے معنی کی وضاحت کے لیے اصل لفظ کا محتاج ہوتا ہے اور مجرد صورت میں معنی آفرینی سے قاصر ہو سکتا ہے۔ اسی تابع لفظ کی بنا پر ہی ایسے زیرِ بحث مرکب الفاظ کو تابعات کہا جاتا ہے۔ تابع الفاظ بے معنی بھی ہو سکتے ہیں اور بامعنی بھی۔ اسی طرح اصل الفاظ یوں تو تقریباً ہمیشہ ہی بامعنی اور معروف ہوتے ہیں لیکن ایسے تابعات کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اصل لفظ بھی بے معنی ہوتا ہے لیکن وہ بایں ہمہ اپنے تابع کے ساتھ مل کر ایک واضح اور منفرد مطلب پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہی عجب و نُدرت تابعات کا حسن ہے اور اُردو زبان کی نیرنگی کا ایک دلکش حصہ ہے۔

تابعات بنانے کا جو بنیادی طریقہ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس کے علاوہ دوسرے طریقے بھی مستعمل ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور ان سے بنائے گئے تابعات اس قدر منفرد اور متنوع ہیں کہ تمام طریقوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں دیئے گئے تابعات کی

اقسام اور ان کی تفصیلات سے ان کا طریقۂ ترکیب بھی واضح ہو جائے گا۔ البتہ بیشتر تابعات مندرجہ بالا بنیادی طریقہ سے ہی متشکل ہوتے ہیں۔ اردو کا خمیر فارسی، عربی اور (کسی حد تک) ترکی کے علاوہ مقامی زبانوں اور بولیوں سے تیار ہوا ہے۔ عربی، ترکی اور فارسی میں تابعات کی روایت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اُردو میں مستعمل عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کے تابعات ناپید ہیں۔ گویا تمام تابعات مقامی زبانوں سے ہی اخذ کیے گئے ہیں۔ اُردو میں مستعمل تابعات کا ذکر اگلی سطور میں آئے گا۔ تابعات کی ندرت اور ان کی ترکیب میں انفرادیت اور تنوع کی وجہ سے انہیں صرف موٹی موٹی اقسام میں ہی بانٹا جا سکتا ہے اور اسی حوالہ سے ان پر گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ تابعات کی واضح حد بندی اور انہیں مختلف اور مستقل خانوں میں تقسیم کرنے کی کوشش غیر ضروری اور تحصیل لاحاصل کے مترادف ہے۔

مثال کے طور پر کام کے ساتھ وام ملا کر کام وام (یعنی کوئی کام) بنا لیا جاتا ہے جب کہ وام بجائے خود ایک بے معنی اور مہمل لفظ ہے۔ اسی طرح اناپ کے ساتھ شناپ ملا کر اناپ شناپ (فضولیات، بے سر پیر کی بات) بنا لیتے ہیں جب کہ اناپ اور شناپ دونوں الفاظ ہی مہمل اور بے معنی ہیں۔ اسی طرح چھیڑ چھاڑ، چھین جھپٹ، میلا ٹھیلا وغیرہ سیکڑوں تابعات عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں معنی آفرینی، زبان کے چٹخارے اور ندرتِ بیان کا باعث ہیں۔ ان مثالوں میں سے کام وام ہی ایسی مثال ہے جس سے اصل لفظ کام کے ساتھ اس کی بگڑی ہوئی شکل وام کو ملایا گیا ہے دوسرے تابعات کسی بندھے ٹکے اصول کے پابند نہیں ہیں۔ آگے چل کے ایسی بہت سی اور مثالوں سے سابقہ پڑے گا۔

اردو میں معدودے چند حروف تہجی کے علاوہ باقی سب حروف سے تابعات بنائے جاتے ہیں۔ حرف ڑ سے اُردو میں کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا ہے، لہٰذا اس سے تابعات نہیں بنائے جا سکتے ہیں۔ حرف ژ[1] کی بھی یہی صورت ہے کہ اس سے بھی کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔ حرف و سے بھی

---

[1] ''ژ'' فارسی زبان کا حرف ہے۔ ''ژولیدن'' مصدر جس کے مشتقات کا آغاز بھی حرف 'ژ' ہی سے ہوتا ہے۔ دیگر متعدد الفاظ بھی ''ژ'' سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً ژالہ۔ ژرف وغیرہ (ادارہ)

تابعات نہیں بنائے جاتے ہیں۔ و سے الفاظ تو موجود ہیں (وردی، وادی، وہم وغیرہ) لیکن ان سے تابعات بنانے کے کسی قاعدہ کا اطلاق ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے تابعات بنانے کا عام طریقہ یہ ہے کہ اصل لفظ کے پہلے حرف کو و سے بدل دیتے ہیں (مثلاً کام وام، گھر وَر) ظاہر ہے کہ یہ طریقہ و سے شروع ہونیوالے الفاظ کے لیے مطلق غیر موثر ہے۔ اسی طرح اور دوسرے طریقے بھی (جن کی مثالیں آگے آئیں گی) و کے لیے بے سود ہیں۔ حرف ث سے چند الفاظ شروع ہوتے ہیں (مثلاً ثمر، ثواب، ثقل) لیکن ان سے بنائے گئے تابعات (ثمر ومر، ثواب وَداب) عام طور سے مستعمل نہیں ہیں گو ان کے استعمال میں ہرج بھی نہیں ہے۔ ان حروف کے علاوہ چند اور حروف تہجی ایسے ہیں جن سے شروع ہونے والے الفاظ کے و کے ساتھ بنائے گئے تابعات ممکن تو ہیں لیکن عام نہیں ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ان حروف کے کسی اور قاعدہ سے بنائے گئے تابعات بھی نظر نہیں آتے ہیں۔ (الا ماشاءاللہ) چند مثالیں دیکھئے:

۱ : ضامن وامن، ضد وِد

۲ : قاعدہ واعِدہ، عرضی وَرضی،

۳ : یادواد، یاروار، فکر وِکر

۴ : ذات وات، ذات پات

۵ : طور طریقہ

ان تابعات میں سے ایک آدھ کے علاوہ دوسرے زیادہ رائج نہیں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ حروف عربی اور فارسی کے ہیں اور ان دونوں میں تابعات کی روایت ناپید ومعدوم ہے۔ چنانچہ اُردو میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کے تابعات ناپید ہیں۔

تابعات بنانے کا کوئی سکہ بند ٹکسالی طریقہ نہیں ہے۔ صرف و والا طریقہ ہی ایسا ایک طریقہ ہے جو بہت وسیع پیمانہ پر مستعمل ہے، عام فہم ہے اور آسان بھی ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا اطلاق اردو کے تقریباً ہر مصدر پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً آنا وانا، کھانا وانا، رنگنا ونگنا وغیرہ۔ اسی طرح تقریباً تمام اسمائے نکرہ (Common Nouns) کے بھی تابعات اسی طریقہ

سے بنائے جا سکتے ہیں (پھل وَل، سڑک وَڑک، قلم وَلم، کُرسی وُرسی)۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے تابعات بنانے کے اور طریقے کسی بندھے ٹکے اصول کے پابند نہیں ہیں۔ دراصل تابعات ہماری سماجی روایات اور عوامی بول چال کی دین ہیں۔ یہ روایات اس درجہ متنوع ہیں کہ ان کو کسی صورت سے منضبط نہیں کیا جا سکتا۔

تابعات بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اصل لفظ کا پہلا حرف کسی اور حرف یا حروف سے بدل دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تانا بانا، تڑاق پڑاق، تتر بتر، ٹیڑھا میڑھا، حال چال وغیرہ میں یہ عمل واضح ہے اور ہم یہ الفاظ اور ایسے ہی دوسرے الفاظ روزمرہ کی بول چال میں بے تکان استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اصل لفظ کا پہلا حرف کسی مرکب حرف (دھ، بھ، پھ وغیرہ) سے بھی بدل کر تابعات بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً پکڑ دھکڑ میں پکڑ کی پ کو دھ سے بدل دیا گیا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ، چال ڈھال، سج دھج بھی اسی قبیل کے تابعات کی مثالیں ہیں۔

## تابعات: کی اقسام

اپنی ترکیب کے اعتبار سے تابعات کئی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ چونکہ تابعات کی تشکیل دو الفاظ کے اشتراک کی مرہونِ منت ہے لہٰذا ان کی اقسام انہیں الفاظ کی بنیاد پر مرتب کی جا سکتی ہیں۔ تابعات کے یہ ترکیبی الفاظ بامعنی بھی ہو سکتے ہیں اور مہمل بھی۔ اسی طرح یہ الفاظ ہم قافیہ (یا مقفیٰ) بھی ہو سکتے ہیں اور بے قافیہ (غیر مقفیٰ) بھی۔ اس توضیح کی روشنی میں نیچے دیا ہوا نقشہ مرتب کیا جا سکتا ہے اور اسی لحاظ سے تابعات کی اقسام اور نام بھی تجویز کئے جا سکتے ہیں۔

| نمبر | پہلا لفظ | دوسرا لفظ | مقفیٰ یا غیر مقفیٰ | تابعات کا نام | مثالیں |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | بامعنی | بامعنی | مقفیٰ | تابعاتِ محض (مقفیٰ) | گانا بجانا، مول تول، توڑ مروڑ |
| ۲ | مہمل | مہمل | مقفیٰ | تابعاتِ مہمل محض (مقفیٰ) | اول فول، اُول جلول |
| ۳ | بامعنی | مہمل | مقفیٰ | تابعاتِ مہمل مؤخر (مقفیٰ) | ٹیڑھا میڑھا، گندا سندا |

| ۴ | مہمل | بامعنی | مقفیٰ | تابعات مہمل مقدم (مقفیٰ) | اینچ پینچ، آر پار، آس پاس |
|---|---|---|---|---|---|
| ۵ | بامعنی | بامعنی | غیر مقفیٰ | تابعات وضعی | ڈانٹ پھٹکار[1]، دم دِلاسہ |
| ۶ | مہمل | مہمل | غیر مقفیٰ | تابعات وضعی | تتر بتر، چیں پٹاخ |
| ۷ | بامعنی | مہمل | غیر مقفیٰ | تابعات وضعی | اکڑفوں، غل غپاڑہ، جوڑ جاڑ |
| ۸ | مہمل | بامعنی | غیر مقفیٰ | تابعات وضعی | دھما چوکڑی، ٹھور ٹھکانہ |

## تابعات کی مثالیں

نیچے تابعات کی بہت سی مثالیں دی جا رہی ہیں جو اُردو میں معروف و مستعمل ہیں۔ ان کے معانی بھی دے دیے گئے ہیں جن سے ان کا محل استعمال اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دیا ہوا استعمالی جملہ واوین میں مقید کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی جہاں کوئی مناسب شعر مل گیا ہے وہ بھی متعلقہ تابعات کے ساتھ بطور تشریح درج کر دیا گیا ہے مندرجہ ذیل تابعات کی اقسام اوپر دیے ہوئے نقشہ کی مدد سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔

### 'الف' کے تابعات:

(۱) ایسے تیسے، ایسا تیسا: اس کا استعمال معمولی، غریب، نا قابل توجہ، کم مایہ کے معانی میں ہوتا ہے۔ ایسی تیسی تحقیر کا استعارہ ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق کا ایک شعر ہے (موئے یعنی مرے)

مفلس جو موئے تو پھر کسی نے اے ذوق پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

-----

(۲) اونچ نیچ: "اچھائی برائی، سوچ سمجھ کر" کے لیے لکھا جاتا ہے۔ فیصلہ اونچ نیچ دیکھ کر کرنا چاہئے:۔

آگا پیچھا بھی انہیں معنوں میں لکھا جاتا ہے۔ "کوئی کام کرنے سے پہلے آگا پیچھا دیکھ لینا چاہئے"

(۳) اول فول: عوامی زبان ہے بہ معنی فضولیات، بکواس، بے مصرف گفتگو۔

---

[1] 'ڈانٹ پھٹکار' البتہ 'ڈانٹ ڈپٹ' کثرت سے مستعمل ہے (ادارہ)

(۴) اُول جلُول: عام محاورہ ہے بے ڈھنگا، بے تکا کم عقل کے معنی میں۔

(۵) للّے تللّے: "بے جا اصراف" کے لیے یہ گھریلو زبان ہے۔

(۶) آئیں بائیں شائیں تین مہمل الفاظ پرمبنی یہ اُردو کے معدودے چند ایسے تابعات میں سے ہے۔ اس کے معنی فضول باتیں، بے سر پیر کی اُڑانا، بے بنیاد باتیں ہیں۔

(۷) اگر مگر: عام طور سے ٹال مٹول کرنا، بات بنانا کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۸) آس پاس: یعنی اِردگرد، قرب وجوار: عام محاورہ ہے

(۹) آتا واتا: یہ بھی عام لفظ ہے جس کے معنی اس کی ترکیب سے ظاہر ہیں۔ "آتا واتا کچھ نہیں"

(۱۰) آگا تاگا: عام طور سے آگا تاگا لینا بولا جاتا ہے۔ یہ بھی عوامی زبان ہے۔ اس کے معنی دیکھ بھال کرنا کسی کی خوشامد میں اُس کے آگے پیچھے پھرنا ہیں

(۱۱) ایسی تیسی: تحقیر وتوہین کا لفظ ہے۔ بازاری زبان میں گالی کے طور پر بھی بولا جاتا ہے۔ ایسی تیسی: یعنی بے حقیقت، بے کار، کم سواد: میر سوز کا شعر ہے

یار آتا ہے، ترے یار کی ایسی تیسی　　　آزماتا ہے، ترے پیار کی ایسی تیسی

-----

(۱۲) الگ تھلگ: اس تابع میں الگ کے ساتھ تھلگ لگا کر شدت یا انتہا کی صورت پیدا کی گئی ہے یعنی بالکل علیحدہ سب سے الگ راہِ عام سے ہٹ کر بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے:

ڈر ہے اسے نہ دے گرا صدمہ ہماری آہ کا　　　یہ جوز میں پہ ہے کھڑا چرخ بریں الگ تھلگ

-----

(۱۳) اناپ شناپ: یعنی "الٹی سیدھی بات، فضول، بکواس، بے سر پیر کی" آئیں بائیں شائیں کے تحت اس تابع کا ذکر ہو چکا ہے۔

(۱۴) الا بلا: یہ لفظ بہانہ بازی سبز باغ دکھانا، بات بنانا کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ عوامی لفظ ہے

الا بالا نہ بتا ملنے میں ہر بات کے بیچ　　　وعدے کا کب ہے تحمل دلِ بیتاب کے بیچ

-----

(۱۵) اینچ پینچ: یعنی چال، فریب، پیچیدگی وغیرہ۔

(۱۶) اکیلا دُکیلا: یہ لفظ تنہا ایک دو یا کم تعداد اِکا دُکا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱۷) اُتھل پتھل: اس لفظ کو اُلٹ پھیر، انقلاب، زیر و زبر، درہم برہم کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ دونوں الفاظ مہمل ہیں لیکن مل کر معنی پیدا کرتے ہیں۔ "دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر اُتھل پتھل ہو گیا"۔

(۱۸) انٹ سنٹ: یعنی بے پر کی، بکواس، فضولیات: وغیرہ۔ یہ ایک عامیانہ اور سوقیانہ لفظ ہے۔ شعروادب میں اس کا استعمال ناپید ہے۔ یہ اناپ شناپ، آئیں بائیں شائیں، اُول فُول کی قبیل کا ہی لفظ ہے۔ اور معنی بھی ان تابعات سے ملتے جلتے ہیں۔

(۱۹) اُکھاڑ پچھاڑ: جیسا کہ اس لفظ کے ترکیبی اجزا سے ظاہر ہے اس کا مطلب توڑ پھوڑ، شکست وریخت ہے۔

(۲۰) اُلٹا سُلٹا، اُلٹی سُلٹی، اُلٹ سَلٹ: جیسا کہ۔ اُلٹا اور اس کی دوسری شکلوں سے ظاہر ہے اس لفظ کے معنی بے دلی سے کی گئی بات، غلط کام لئے جاتے ہیں۔

(۲۱) اُگڑم بگڑم: خالص عوامی اور سوقیانہ لفظ ہے۔ ادب میں اس کا مقام نہیں ہے۔ اس کو مطلق ناکارہ، بے سود کام، انٹ سَنٹ: کے ہی معنی میں لیا جاتا ہے۔

(۲۲) آتا جاتا، آتے جاتے: اس تابع کی پہلی شکل آتا جاتا تحقیر کے لہجہ میں استعمال ہوتی ہے اس کی دوسری شکل آتے جاتے کے معنی ادھر سے گزرتے وقت چلتے پھرتے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ مرزا رفیع سودا کا شعر دیکھئے:

نہ ہوا یہ کہ مرے کلبۂ احزاں کی طرف　　　آتے جاتے تو کسی گھر کی کرے راہ غلط

-----

(۲۳) آنا جانا: عام محاورہ ہے۔ معنی ظاہر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

فراق یار میں کیا آنا جانا سانس کا کہئے　　　کلیجہ پر سدا کھینچا کیا کرتے ہیں آرے ہم
(جرأت)

یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر　　اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر جانا، نہ پھر آنا

(بہادر شاہ ظفر)

-----

(۲۳) آر پار: یعنی اس طرف سے اُس طرف تک چیر کر نکل جانا: فیض احمد فیض کا شعر ہے:

رہا جو تیر نظر نیم کش تو کیا حاصل؟　　مزا تو جب ہے کہ سینہ کے آر پار چلے

-----

(۲۴) الم غلم: بیکار اور بے مصرف اشیاء۔

(۲۵) ایرا غیرا: یعنی کوئی بھی شخص بلا تخصیص مقام و وقعت: ۔بعض اوقات اس کے ساتھ نتھو خیرا ٹانک کر ایرا غیرا نتھو خیرا بنا لیتے ہیں۔

(۲۶) اغل بغل: یعنی آس پاس ارد گرد۔

(۲۷) ایسا ویسا: یعنی دیکھنے کے لیے، بظاہر، میر تقی میر کا یہ شعر اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے　　ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

-----

(۲۸) ایسی ویسی: یعنی جیسا دل چاہے اپنی مرضی کے مطابق بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں

بَن آئی دہاں کچھ نہیں ایسی ویسی　　جو چاہو سو کر لو یہیں ایسی ویسی

-----

(۲۹) اُلٹ پلٹ: جیسا کہ اس کی ترکیب سے ظاہر ہے یہ تبدیلی، ترمیم و تنسیخ کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳۰) اکڑ فوں: یعنی خواہ مخواہ کا رُعب، دِکھاوے کی شان بے اصل رعونت۔

(۳۱) آڑا ترچھا: جیسا کہ سیاق و سباق سے ہی ظاہر ہے یہ ٹیڑھا میڑھا، راہ راست سے ہٹا ہوا :کے معنی میں لکھا جاتا ہے۔

(۳۲) اَٹکل پچّو: یعنی اندھیرے میں تیر چلانا، اندازہ سے کچھ کرنا عامیانہ لفظ ہے

(۳۳) اَن بَن: یعنی معمولی اختلاف رائے، کھٹ پٹ، شکر رنجی۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۳۴) اُٹھک بیٹھک: یہ اُٹھنے بیٹھنے کی تحقیر آمیز شکل ہے یعنی بے مقصد یا دِکھاوے کی کوشش۔

(۳۵) اَبے تَبے: یہ بدتمیزی سے بات کرنا، زبان درازی کرنا کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۳۶) اٹوائی کھٹوائی (اٹوانٹی کھوانٹی) اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۳۷) اپنا پرایا: جیسا کہ ظاہر ہے اس کا استعمال سبھی لوگ، بلا تخصیص ہر شخص کے معنی میں ہوتا ہے۔

(۳۸) اُدھیڑ بُن: یعنی ذہنی اُلجھن معنوی طور سے ادھیڑ بُن کے معنی سوچ بچار غور و فکر ہیں۔

(۳۹) اندھا دھند: یعنی بے تحاشہ، بے سوچے سمجھے، اندھوں کی طرح۔ میر کا شعر:

نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف اندھا دھند روتے ہیں آنکھوں سے خوں

-----

(۴۰) اُچھل کود، اُچھلنا کودنا: معنی اور محلِ استعمال نام سے ہی ظاہر ہے۔ ذوق کا اشعار:

فقیر وجد میں گر ہاتھ اٹھائے عالم سے تو پہنچے عرش پہ وہ کودتے اچھلتے ہاتھ

عہد پیری نے بھلایا دوڑ، چلنا، کودنا ہائے طفلی! کھیلنا، کھانا، اچھلنا، کودنا

-----

(۴۱) اٹھنا بیٹھنا: آدمی کسی وجہ سے کمزوری کا شکار ہو تو ہر کام آہستہ آہستہ اور آرام لے لے کر انجام دیتا ہے۔ جرأت کے اشعار دیکھیئے::

اچپلاہٹ سے وہاں ہر بار اٹھنا بیٹھنا یاں ہوا ہے ضعف سے دُشوار اُٹھنا بیٹھنا

کل تک جو اٹھتے بیٹھتے پہنچا تھا تجھ تلک حال اس مریض عشق کا نوع دگر ہے آج

-----

(۴۲) آدھ پاؤ: ۔ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے:

میرا قصہ نہیں غلط سارا کچھ نہ کچھ وہ تو آدھا پاؤ ہے ٹھیک

-----

## 'ب' کے تابعات:

(۴۳) بھول چوک: یعنی غلطی، نادانستہ کچھ کر بیٹھنا۔ عام محاورہ ہے۔

(۴۴) بھول بھال: یہ تابع مہمل موخر، غیر مقفّیٰ کی مثال ہے۔ بھال بے معنی لفظ ہے لیکن بھول سے مل کر ذہن سے اُتر جانا کے معنی پیدا کر رہا ہے۔

(۴۵) بھولا بھٹکا: یعنی جو اپنی راہ بھول گیا ہو: عام محاورہ ہے۔

(۴۶) باندھنا بوندھنا: بوندھنا مہمل ہے اور باندھنا کے ساتھ مل کر باندھنے ہی کا مفہوم پیدا کرتا ہے

(۴۷) بہلانا پھُسلانا: مطلب اور محلِ استعمال اس تابع کی ترکیب سے ہی ظاہر ہے۔ پھُسلانا کو بہلانا سے ملایئے تو اس میں ایک درجہ راضی کرنے کا پہلو در آتا ہے۔۔

(۴۸) بھاؤ تاؤ: روزمرہ میں بھاؤ کا مطلب کسی چیز کی قیمت ہے۔ تاؤ کے معنی کسی مائع میں اُبال پیدا کرنا ہیں لیکن یہاں بھاؤ تاؤ سے مراد کسی چیز کی قیمت طے کرنا ہیں۔

(۴۹) بولی ٹھولی: عوام کی زبان کے لیے ٹھولی کا لفظ بولا جاتا ہے لیکن کبھی مجرد استعمال نہیں ہوتا۔

(۵۰) بھلا چنگا: یعنی تندرست اچھا بھلا۔

(۵۱) برتن بھانڈا: یہ لفظ بھی عوامی لفظ ہے۔ بھانڈا: مٹی کے برتن کو کہتے ہیں۔ اسی رعایت سے راز فاش ہو جانے کے لیے بھانڈا پھوٹ جانا عام محاورہ ہے۔

(۵۲) بھائی بند: یعنی راشتہ دار، عزیز و اقارب: عام بول چال کا لفظ ہے۔

(۵۳) بھول بھلکڑ: ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کا حافظہ نہایت کمزور ہو

(۵۴) بچا کھچا: یعنی جو کچھ بھی بچ رہا ہے۔ کھچا سے مقدار کی کمی کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔

(۵۵) بندھا ٹکا: یعنی طے کیا ہوا کسی اصول کے مطابق، سکہ بند ٹکسالی۔

(۵۶) بننا بگڑنا: یعنی انقلاب بپا ہونا، شکست و ریخت، توڑ پھوڑ۔

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کہ یاں     خاک کن کن کی ہوئی اور ہوا کیا کیا کچھ
(میر)

عزیزو کام نہ کس کس کا یاں بنا بگڑا ہمارے پیش نظر اک جہاں بنا بگڑا

(بہادر شاہ ظفر)

-----

(۵۷) بھیڑ بھاڑ: یعنی جم غفیر، مجمع گویا بھاڑ سے کثیر تعداد کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۵۸) بات چیت: عام محاورہ ہے اور گفتگو، تبادلہ خیال وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۵۹) بھاگم بھاگ: یعنی ہانپتا کانپتا دوڑ کر جلدی سے بھاگ کر۔

(۶۰) بک بک: یعنی فضول باتیں واہیات گفتگو، بے سر پیر کی۔ بکنا جھکنا

(۶۱) بوندا باندی: یعنی ہلکی ہلکی بارش، عام محاورہ ہے۔

(۶۲) باسی تباسی: پچھلی رات کے بچے ہوئے کھانے کو باسی کہتے ہیں اور اگر کھانا تین دن کا باسی ہو تو اس کو تباسی کہتے ہیں۔ گویا باسی تباسی سے مراد کئی دن پہلے کا پکا ہوا کھانا ہے۔

(۶۳) باگ ڈور: یعنی اختیار۔ گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے باگ کا استعمال ہوتا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

-----

(۶۴) بول چال، بولنا چالنا: یوں تو چال مشتق ہے چلنے سے لیکن یہاں بول کے ساتھ ملا کر اس سے گفتگو کا مطلب نکالا گیا ہے۔ یہ ایک عام محاورہ ہے۔

(۶۵) بیل بُوٹے: یعنی نقش ونگار پھول پتے جو خوبصورتی کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ عبدالخالق منشی کا شعر دیکھیئے:

حسرت سے کہہ رہے ہیں طاق ٹوٹے پھوٹے ہم پہ تھی نقش کاری ہم پر تھے بیل بُوٹے

-----

(۶۶) بوباس: اُردو میں بو کے معنی خوشبو ہیں ویسے یہ لفظ بدبو کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ باس ہندی میں بو کا ہم معنی ہے۔ بوباس بھی خوشبو، شائبہ، یکسانیت وغیرہ کے لئے لکھا جاتا ہے

(۶۷) باجا گاجا: یعنی شان وشوکت، نمائش، دھوم دھام: عام محاورہ ہے۔

(۶۸) بن ٹھن: یعنی سنگھار کر کے، سنور کے وغیرہ۔ داغ کا شعر:

کسی کی شامت آئے گی، کسی کی جان جائے گی — کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

-----

(۶۹) بیٹھے بٹھائے: یعنی بغیر کسی سبب کے بلا وجہ بغیر دیکھے بھالے وغیرہ۔

کیوں اُٹھ چلا جہاں سے دلِ زار کیا ہوا — بیٹھے بٹھائے تجھ کو یہ آزار کیا ہوا
(جرأت)

-----

## 'پ' کے تابعات

(۷۰) پکڑ دھکڑ: یہاں پکڑ تو اصل لفظ ہے۔ اس کے ساتھ ایک مہمل لفظ دھکڑ ملا کر پکڑ دھکڑ بنایا ہے جس کے معنی بغیر تحقیق گرفتاری کے ہیں

(۷۱) پوچھا پاچھی: اس تابع میں یائے معروف از قسم ڈور ہے اور اس کے معنی صفائی کرنا، جھاڑ پونچھ کرنا ہیں۔ عوامی لفظ ہے اور ادب و شعر میں نظر نہیں آتا۔

(۷۲) پتھر روڑا: عرف عام میں روڑا چھوٹے پتھر کو کہتے ہیں۔ ایک جانا پہچانا محاورہ ہے کہ کہیں کی اینٹ۔ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ جرأت کا ایک شعر ہے:

ہم اُٹھیں واں سے اور اس در کو نہ چھوڑے پتھر — وائے قسمت! ہوئے کیوں ہم بھی نہ روڑے پتھر

-----

(۷۳) پھولنا پھلنا، پھلنا پھولنا۔ عام محاورہ ہے جو نمو د ترقی، اچھی حالت کے معانی میں مستعمل ہے۔ اشعار دیکھئے::

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں — سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا؟
(ذوق)

شمع ساں کس نے مجھے پھولتے پھلتا دیکھا　　　　ہوں میں وہ نخل کہ دیکھا بھی تو جلتے دیکھا
(جرأت)

-----

(۷۴) پھل پھلاری: یعنی پھل اور سبزیاں۔

(۷۵) پھینک پھانک: یعنی بے توجہی یا حقارت سے پھینکنا۔

(۷۶) پھوڑنا پھاڑنا: یعنی برباد کرنا۔ یہ بھی عام ہے۔

(۷۷) پوچھنا گچھنا: یعنی تفتیش کرنا، جانچ پڑتال کرنا، بہادر شاہ ظفرؔ کا شعر:

بس میں دل کو لو کسی دم سے نہ پوچھو نہ گچھو　　　　ہم سے کیا پوچھتے ہو ہم سے نہ پوچھو نہ گچھو

-----

(۷۸) پُرانا دُھرانا: یعنی بہت پُرانا، استعمال شدہ۔ عام طور سے کپڑے کے لیے کہا جاتا ہے۔

## 'ت' کے تابعات:

(۷۹) توڑ پھوڑ: یعنی شکست وریخت، دانستہ تباہ کرنا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا شعر ہے:

محتسب سے ہے میکدہ میں بنی　　　　وہی تدبیر توڑ پھوڑ کی ایک

-----

(۸۰) تانا بانا: یعنی بناوٹ، جال۔ عام لفظ ہے۔ مزید تشریح کے لیے شاہ نصیرؔ کا شعر دیکھئے:

تانے بانے پر نہ کر دنیا کے ہرگز اعتبار　　　　غور کر چشمِ حقیقت سے کہ سر پر کُوچ ہے

-----

(۸۱) تام جھام: یعنی شان و شوکت، دھوم دھام، چمک دمک وغیرہ۔ طنزیہ لفظ ہے۔

(۸۲) تاک جھانک، تاکنا جھانکنا: یعنی چھپ چھپ کر دیکھنا، کسی چیز کی آڑ سے دیکھنا:

آفت کی تاک جھانک قیامت کی شوخیاں　　　　پھر چاہتے ہو ہم سے کوئی بدگماں نہ ہو
(داغ دہلوی)

کرتی ہے زیر برقعِ فانوس تانک جھانک　　　　پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
(ذوق)

-----

(۸۳) توڑنا تاڑنا: یہاں تاڑنا بے موقع سا ہے لیکن تابعات میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایسے بے محل الفاظ کے اضافہ سے معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ توڑنا تاڑنا یعنی شکست و ریخت۔

(۸۴) تن بدن: یعنی سارا بدن، سر سے پیر تک۔ بہادر شاہ ظفر کا درج ذیل شعر دیکھئے:

کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ　　اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ

-----

(۸۵) توڑ مروڑ: اس تابع کا مطلب وہی ہے جو توڑ پھوڑ توڑ تاڑ سے ظاہر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مروڑ سے کسی چیز کو بل دے کر ناکارہ کر دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے

(۸۶) تڑاق پڑاق: یعنی چمک کر، نہایت شوخی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر دیکھئے

نہ کیجئے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق　　وگرنہ ہووے گی پھر دو بدو تڑاق پڑاق

-----

(۸۷) تتر بتر: یعنی بکھرے ہوئے، ادھر اُدھر، منتشر۔ عام طور سے مستعمل ہے۔

(۸۸) تابڑ توڑ: یعنی یکے بعد دیگرے، لگاتار، متواتر۔

(۸۹) تن من دھن یعنی دل و جان سے پوری طرح جس میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ یہ ان چند تابعات میں سے ایک ہے جو تین الفاظ سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔

(۹۰) تناتنی یعنی اَن بَن، تناؤ، اختلاف وغیرہ۔

## 'ٹ' کے تابعات:

(۹۱) ٹھیک ٹھاک: یعنی درست، صحیح۔

(۹۲) ٹوٹنا جھڑنا: یعنی شاخ سے جدا ہو جانا، درخت سے گر جانا۔ مرزا رفیع سوداؔ کا شعر ہے:

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب　　ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

-----

(۹۳) ٹھاٹ باٹ: یعنی شان و شوکت

(۹۴) ٹھور ٹھکانہ: یعنی مکان، جائے قیام ٹھور ٹھکانہ سے مراد، کیسا ہی اور مومن کہتے ہیں:

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے　　　ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

-----

(۹۵) ٹوٹ پھوٹ: یعنی شکست و ریخت توڑ پھوڑ۔ عبدالخالق منشی کا شعر دیکھئے:

حسرت سے کہہ رہے ہیں دالان ٹوٹے پھوٹے　　　ہم پہ تھی نقش کاری، ہم پر تھے بیل بوٹے

-----

(۹۶) ٹیڑھا میڑھا: معنی ظاہر ہیں اور محل استعمال بھی عام ہے

(۹۷) ٹالا بالا: یعنی بہانہ، ٹال مٹول، جرأت کے اشعار دیکھئے:

ٹالے بالے ہی بتاتے تھے سدا تم میری جاں　　　دیکھ پایا آپ کا اب ہم نے گھر اچھا ہوا
ٹالے بالے نہ بتا بھالے پہ بھالے ظالم　　　تا کجا دل پہ مرے نالۂ شب گیر لگائے

-----

(۹۸) ٹیڑھا بانکا: یعنی مغرور و متکبر، رعونت والا شخص۔ مصحفی کہتے ہیں:

جسے سب بانکے اور ٹیڑھے کریں تھے دور سے مُجرا　　　وہی رستہ میں آخر ہم سے کر کے بانکپن بگڑا

-----

## 'ج' کے تابعات:

(۹۹) جھٹ پٹ: یعنی فوراً، بلا تاخیر۔ عام لفظ ہے۔ داغ کا شعر ملاحظہ ہو:

نہ ہو ایک نگہ سے جو مرا کام تمام　　　پھر کے پھر دیکھ لیا اس نے دوبارہ جھٹ پٹ
(داغ دہلوی)

-----

(۱۰۰) جھاڑ جھنکاڑ: یعنی پیڑ پودے، خس و خاشاک، گھاس پھوس، خودرو جھاڑیاں۔

(۱۰۱) جھاڑ جھوڑ: یعنی صفائی کرنا، جھاڑ دینا، جھٹک کر صاف کرنا وغیرہ۔

(۱۰۲) جھاڑ پھٹکار: یعنی بُرا بھلا کہنا، ڈانٹ ڈپٹ، سخت کلامی وغیرہ۔ محل استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۱۰۳) جوڑ جاڑ: یعنی کسی طرح جوڑ لینا۔ اکثر پیسے بہ مشکل جمع کرنا کے معنی میں لکھا جاتا ہے۔

(۱۰۴) جمع جوکھڑ: عرف عام میں جوکھڑ یا روکڑ سے پیسے، رقم مراد ہوتے ہیں۔ لہٰذا جمع جوکھڑ وہ رقم ہوئی جو جمع کر کے رکھی گئی ہو۔ اس کے لئے پونجی کا لفظ بھی عام طور سے مستعمل ہے۔

(۱۰۵) جی جان: یعنی پوری محنت سے، دل لگا کر، توجہ کے ساتھ۔

(۱۰۶) جہاں تہاں: یعنی اِدھر اُدھر، جہاں جی چاہا۔ تہاں سے بے پروائی کا اظہار مقصود ہے۔

(۱۰۷) جھگڑا ٹنٹا: یعنی لڑائی جھگڑا۔ ٹنٹا ہندی کا سوقیانہ لفظ ہے۔

(۱۰۸) جھومنا جھامنا: یعنی محل استعمال جھومنا سے ظاہر ہے۔

(۱۰۹) جوں توں: یعنی جیسے تیسے، بہت مشکل یا جتن سے۔ میر کا شعر دیکھئے:

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

-----

(۱۱۰) جھوٹ موٹ: اس تابع کے معنی اور محل استعمال ظاہر ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر:

نمود باندھتے ہیں گھر میں جھوٹ موٹ پڑے　　الٰہی جان پہ جھوٹوں کے قہر ٹوٹ پڑے

-----

(۱۱۱) جس تس: یعنی ہر ایک۔ میر کا مشہور شعر ہے:

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا؟

-----

(۱۱۲) جھانکنا تاکنا یعنی نظر بازی چھپ کر یا آڑ سے دیکھنا

دل سے شوقِ رخ نکو نہ گیا　　جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
(میر)

جھانکنے تاکنے کا وقت گیا　　اب وہ ہم ہیں نہ وہ زمانہ ہے
(یاس یگانہ چنگیزی)

-----

(۱۱۳) جب تب: یعنی وقت بے وقت، ہمیشہ۔ مزید تشریح کے لیے یہ اشعار دیکھئے:

جب نہ تب اس کو پڑا زلف گرہ گیر سے کام کس قدر یہ دل دیوانہ ہے زنجیر نصیب
(سوداؔ)

بتوں کے غم میں نالے جب نہ تب ہوں نہ راضی خلق مجھ سے نے خدا خوش
(میرؔ)

-----

(۱۱۴) جانچ پڑتال: یعنی تفتیش، دیکھ بھال، تلاش، تصدیق وغیرہ۔

(۱۱۵) جوڑ توڑ: یعنی سازش، مکر و فریب، چال چلنا۔ یہ عموماً اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا

(۱۱۶) جلا بھنا: یعنی غم کا مارا، جو جل کر سیاہ ہو گیا ہو۔ لفظ بھُنا سے آگ پر اچھی طرح جلنا :

زبس کہ سوختۂ عشق ہے تو اے جرأت جلا بھنا نہ ہو کیوں کر ترا کلام تمام
(جرأت)

-----

(۱۱۷) جان پہچان: یعنی شناخت، دوستی، ربط وضبط وغیرہ۔

## 'چ' کے تابعات:

(۱۱۸) چھیڑ چھاڑ: یعنی شوخی، شرارت، میرؔ کا شعر ہے

میں آپ چھیڑ چھاڑ کے کھاتا ہوں گالیاں خوش آ گئی ہیں اُس کی مجھے بدزبانیاں

-----

(۱۱۹) چھل بل: یعنی نازو انداز، عشوہ طرازی، سج دھج۔ مزید تشریح کے لیے داغ کا شعر:

یہ ناز، یہ نگاہ، یہ چھل بل، یہ شوخیاں تم اس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں

-----

(۱۲۰) چپ چاپ: یعنی خاموشی سے عام طور سے مستعمل ہے۔

(۱۲۱) چیلا چانٹا: یعنی شاگرد، تابع، غلام وغیرہ۔ چانٹا سے تحقیر کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

(۱۲۲) چوری چکاری: مطلب ظاہر ہے یعنی کسی کا مال چپکے سے اُڑا لینا

(۱۲۳) چھینا چھانا: یعنی کسی کا مال زبردستی لے لینا غصب کرنا

(۱۲۴) چھوڑ چھاڑ: یعنی دست بردار ہو کر، الگ ہو کر، ہاتھ جھاڑ کر وغیرہ

(۱۲۵) چھین جھپٹ یعنی زبردستی چھین لینا۔

(۱۲۶) چَھیل چَھبیلا: یعنی بانکا، بنا ٹھنا شخص، نمائشی شخص وغیرہ۔

(۱۲۷) چال ڈھال یعنی انداز، طور طریق، عام کیفیت وغیرہ۔ روزمرہ کا لفظ ہے اور بہت عام ہے

(۱۲۸) چال چلن: یعنی کردار، اخلاق، برتاؤ وغیرہ۔ آتش کا شعر ملاحظہ ہو:

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں     چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

(۱۲۹) چھوٹا بڑا: یعنی ہر ایک، بلا تخصیص عمر و حیثیت۔ عام لفظ ہے

(۱۳۰) چمک دمک: معنی بھی ظاہر ہیں۔ چمک کے ساتھ دمک یعنی روشنی، رونق

(۱۳۱) چلا چلی: یعنی یکے بعد دیگرے رخصت ہونا، روانگی، بے ثباتی وغیرہ۔ میرؔ کا شعر:

کیا رنگ و بو و باد و سحر سب ہیں گرم راہ     کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

-----

(۱۳۲) چٹا چٹ: یعنی فوراً بغیر تاخیر کے وغیرہ۔ عوامی لفظ ہے۔ چٹ پٹ بھی بولا جاتا ہے۔

(۱۳۳) چاٹ چوٹ یعنی بالکل صاف کر دینا جیسے پلیٹ چاٹ لینے کے بعد صاف ہو جاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفرؔ کا ایک شعر ہے:

دیکھی جو آ کے بادہ کشوں نے گزک کی قاب     اک دم میں اٹھ کھڑے ہوئے سب چاٹ چوٹ کے

-----

(۱۳۴) چھپا چھپ: پانی میں چلنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو چھپا چھپ سے ادا کیا جاتا ہے

(۱۳۵) چیخ پکار: عام لفظ ہے۔ پکار کے اضافہ سے چیخ کی شدت کا اظہار مقصود ہے۔

(۱۳۶) چائے پانی، چائے وائے: یعنی چائے اور اس کے لوازمات۔ یہ بھی عام لفظ ہے۔

(۱۳۷) چلنا پھرنا: یعنی بے مقصد مارے مارے پھرنا، ادھر اُدھر آنا جانا میرؔ کا شعر ہے:

مکہ گیا ، مدینہ گیا ، کربلا گیا　　جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

-----

(۱۳۸) چیرنا پھاڑنا: یعنی کسی چیز کو کاٹ پھیٹ دینا۔

(۱۳۹) چکا چوندھ: یعنی آنکھوں کا خیرہ ہو جانا، نظر کا نہ ٹھیرنا۔

## 'ح' کے تابعات:

(۱۴۰) حساب کتاب: اخراجات و آمدن کا ریکارڈ۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۴۱) حق ناحق: یعنی خواہ مخواہ، بلاوجہ۔ ''دنیا والوں نے مجھ کو حق ناحق بدنام کر رکھا ہے''۔

(۱۴۲) حقہ پانی: 'حقہ' تمبا کو نوشی کا پُرانا طریقہ۔ مہمان کو تواضع کے طور پر حقہ تازہ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ مشترکہ طور پر لوگ کسی شخص کو تنبیہ کرنے یا سبق سکھانے کی خاطر اس کا سماجی مقاطعہ کرنے کو حقہ پانی بند کر دینا بھی کہتے ہیں۔

(۱۴۳) حال چال: یعنی احوال، خیریت۔ عام لفظ ہے اور استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

## 'خ' کے تابعات:

(۱۴۴) خُرد بُرد: رقم کھا جانا، غبن کرنا وغیرہ۔

(۱۴۵) خالی خولی۔ یعنی بالکل خالی، بے معنی، بے مقصد وغیرہ۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

## 'د' کے تابعات:

(۱۴۶) درہم برہم: تباہ و برباد، منتشر، بکھرا ہوا۔

(۱۴۷) دھواں دھار: یعنی بے تحاشہ، اُمڈ کر، دھویں کی طرح۔ درج ذیل شعر دیکھیے:

شوق زوروں پہ ہے، ضعفِ دل بیمار گھٹا　　آؤ میخانہ چلیں، آئی دھواں دھار گھٹا

-----

(۱۴۸) دھوم دھام: یعنی شان و شوکت، زیبائش، عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۴۹) دھوم دھڑکا: اگر دھوم دھام میں شور وغل کا عنصر شامل کر دیجئے تو اس کو دھوم دھڑکا کہتے ہیں

(۱۵۰) دھینگا مشتی: یعنی دھکم دھکا، مار پیٹ۔

(۱۵۱) دیس بدیس: یعنی غیر ملک، بے گھر، اِدھر سے اُدھر۔ نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں:

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے، دن رات بجا کر نقارا

---

(۱۵۲) داؤ گھات: یعنی چھپ کر کمین میں بیٹھنا، دھوکا دینا۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

ارادہ کس کے ہے دل کے شکار کرنے کا ادھر اُدھر وہ لگانے جو داؤ گھات لگے

---

(۱۵۳) دیر سویر: یعنی تھوڑی تاخیر۔

(۱۵۴) دوڑ بھاگ: یعنی محنت، کوشش۔ عام محاورہ ہے۔ "دوڑ دھوپ" بھی اسی معنی میں مستعمل ہے

(۱۵۵) دکھ سکھ: یعنی خوشی اور غم، اچھا بُرا۔

(۱۵۶) دانا دُنکا: یعنی چڑیوں کا دانہ، خوراک۔ دانا پانی بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱۵۷) دیکھ بھال، دیکھے بھالے: عرف عام میں دیکھ بھال بہ معنی احتیاط، فکر و تردد کے معنی میں بولا جاتا ہے جب کہ دیکھے بھالے سے مراد ہے جانے پہچانے:

دیکھوں جو نگاہوں سے چلیں آنکھوں پہ بھالے بن دیکھے کہے ہیچ ہے جو دیکھے نہ بھالے
(جرأت)

لے جاؤ میرے سینہ سے ناوک نکال کے پر دل نکل نہ آئے، ذرا دیکھ بھال کے!
(بیخود دہلوی)

(۱۵۸) دیکھ ریکھ: یعنی حفاظت، توجہ، سنبھال کر رکھنا وغیرہ۔

(۱۵۹) دیکھا دیکھی: یعنی نقل میں، مرزا ایاس لکھنوی کا ایک شعر ہے:

لاکھوں اس حسن پہ مر جائیں گے دیکھا دیکھی کوئی غش ہوگا، کوئی محوِ تجلی ہوگا

---

(۱۶۰) دم درود، دم خم: یعنی کس بل، مقدرت، طاقت وغیرہ۔

(۱۶۱) دنگا فساد: یعنی لڑائی جھگڑا، چپقلش۔ عام استعمال کا لفظ ہے

(۱۶۲) دھول دھپا: دھینگا مشتی غالبؔ کا مشہور شعر ہے

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

-----

(۱۶۳) دینا دلانا: یعنی آپس کا لین دین، عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۶۴) دیکھنا، بھالنا: یعنی نگرانی کرنا، جانچنا، اندازہ کرنا وغیرہ۔ یہ بھی عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۶۵) دھاچوکڑی: یعنی بھاگ دوڑ، شوروغل، ہنگامہ۔ عام لفظ ہے۔

(۱۶۶) دم دلاسہ: یعنی ہمت افزائی، بہلاوہ۔ مرزا رفیع سوداؔ کا شعر ہے

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھان دنوں رقیب تھوڑے ہی دم دلاسہ میں اتنا اُبھر چلا

-----

(۱۶۷) دم بدم: یعنی ہر لمحہ، ہمیشہ۔ شعر دیکھئے:

اس طرف بھی تمہیں لازم ہے نگاہے گاہے دم بدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

## 'ڈ' کے تابعات:

(۱۶۸) ڈھول ڈھمکا: یعنی شوروغل، غُل غپاڑہ، زور زور سے باجا بجانا۔ سوقیانہ لفظ ہے۔

(۱۶۹) ڈیل ڈول: یعنی جسامت، جثہ، قدوقامت۔

(۱۷۰) ڈھونڈنا ڈھانڈنا: یعنی تلاش کرنا، جستجو عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۷۱) ڈھیلا ڈھالا: یعنی جو بدن پر چُست نہ آئے یا کمزور سُست۔

(۱۷۲) ڈانٹ ڈپٹ: یعنی سخت کلامی، غصہ گرمی۔

## 'ر' کے تابعات:

(۱۷۳) رکھ رکھاؤ: یعنی وضعداری: مروّت۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۷۴) رشتہ ناتہ: یعنی تعلقات، ربط وضبط، رشتہ داری وغیرہ۔ سید محمد خاں رندؔ کا شعر ہے:

یگانے زندگی تک ہیں عزیز واقربا اے رندؔ لحد میں سوئے جب جا کر نہ رشتہ ہے نہ ناتا ہے

-----

(۱۷۵) رہنا سہنا: یعنی گزر بسر کرنا، رہائش، داغؔ دہلوی کہتے ہیں:

یہیں رہنا، یہیں سہنا، یہیں مرنا، یہیں بھرنا یہی در ہے، یہی سر ہے، گزاریں گے یہیں برسوں

-----

(۱۷۶) رونا رلانا، رونا پیٹنا: یعنی ماتم کرنا، غم کرنا، شکایت کرنا وغیرہ۔

کہاں صبر وتحمل، آہ! ننگ ونام کیا شے ہے میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
(سیّد انشا)

نہیں حال دل یہ سنانے کے قابل یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل
(بہادر شاہ ظفر)

-----

(۱۷۷) راگ رنگ: یعنی عیش وعشرت، رونق، گانا بجانا۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۷۸) ریل پیل: یعنی بھیڑ، دھکم دھکا، بہتات، زیادتی وغیرہ۔

## 'ز' تابعات:

(۱۷۹) زور شور: یعنی تیزی، اہتمام، ہنگامہ وغیرہ۔ عام لفظ ہے۔

## 'س' کے تابعات:

(۱۸۰) سانٹھ گانٹھ: یعنی ملی بھگت، سازش، چوری چھپے کچھ طے کر لینا۔

(۱۸۱) سبزی ترکاری: یہ لفظ ترکاری کے معنی میں عام طور سے مستعمل ہے۔

(۱۸۲) سچ مچ: یہ لفظ بھی بالکل سچ کے معنی رکھتا ہے۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۱۸۳) سج دھج: یعنی خوبصورتی، بانکپن، سجاوٹ، چمک دمک وغیرہ۔ مصحفی کا شعر ہے:

کچھ اس کی وضع بگڑی، کچھ ہے وہ پیاں شکن بگڑا  یہ سج دھج ہے تو دیکھیں گے زمانہ کا چلن بگڑا

-----

(۱۸۴) سمجھ بوجھ: یعنی عقل وشعور، غور فکر، داغ کا شعر ہے:

کیوں داغ کے سوال سے چپ لگ گئی تمہیں  آیا نہیں جواب سمجھ بوجھ کر بھی کیا ؟

-----

(۱۸۵) سُنی سُنائی: یعنی غیر معتبر، دوسروں سے سُنی ہوئی، غیر مصدقہ۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر:

سو ہمارے نہ سن ہماری حکایتِ غم سُنی سُنائی  جو ہم پہ گزری وہ پوچھ ہم سے کہے ہے عالم سنی سنائی

-----

(۱۸۶) سوکھے ساکھے: یعنی بالکل سوکھے، خشک، بے رنگ۔ سید انشا کہتے ہیں:

رکھتے تھے آپ کے وہ دونوں گال  سوکھے ساکھے انار کی سی چھال

## 'ش' کے تابعات:

(۱۸۷) شور شرابہ: یعنی غُل، ہنگامہ، جھگڑا وغیرہ۔ عام استعمال کا لفظ ہے

(۱۸۸) شراب وراب: یعنی شراب اور اس کے لوازمات۔ یہ بھی عام استعمال کا لفظ ہے۔

## 'ص' کے تابعات:

(۱۸۹) صاف صوف: یعنی بالکل صاف، چھان پھٹک کر عوامی لفظ ہے۔ امیر خسرو کا شعر ہے:

صاف صوف کر آگے لاکھے جس میں ناہیں تو سُل  اوروں کے جہاں سینگ سماوے چمو کو وہاں موسل

-----

## 'غ' کے تابعات:

(۱۹۰) غل غپاڑہ: یعنی شور وغل، ہنگامہ عوامی لفظ ہے اور ادب وشعر میں نظر نہیں آتا ہے۔

(۱۹۱) غٹا غٹ: یعنی کسی چیز کو غٹ غٹ کر کے تیزی سے پی جانا۔

(۱۹۲) غلط سلط: یعنی بے تکا، بالکل غلط۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

## 'ک' کے تابعات:

(۱۹۳) کام کاج یعنی مختلف کام، مصروفیت، ناکارہ آدمی کے لیے ایک کہاوت ہے کہ "کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا"

(۱۹۴) کیا کرایا: یعنی پورا کیا ہوا کام۔ جیسے سب کیا کرایا خاک میں مل گیا۔

(۱۹۵) کرتا دھرتا: یہ دراصل ہندی کا لفظ ہے جو اُردو میں در آیا ہے بمعنی مختار، صاحب اختیار۔

(۱۹۶) کھینچ کھانچ: یعنی بصد کوشش، کسی نہ کسی طرح۔ کھینچا تانی[1] بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔

(۱۹۷) کِل کِل: یعنی بے جا بحث، تو تو میں میں، بہادر شاہ ظفر کی غزل (مخمس) میں ایک بند ہے

گفتگو اوروں کے شامل کبھی ایسی تو نہ تھی  ہوتی خفت مجھے حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی
رہتی اُس بزم میں کِل کِل کبھی ایسی تو نہ تھی  بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی

(۱۹۸) کوڑا کرکٹ: یعنی بیکار چیزیں، جو سامان پھینک دیا جائے۔ امیرؔ مینائی کا ایک شعر ہے:

کیا تماشہ ہے بہارِ چمن نزہتِ طبع!  سامنے جس کے گل ولالہ ہیں کوڑا کرکٹ

(۱۹۹) کونا کھدرا: مُراد ہے ایسی جگہ جہاں کچھ چھپا دیا جائے، ادھر اُدھر، کسی چیز کی آڑ۔

(۲۰۰) کھٹ میٹھی: جس میں کھٹاس اور مٹھاس دونوں ہوں۔ اس کو کھٹ مٹھا بھی کہتے ہیں۔ شیخ

---

[1] بمعنی زور آزمائی۔ دو افراد کے درمیان کسی چیز کے حصول کی جبریہ کوشش۔ (ادارہ)

امام بخش ناسخ کا شعر دیکھئے:

کوئی کڑوی ہے کوئی ہے سیٹھی     نمکیں ہے کوئی ، کوئی کھٹ میٹھی

-----

(۲۰۱) کچا پکا: یعنی ادھ کچرا، نیم پخت۔ استعمال نام سے ظاہر ہے

(۲۰۲) گُھسر پُھسر: یعنی کانا پھوسی، سرگوشی، رازداری سے بات کرنا۔

(۲۰۳) کوٹنا کاٹنا: یعنی زور زور ہاتھوں سے مارنا، سینہ کوبی، بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں:

ہم اس طرح ہیں ہجر کی راتوں کو کاٹتے     سینہ ہیں اپنا کوٹتے ، ہاتھوں کو کاٹتے

-----

(۲۰۴) کود پھاند: یعنی بھاگ دوڑ، بے مقصد اِدھر اُدھر بھاگنا۔ انہیں معنوں میں اُچھل کود اور کھیل کود بھی مستعمل ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے:

اک دن وہ تھا کہ ٹوٹے نہ تھے دانت دودھ کے     پھر یہ ہوا گزرنے لگے کھیل کود کے

-----

(۲۰۵) کالی کلوٹی: یعنی سیاہ رو، بالکل کالی۔

(۲۰۶) کاٹ چھانٹ: یعنی ترمیم و تنسیخ، کمی بیشی۔ انہیں معنوں میں کتر بیونت بھی مستعمل ہے۔

(۲۰۷) کھیلنا کھانا: یعنی مزے اُڑانا، تفریح کرنا، بے فکری۔ شیخ ابراہیم ذوق کا ایک شعر:

عہد پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا     ہائے طفلی ! کھیلنا ، کھانا، اُچھلنا ، کودنا

-----

## 'گ' کے تابعات:

(۲۰۸) گنا چنا: یعنی چند منتخب، خاص خاص۔

(۲۰۹) گورا چٹا: یعنی بہت صاف رنگ کا۔ عام لفظ ہے۔ استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۱۰) گڑبڑ گھٹالا: یعنی خرابی، خامی، کوتاہی۔ گھٹالا (گ پر پیش ہے) کے اضافہ سے گڑبڑ میں سوقیانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

(۲۱۱) گالم گلوچ: یعنی گالیاں، دشنام طرازی۔ عوامی لفظ ہے۔

(۲۱۲) گڈمڈ: یعنی خلط ملط، آپس میں مختلف اشیاء کو ملا دینا۔ یہ بھی عوامی لفظ ہے۔

(۲۱۳) گورکھ دھندا: یعنی معمہ، چیستاں، مسئلہ، اُلجھن۔ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے:

عشق ظفر ہے گورکھ دھندا کھولے اس کے پیچ کوئی کیا ایک کھلا تو دوسرا محکم، پیچ کے اوپر پیچ پڑا ہے

(۲۱۴) گم سُم: یعنی بالکل خاموش، چُپ۔

(۲۱۵) گول مال: یعنی دھوکا، فریب۔ عوامی لفظ ہے اور استعمال اس کے معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۱۶) گھل مل: یعنی پیوست ہونا، خلط ملط ہونا۔

(۲۱۷) گھیرنا گھارنا: یعنی کوشش سے یکجا کرنا، اکٹھا کرنا۔

(۲۱۸) گھن گھور: یعنی سیاہ، بالکل کالی۔ عام محاورہ ہے۔ گھٹا کے لیے اس کا استعمال عام ہے۔

(۲۱۹) گھن گرج: یعنی شور، گڑگڑاہٹ، کڑک، زوردار آواز۔

(۲۲۰) گھربار: یعنی سارا گھر، گھر کا سارا سامان۔ عام لفظ ہے اور استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۲۱) گھمانا پھرانا: یعنی بات بنانا، ہیر پھیر کے بعد، حیلہ سازی۔

(۲۲۲) گٹھ جوڑ یعنی سازش، ملی بھگت، کسی بات پر اتفاق وغیرہ۔ عوامی استعمال کا لفظ ہے۔

(۲۲۳) گھوٹ گھاٹ: یعنی دبا کر رکھنا۔ استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۲۴) گپ شپ: یعنی ہلکی پھلکی بات چیت، وقت گزاری کے لئے گفتگو۔ عام لفظ ہے۔

(۲۲۵) گھیرنا گھارنا: یعنی احاطہ کرنا، ہر طرح سے گھیر لینا۔ استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۲۶) گول مٹول: یعنی بالکل گول، گیند کی بناوٹ کا، مُدوّر۔ عام لفظ ہے

(۲۲۷) گیا گزرا، گئے گزرے: یعنی ماضی کی بات، بیکس، جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو، بیکار، بے مصرف وغیرہ۔

اب تو آ یار بس خدا کو مان پچھلا شکوہ تھا سب گیا گزرا
سوز کے قتل پر کمر مت باندھ ایسا جاتا ہے کیا گیا گزرا
(میر سوز)

-----

(۲۲۸) گراپڑا: یعنی ناکارہ، بیکار۔ استعمال سے ظاہر ہے

(۲۲۹) گاناوانا: گنا بجانا یعنی موسیقی۔ عام لفظ ہے۔

## 'ل' کے تابعات:

(۲۳۰) لوٹ کھسوٹ: یعنی حق تلفی کرنا، بزورِ بازو کسی کا مال چھین لینا۔

(۲۳۱) لٹاپٹا: بے یار و مددگار، برباد۔ استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۳۲) لوٹنا پلٹنا: یعنی اُلٹ پلٹ کرنا۔ اسی سے لوٹ پلٹ بھی بنا ہے۔

(۲۳۳) لاگ لپیٹ: یعنی ربط و ضبط، تعلق۔ اکیلا لاگ بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ بقول :

لاگ ہو تو ہم اُسے سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

-----

(۲۳۴) لونڈے لپاڑے: یعنی کم عمر شوخ لڑکے، بدمعاش لڑکے۔

(۲۳۵) لنڈ مُنڈ: یعنی بے آب و گیاہ، پتوں سے بے نیاز۔ ایسے درخت کے لیے مستعمل ہے جس کے سارے پتے جھڑ چکے ہوں۔

(۲۳۶) لاٹھی واٹھی: عرف عام میں ایک موٹے اور لمبے ڈنڈے کو کہتے ہیں۔ سوداؔ کا شعر ہے۔

نہیں ڈرتا یہ لاٹھی واٹھی سے کیا کرے لاٹھی اس کی لاٹھی سے

-----

(۲۳۷) لچا لفنگا: یعنی بدمعاش، بدقماش، کمینہ، ذلیل۔ سوقیانہ لفظ ہے

(۲۳۸) لاڈ پیار: یعنی بہت پیار، والہانہ محبت۔

(۲۳۹) لگانا بجھانا، لگائی بجھائی: یعنی کسی کے کان بھرنا، بھڑکانا، بہکانا۔ بقول بہادر شاہ ظفر:

کہا میں نے جو اس سے کہ اس کو بجھا، یہ دل میں گیا ہے تُو آگ لگا

تو یہ سن کے وہ ناز سے کہنے لگا مجھے آتی لگائی بجھائی نہیں

-----

(۲۴۰) لمبا تڑنگا: یعنی قد آور، جسیم، لحیم و شحیم، بڑے ڈیل ڈول کا۔ عام استعمال کا لفظ ہے۔

(۲۴۱) لین دین: یعنی چیزوں یا پیسے کا تبادلہ، حساب کتاب، مالی بیوپار۔ مرزا غالبؔ کا شعر:

میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام

-----

(۲۴۲) لادنا پھاندنا: یعنی بہت سامان رکھنا، جمع کرنا۔ سید انشاء کہتے ہیں:

گلوں کی نگہت کا قافلہ بھی چمن سے ہے لاد پھاند نکلا

-----

(۲۴۳) لوٹ پوٹ: یعنی بیقرار، بے اختیار، سرشار وغیرہ۔ جرأت کا ایک شعر ہے:

اک چاند کی جھلک سی جو وہ پٹ کی اوٹ ہے کیونکر اُدھر نہ دیکھوں کہ دل لوٹ پوٹ ہے

-----

## 'م' کے تابعات:

(۲۴۴) ملیا میٹ: یعنی برباد، تباہ، مٹی میں مل جانا۔ عام محاورہ ہے۔

(۲۴۵) مانگنا تانگنا: اُدھار لینا، احسان اٹھانا۔ تانگنا سے مانگنا میں اہانت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔

(۲۴۶) مول تول: قیمت طے کرنا، حساب کتاب کرنا۔ عام لفظ ہے۔ استعمال معنی سے ظاہر ہے۔

(۲۴۷) میلا ٹھیلا: عرف عام میں میلا وہ جگہ ہے جہاں وقتاً فوقتاً دوکانیں، نمائشی سامان، کھیل کود وغیرہ کا اہتمام ہو۔ ٹھیلا اُس چھوٹی (عموماً لکڑی سے بنی ہوئی) گاڑی کو کہتے ہیں جس میں چھوٹے دوکاندار مال رکھ کر لاتے ہیں۔

(۲۴۸) ملنا جلنا: یعنی تعلقات قائم کرنا، ربط وضبط، میل ملاقات، عام لفظ ہے۔ اسی سے میل جول، میل مروت مراد ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفر:

جو بیٹھیں دشت میں ہم اور مجنوں نکالیں پاؤں سے مل جل کے کانٹے
(بہادر شاہ ظفر)

-----

(۲۴۹) موٹا جھوٹا: یعنی کم قیمت، معمولی۔ عرف عام میں معمولی کپڑے کے لیے مستعمل ہے۔

(۲۵۰) ملی بھگت: یعنی سازش، غلط کام پر اتفاق۔ گٹھ جوڑ سے بھی یہی مراد ہے۔

## 'ن' کے تابعات:

(۲۵۱) نٹ کھٹ: یعنی شریر، شوخ۔ عموماً بچوں کے لیے بولا جاتا ہے

(۲۵۲) نیا نویلا: یعنی بالکل نیا۔ عرف عام میں نئے شادی شدہ شخص کے لیے مستعمل ہے۔

(۲۵۳) نوکری چاکری: عرف عام میں چاکری بھی نوکری کو کہتے ہیں۔

(۲۵۴) نرم گرم: یعنی اچھا برا، کم وبیش، تھوڑا بہت۔

(۲۵۵) نِک سُک: یعنی سلیقہ مندی۔ یہ بھی خواتین کا لفظ ہے۔

## 'ہ' کے تابعات:

(۲۵۶) ہلنا ہلانا: عام لفظ ہے جس کا استعمال ظاہر ہے۔

(۲۵۷) ہنسنا ہنسانا: یعنی خوشدلی، ہنس مکھ ہونا، سب کو خوش رکھنا۔

(۲۵۸) ہیر پھیر: یعنی فریب، دھوکہ، چالبازی۔ جرأت کہتے ہیں:

اس کے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ — یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے کچھ

-----

(۲۵۹) ہرنا پھرنا: یعنی ٹہلنا، گھومنا پھرنا۔ میر تقی میر فرماتے ہیں:

باغباں ہے مجھے کیا کام ترے گلشن سے — ہرتے پھرتے کبھی ایدھر بھی میں آجاتا ہوں

-----

(۲۶۰) ہُوحق[1]: یعنی شور وغل، ہنگامہ۔ "لڑکوں نے شادی کی محفل میں ہوحق مچا رکھا ہے"۔

(۲۶۱) ہنسنا بولنا: یعنی خوش رہنا، مذاق کرنا، خوش دلی، ظریف الطبعی: جرأت کا شعر:

کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اس کا — تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں

-----

(۲۶۲) ہٹا کٹا: یعنی توانا، تندرست، لحیم وشحیم۔ عام استعمال کا لفظ ہے

## حاشیہ:

یہ ظاہر ہے کہ ایک مضمون میں تمام تابعات کا احاطہ ناممکن ہے۔ یہاں چیدہ چیدہ مثالیں دے دی گئی ہیں اور ان کی فہرست میں اضافہ کی بہت گنجائش ہے۔ اہل نظر خود ہی دیکھ کر یہ کام کر سکتے ہیں۔

---

[1] 'ہُوحق' سے سناٹا یا ویرانی کا مفہوم لیا جاتا ہے (ادارہ)

# سیّد انتخاب علی کمالؔ

## ترجمۂ رموزِ بیخودی

### رَسد بر زمینِ "مُسدّس رَمَل"

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے ۱۹۲۴ عیسوی "مرقع چغتائی" ــــ کے انگریزی پیش لفظ میں لکھا تھا:

"فن کار اور شعراء کس نوع کی تخلیقی تحریک حاصل کرتے ہیں۔ یہ تخلیقی تحریک اِنتخاب سے ماورا ہے یہ تو عطیہ ہے جس کے وصول کرنے سے قبل اس کے خواص کے بارے میں وصول کرنے والا کوئی تنقیدی فیصلہ صادر نہیں کر سکتا۔ یہ بلا طلب ملتی ہے اور یہ بھی اسے سماجی حیثیت دینے کے لیے، اس لئے اسے حاصل کرنے والی شخصیت اور حاصل کی گئی تخلیقی تحریک کی حیات بخش خصوصیات انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہیں"۔

(بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر، ماہنامہ "قومی زبان" کراچی۔ اپریل ۲۰۱۳ء)

ہمارے اس مقالے کے لئے علامہ اقبال کے اس اقتباس کی آخری سطر قارئین کی بھرپور توجہ کی طالب ہے۔ لہٰذا اس کو دوبارہ پڑھیئے کیونکہ اس سے تخلیق کار کا سماجی کردار واضح ہوتا ہے۔ وہ سطر یہ ہے:

"تخلیق کار کی حیات بخش خصوصیات انسانیت کے لئے بے حد اہمیت رکھتی ہیں"۔

اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۴ء میں اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ علامہ اقبالؒ ۱۹۱۵ء میں "اسرارِ خودی" اور ۱۹۱۸ء میں "رموزِ بیخودی" کے نام سے فارسی میں دو علاحدہ علاحدہ مثنویاں تخلیق کر چکے تھے "اسرارِ خودی" میں اقبالؒ فلسفۂ خودی پیش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاں ذاتِ مطلق کی ماہیت خودی ہے خودی ایک "أنا" یا "ایگو" (EGO) کے بغیر متصوّر

نہیں ہو سکتی۔ خودی کی ماہیت کو جاننا عرفانِ نفس بھی ہے اور اس عرفانِ نفس میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زورِ خودی سے حیاتِ عالم وابستہ ہے قطرۂ شبنم ضعفِ خودی سے اور قطرۂ اشک آنکھ سے ٹپک کر نابود ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں وہ قطرہ جو صدف نشیں ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے جس کو موجِ تلاطم خیز بھی قلزم میں منتشر نہیں کرتی۔ فلسفے کی ''انائے مطلق'' کا نام خودی رکھ کر اقبالؒ نے اس کے متعدد احوال کو بیان کیا ہے۔ زورِ کلام اور روانی بیان کے اعتبار سے ''اسرارِ خودی'' یقیناً ایک کامیاب فارسی مثنوی ہے اس کے باوجود علامہ اقبال کو مورخہ ۳ جنوری ۱۹۲۶ء کو کسی شوکت حسین نامی شخص نے خط لکھا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے لکھا:

''شعر محاورہ اور بندش کی درستی اور چستی کا نام نہیں، میرا ادبی نصب العین نقاد کے نصب العین سے مختلف ہے۔ میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعراء میں میرا شمار ہو''۔ (۳)

(عطاء اللہ شیخ مرتب) ''اقبال نامہ''۔ ص ۲۵۴۔ (بحوالہ ڈاکٹر سلیم اختر)

علامہ اقبال کے بارے میں ''ترقی پسند ادب کی تحریک'' چل پڑی تھی کہ اقبال شاعر ہیں، مفکر ہیں یا فلسفی؟ حالانکہ یہ بحث بے سود اور لاحاصل تھی۔ اس بحث کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے کرامت بخاری کے (الاقرباء میں پڑھے ہوئے) دو اشعار یاد آ گئے

جو ایک جام کی لذت سے بھی نہیں واقف ۔۔۔ وہ اپنے آپ کو پیرِ مغاں سمجھتے ہیں
قلم کو قط بھی لگانا جنھیں نہیں آتا ۔۔۔ وہ خود کو کاتبِ عصرِ رواں سمجھتے ہیں

-----

یہ تو گزشتہ دور کی بات تھی۔ لیکن دورِ حاضر میں بھی اقبالؒ کے ساتھ ایسا ہی رویہ جاری ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ''چٹان'' میں نہایت دل سوزی سے ''اقبالؒ کے فکر و فن پر مقالات تحریر فرماتے رہے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں یہ تدبیر اس لیے کر رہا ہوں کہ دن دہاڑے ہماری آنکھوں کے سامنے فکرِ اقبال کی تحریف ہو رہی ہے۔ وہ حقیقتیں، جو روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ مسخ کر کے پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ سلسلہ آج ہی جاری نہیں ہوا۔ یہ تو وفاتِ اقبالؒ کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ اقبال کی مظلومی ہے اُن کے کلام کو مسخ کر کے غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے"۔

غالباً اسی لئے علامۂ عصر ابوالوفا عبدالمجید خاں افضل قرولوی نے ۳۰ جمادی الاوّل ۱۳۸۲ ہجری کو اپنی "تقریظِ بلیغ" میں برائے "ترجمانِ بیخودی" تحریر فرمایا تھا:

"افسوس! آج اقبالیت "مَاءُ الرَّاکِد" بن کر رہ گئی ہے۔ اس کو شدید تحریک کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ! اس سفّاح کی قلمرو کو بھی منصور و ہارون و مامون عطا فرمائے کہ اس کے کام پر تنقیحی نظر بھی ڈالیں، اور اس کے ضروری التکمیل مقاصد مطامح نظر کی شایاں تتمیم و توسیع بھی فرمائیں۔ رہا اس کی زبان و اسالیب بیان کا معاملہ۔ اوّل تو خاص اقبال کے بارے میں یہ امر چنداں درخور اعتنا نہیں۔ کیونکہ اس کا اَثاثُ البیت شَوارِدُ اللُّغات نہیں، نادِرُ المعانی ہے۔ اور الفاظ، بس برائے بیت۔ اس کے مرشد رومیؒ کی مثنوی بھی تو نفسِ شاعری کی حیثیت سے "حدیقہ"، منطِقُ الطیر "اور "مخزنُ الاسرار" تو کجا "جامِ جم" و "مصباحُ الارواح" سے بھی کم رتبہ ہے۔ لیکن تعمیقِ اسرار و تحقیقِ معارف میں کیا کوئی مثنوی روئے زمین پر ہے، جس کا رومیؒ کی مثنوی کے مقابلے میں نام لیا جا سکے؟ دوسرے اقبالؒ اپنی عمر کے آخری دس بارہ برس میں صحتِ زبانِ فارسی، علمِ معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے تمام قواعد و اصول کی رعایت میں منجھا ہوا مشاق اور صاحبِ ملکہ، راسخہ نظر آتا ہے کہ مولانا گرامی اور عمادی بھی اس کے صحرائے ادب میں اب شاید ہی آہو گیری کر سکتے۔ چنانچہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اقبال کے "بادۂ نارسا" اور "ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری" وغیرہ پر اس قسم کے جملہ اعتراضات کی تہ میں خود معترضین کی قاصر النظری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔"

مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی مثنوی کے لئے انتخاب بھی اُس بحر کا کیا جس کے لیے مشہور ہے ''شعر دَر بحرِ رَمل باشد بہ از آبِ حیات'' قرآنِ حکیم کی کئی آیات بھی ''بحرِ رَمَل مُسدّس'' ہی میں نازل ہوئی ہیں مثلاً

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (سُورۃ البقرۃ: آیت ۸۴)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ (سورۃ البقرۃ: آیت ۸۵)

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی (سورۃ النجم: آیت ۳۹)

اشاریہ

ان آیات کا ذکر محترمہ ساجدہ بانو ثمین صاحبہ نے الاقربا اکتوبر/ دسمبر ۲۰۰۵ء میں اسی موضوع پر اپنے مقالے ''اقبال کی فارسی مثنوی رموزِ بیخودی کا منظوم اردو ترجمہ'' میں بھی کیا ہے علامہ اقبال کو جو عشق کبھی فلسفے سے تھا۔ اُتنا ہی یا اس سے بھی بڑھ کر اسلامی رُوحانیت کے ساتھ ہوتا چلا گیا تھا۔ لہٰذا اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ نے افکارِ رومؒ کے شاہکار، ''مثنوی'' کو اپنا مرکزِ اُفکار اور محورِ گفتار بنالیا۔ ''اَسرار اور مُوز'' مولانا رُومیؒ کے اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ دراصل ''اسرارِ خُودی'' اور ''رَمُوزِ بیخودی'' بالترتیب ۱۹۱۴عیسوی اور ۱۹۱۸عیسوی میں شائع شدہ دونوں الگ الگ مثنویاں تھیں جن کو خود علامہ صاحب ہی نے ''اَسرار اور مُوز'' کے نام سے یکجا کر کے چھاپ دیا تھا پھر یہی نسخہ بار دوم ۱۹۴۰ء۔ بار سوئم ۱۹۴۸ء اور بار چہارم ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ جو فارسی زبان میں ہیں۔ اگرچہ اس خطہ میں فارسی عرصے تک ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔ اور فارسی شاعری اور نثر میں مُصنّفین اور شعرا نے اعلیٰ درجے کی نگارشات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن گزشتہ تقریباً سو سال میں نئے تعلیمی و تدریسی رُجحانات نے آہستہ آہستہ فارسی کی اہمیّت کو کم کر دیا۔ اور اب بہت کم لوگ (جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے) رہ گئے ہیں جو اقبال کے فارسی کلام کا براہ راست مطالعہ کر کے اس سے اِستفادہ بھی کر سکیں۔ لیکن اقبال کی عظمت کا اندازہ اُن کے فارسی کلام کے بغیر اُدھورا رہ جاتا ہے لہٰذا بہت سے قاری اقبالؒ کے فارسی کلام ''اسرارِ خودی''۔ ''رموز بیخودی''۔ ''پیام

مشرق"۔ "جاوید نامہ"۔ "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے مطالعہ سے محروم رہ جائیں گے۔ تو یہ اُن صاحبانِ مطالعہ کی محرومی نہیں بلکہ یہ اقبالؒ پر بھی ظلم ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر:

"اسرارِ خودی" کے دو تراجم ہوئے پہلا ۱۹۴۷ء میں عبدالرشید فاضل قرولوی نے "ترجمانِ خودی" کے نام سے کیا ترجمہ بہت عمدہ ہے۔ اس ترجمہ کے دو اشعار نمونۃً پیش ہیں:

کاروانِ شب جو لوٹا مہرِ عالمتاب نے | چھینٹے مارے گُل کے، میرے گریۂ بیتاب نے
چشمِ نرگس سے مرے اشکوں نے دھویا خواب کو | اور کہا سبزے سے نالوں نے کہ اب بیدار ہو

-----

"اسرارِ خودی" کا دوسرا ترجمہ "ترجمانِ اسرار" کے نام سے جسٹس شیخ عبدالرحمٰن المعٔروف ایس اے۔ رحمٰن نے کیا۔ یہ ترجمہ بھی لاجواب ہے۔ اس ترجمے کے بھی یہی دو اشعار نذرِ قارئین ہیں:

متاعِ شب کو لوٹا جس گھڑی سورج کی کرنوں نے | دیئے چھینٹے رُخِ گُل پر چمن میں میرے اشکوں نے
جگایا چشمِ نرگس کو مری آنکھوں نے رَو رَو کر | اُگا سبزہ مری آواز سے بیدار ہو ہو کر

-----

مندرجہ بالا دونوں ہی تراجم اپنی اپنی جگہ معروف عیوبِ شعری و لسانی فروگزاشتوں سے پاک ہیں۔ دونوں ہی فاضل مترجمین فاضل العلم اور قادر الکلام بھی ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا ترجموں میں نغمگی جو اقبالؒ کی فارسی زمین بحرِ رمَل مسدّس میں تھی وہ نہیں رہی۔ ان ہی شعروں میں آہنگِ اقبالؒ بھی دیکھتے چلیے:

رَاہِ شب چوں مہرِ عالمتاب زد | گریۂ من بر رُخِ گُل آب زد
اَشکِ من از چشمِ نرگس خواب شُست | سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رُست

-----

اصل اشعار اور ترجمہ دونوں بقول اقبال علیہ الرحمہ "سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند" مثلِ گوہر ہم رشتہ ہوں تو ترجمہ، ترجمانِ اصل بنتا ہے۔ بلاشبہ کسی نظم کا ترجمہ، نظم میں کیا جائے تو

مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ اور بحرِ رَمَل مسدّس میں اردو میں ترجمہ۔۔۔ الاماں !

حکیم الامّت حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی دوسری مثنوی ''رموزِ بیخودی'' میں ملّتِ اسلامیہ کے مختلف اجزائے ترکیبی اور اس کی مجموعی حیثیت کی طرف ملّتِ اسلامیہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنے مختلف النّوع مضامین کی وجہ سے ''رموزِ بیخودی'' بمقابلہ ''اَسرارِ خودی'' زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ دینِ اسلام کسی ایک شخص کا دین نہیں ہے اور نہ دوسرے مذاہب کی طرح صرف پوجا پاٹ کا نام ہے۔ بلکہ حیاتِ انسانی کی ایک مخصوص مجموعی شکل کا نام دینِ اسلام ہے اور اس کا دستورُالعمل ایک ایسا قانون ہے کہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے، تو مِلّتِ اسلامیہ کا فرد نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اپنی خودی کو معراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مِل کر اس دستورُالعمل کے احکامات کی پابندی کریں۔ اور ہر مسلمان اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

آیت مذکور میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تم سب مل کر اللہ کی رَسی (قرآنِ حکیم) کو مضبوط پکڑ لو۔ اور اپنے آپ کو مختلف فرقوں میں تقسیم نہ کرو اسی حکم کے مطابق امیرالمومنین حضرتِ عُمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے۔ کہ اَلَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص انفرادی طور پر مسلمان کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اسی کی تفصیل وتشریح حضرتِ علامہ اقبال نے اس مثنوی، مثنوی رموزِ بیخودی میں فرمائی اور اس کے تمام مضامین واشعار کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

اس مثنوی، ''رموزِ بیخودی'' کا ایک ترجمہ ۲۰۰۵ عیسوی میں پروفیسر عبدالعلیم صدیقی (مقیم پلندری آزاد کشمیر) کا ''منظوم اُردو ترجمہ کُلیاتِ اقبال فارسی'' میں شامل ہے۔ اس کُلیات میں اقبال کے دیگر فارسی کلام کے ساتھ ''اَسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' دونوں مثنویوں کے تراجم بھی

شامل ہیں۔ پروفیسر عبدالعلیم نے اپنی اس کلیات میں ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر راقم الحروف اُسے یہاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا اس کی دو وجوہات ہیں اوّل ہمارا موضوع اسرارِ خودی نہیں۔ دوم قبل ازیں دو تراجم، ترجمہ فاضل اور ترجمہ رحمان سطورِ بالا گزر چکے ہیں لہٰذا تیسرے ترجمے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال اتنا عرض کر دوں کہ متذکرہ بالا دونوں مترجمین کی طرح صدیقی صاحب نے بھی اقبال کی بحر میں ''اسرارِ خودی'' کا اردو ترجمہ نہیں کیا۔ البتہ اپنی ''کلیات'' میں ''رموزِ بیخودی'' کا جو ترجمہ کیا ہے وہ قارئین کی علمی بصیرتوں کی نذر ہے:

| پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کا ترجمہ اردو | رموزِ بیخودی میں اقبال کا فارسی کلام |
| --- | --- |
| اے کہ تو عالم میں ہر آغاز کا انجام ہے | اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد |
| تجھ کو خالق نے بنایا خاتمِ اقوام ہے | بر تو ہر آغاز را انجام کرد |
| ------- | |
| اے کہ نبیوں کے مشابہ ہیں نکوکاراں ترے | اے مثالِ انبیا پاکانِ تو |
| ہیں دلوں کو جوڑنے والے جگر پاکاں ترے | ہم دگر دلہا جگر چاکانِ تو |
| ----- | |
| اے نظر تیری رہینِ حُسنِ ترسا زادہ ہے | اے نظر بر حُسنِ ترسا زادۂ |
| راہِ کعبہ سے تو اک مدت سے دور اُفتادہ ہے | اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ |
| ----- | |
| اے سپہرِ نیلگوں تیری گلی کی مشتِ خاک | اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو |
| اے تماشا گاہِ عالم تیرا روئے تابناک | اے تماشا گاہِ عالم روئے تو |
| ----- | |
| موج کی مانند کیوں آتش تہِ پا جاتی ہے | ہمچو موج آتش تہِ پا می روی |
| تو کہاں، اے بے خبر، بہرِ تماشا جاتی ہے | تو کجا بہرِ تماشا می روی |
| ----- | |

رمزِ سوز آموز از پروانہ — دہر میں پروانے سے رسم و رہِ پروانہ سیکھ
در شرر تعمیر کن کاشانہ — بے خطر تعمیر کرنا آگ میں کاشانہ سیکھ

(۱۱)

-----

قارئین گرامی! پروفیسر صاحب میرے انتہائی محترم کرم فرما ہیں۔ آپ سے میری نصف ملاقات ہے۔ راقم الحروف کو آں جناب نے اخبارات و رسائل کے تراشے ارسال فرمائے ہیں۔ آپ نے مثنوی مولانا رومؒ کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ اور بلاشبہ خُوب کیا ہے۔ رمُوزِ بیخودی کے مندرجہ بالا ترجمے کو آسان سے آسان الفاظ میں بیان کرنے کا فریضہ بخوبی ادا کیا ہے جو اقبالیات اور ملّتِ اسلامیہ میں گراں قدر اضافہ بھی ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کا ترجمہ، مثنوی رمُوزِ بیخودی کی بحر ''بحرِ رَمَل مُسدّس 'فَاعِلَاتُن فَاعِلَاتُن فَاعِلُن' میں نہیں۔ اہل علم وادب خوب واقف ہیں کہ مثنوی کی متعدد بحروں مثلاً ''بحرِ مُتقارِب'' اور ''بحرِ رَمَل مُسدّس'' وغیرہ میں جو مقام بحرِ رَمَل مُسدّس کا ہے وہ کسی دوسری بحر کا نہیں ہے مگر اس کی ساری جادو بیانی فارسی تک محدود ہے۔ اس بحر میں اردو میں شعر کہنا بقول غالب: ''اسد اللہ خاں قیامت ہے''۔

قبلہ سیّد خُورشید علی، مہر تقوی جے پوری علیہ الرحمہ مؤلف ''تذکرہ دُرفشاں'' مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔ (ولادت: ۱۴ اگست ۱۹۰۴ء وفات: ۷ مئی ۱۹۶۶ء) نے علامہ اقبالؒ کی فارسی مثنوی رمُوزِ بیخودی کا منظوم اُردو ترجمہ ۱۷ مئی ۱۹۵۱ء کو شروع کیا اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں جو بحرِ رَمَل مُثمّن میں تھا مکمل کر لیا تھا مگر ایک خاص تحریک کی بناء پر اسے منسوخ کر کے بحرِ رَمَل مُسدّس میں دوبارہ ترجمہ شروع کیا۔ اس کے بعد نظرِ ثانی اور حک و اِصلاح کا کام بھی خود کرتے رہے بالآخر ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء مطابق ۲۹ ربیع الاوّل ۱۳۷۹ ہجری کو ترجمے سے فارغ ہوئے اور یہ قطعۂ تاریخ کہا۔ قطعۂ تاریخ بھی نذرِ قارئین ہے جو اہلِ علم وفنِ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے خاصّے کی چیز ہے:

مثنوی اقبال کی، یعنی ''رمُوزِ بیخودی'' — اِک ادیبِ ہند کی منظوم تصنیفِ لطیف

| | |
|---|---|
| میں نے ڈھالا فارسی سے اس کو اُردو نظم میں | اور اُس کو ''ترجمانِ بیخودی'' کی شکل دی |
| ترجمے کے ختم کی تاریخ آئی ذہن میں | ''ہو گئی سنجیدہ اُردو میں ''رموزِ بیخودی'' |
| | ۱۳ ہجری ۷۹ |
| عیسوی ہے مصرعِ تاریخ اس تکمیل کا | ''ترجمے کی فکر سے اب ہمو افرصت ہوئی'' |
| | ۱۹ عیسوی ۵۹ |
| اور بھی اک مصرعِ تاریخ حاصل ہوگیا | ''یہ رموزِ بیخودی اب رُوحِ اُردو ہو گئی'' |
| | ۱۳ ہجری ۷۹ |

ترجمانِ بیخودی۔ص ۱۶۸

قابلِ احترام قارئین! اب بغیر کسی انتخاب کے علی الاتصال ''ترجمان بیخودی'' کے اشعار ''رموزِ بیخودی'' کے مقابل پیش کرتا ہوں تا کہ قارئین اقبالؒ کے فارسی کلام سے مہر تقوی[1] جے پوری کے اُردو ترجمے کا صحیح طور پر موازنہ کر سکیں۔

| مثنوی رموزِ بیخودی، اقبال | مثنوی ترجمانِ بیخودی، مہر تقوی |
|---|---|
| اے ترا حق خاتم اقوام کرد | اے کہ تو ہی خاتمِ اقوام ہے |
| برتو ہر آغاز را انجام کرد | تجھ پہ ہر آغاز کا انجام ہے |
| ----- | |
| اے مثالِ انبیا پاکان تو !! | انبیا سیرت ترے ابرار ہیں |
| ہم دگر دِلہا جگر چاکان تو !! | تیرے عاشق خلق کے غمخوار ہیں |
| ----- | |
| اے نظر بر حُسنِ تر سا زادۂ | مُغ بچوں کے حُسن پر تیری نظر |
| اے ز راہِ کعبہ دور اُفتادۂ | پائے کعبہ کس طرف اور تو کدھر؟ |
| ----- | |
| اے فلک مُشتِ غبارِ کوئے تو | آسماں ہے تیرے کوچے کا غُبار |
| اے تماشا گاہِ عالم روئے تو | تیرا چہرہ سیر گاہِ روزگار |
| ----- | |

---

[1] والدِ گرامی فاضل مقالہ نگار (ادارہ)

ہمچو موج، آتش بتہ پا می روی — موج آسا بیقرارِ آرزو !!
تو کجا بہرِ تماشا می روی — ہائے کس کی دید کی طالب ہے تو

-----

رمزِ سوز آموز از پروانہ — سیکھ پروانے سے رمزِ سوزِ جاں
در شرر تعمیر کن کاشانہ — تو شراروں میں بنا اپنا مکاں

-----

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش — دِل میں پیدا عِشق بے اندازہ کر
تازہ کُن با مُصطفےؐ پیمانِ خویش — مُصطفےؐ کے ساتھ عہدِ تازہ کر

-----

خاطرم از صحبتِ ترسا گرفت — صُحبتِ ترسا سے میرا دِل ہٹا
تا نقابِ روئے تو بالا گرفت — جب سے تیرا پردۂ محمل ہٹا

-----

ہمنوا از جلوۂ اغیار گفت — ہمنوا دِل باختہ اغیار کا
داستانِ گیسو و رُخسار گفت — قِصہ خواں ہے گیسو و رُخسار کا

-----

بر درِ ساقی جبیں فرسود او — ہے درِ ساقی پہ سراس کا نگوں
قصۂ مُغ زادگاں پیمود او — مُغ بچوں کے حُسن کا اس کو جنوں

-----

من شہیدِ تیغ ابروے توام — میں ہوں تیری تیغِ ابرو کا شہید
خاکم و آسودۂ کوئے توام — خاکِ درِ تیری ہوں، یہ ہے میری عید

-----

از ستائش گستری بالاترم — مدح گوئی سے ہوں میں بالا کہیں
پیشِ ہر دیواں فرو ناید سرم — سامنے ہر میر کے جھکتا نہیں

-----

| | |
|---|---|
| از سخن آئینہ ساز م کردہ اند | ہوں سخن کا فطرتاً آئینہ ساز |
| وز سکندر بے نیازم کردہ اند | فیضِ اسکندر سے یکسر بے نیاز |

-----

| | |
|---|---|
| بارِ احساں برنتا بدگردنم !! | بارِ احساں سے مری گردن کو ننگ |
| در گلستاں غنچہ گرد دامنم ! | فیضِ گلشن سے مرے دامن کو ننگ |

-----

| | |
|---|---|
| سخت کوشم مثلِ خنجر درجہاں | ہوں جہاں میں مثلِ خنجر سخت کوش |
| آب خود می گیرم از سنگِ گراں | اور، ہوں سنگِ گراں سے آب نوش |

-----

شاعرِ مشرق نے ''رموزِ بیخودی'' میں بطور ''تمہید'' بعنوان ''در معنی ربطِ فرد و ملّت'' اپنی مثنوی ''رموزِ بیخودی'' کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ حیاتِ ملّی کا تقاضۂ معراج یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد ایک مخصوص آئین کی پابندی سے اپنے جذبات ورجحانات کی حدیں مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا اختلاف دُور ہو کر ساری قوم میں یکسانیت، وحدت اور اشتراکِ عمل وقول پیدا ہو جائے۔ یقین کیجیے اگر اقبالؒ کا یہ پیغام اردو ترجمے کے ساتھ عام ہو جائے تو یومِ عاشور (۱۰ محرم الحرام ۱۴۳۵ ہجری) پر راجہ بازار راولپنڈی کا سانحہ یا اسی قسم کے دیگر سانحات جو اکثر و بیشتر ملک میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ، اور جو دیگر فتنے جنم لیتے ہیں ان میں خاطر خواہ کمی ہوسکتی ہے۔ لیکن افسوس! آج پیغامِ اقبال بقول افضل قرلوی ''مَاءُ الدَّاکِدْ'' بن کر رہ گیا ہے۔ اس کو شدید تحریک کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ! کوئی ایسا مجاہد ہمیں عطا فرمائے جو اقبال کے کام پر تنقیحی نظر بھی ڈالے اور اس کے ضروری التکمیل مقاصد و مطامحِ نظر کے شایاں، تتمیم و توسیع بھی فرمائے۔ ان احساسات کے ساتھ اقبالؒ کی فارسی مثنوی ''رموزِ بیخودی'' کی ''تمہید'' مع مہر تقوی جے پوری کے اردو ترجمے کے مطالعہ فرمائیں۔ یہ بھی بلا انتخاب ہے۔

## در معنیٔ ربطِ فرد و ملّت

| مثنوی رموزِ بیخودی اقبال | مثنوی ترجمانِ بیخودی مہرؔ تقوی |
|---|---|
| فرد را ربطِ جماعت رحمت است | رَبطِ مِلّت ، فرد کا ہے حُسن حال |
| جوہرِ اُو را کمال از مِلّت است | اس کے جوہر کو ہے مِلت سے کمال |

-----

| | |
|---|---|
| تاتوانی باجماعت یار باش | تا بہ امکاں یار ہو مِلّت کا تُو ! |
| رونق ہنگامۂ احرار باش | گلشنِ احرار کو دے رنگ و بُو |

-----

| | |
|---|---|
| حرزِ جاں کُن گفتۂ خیر البشرؐ | حرزِ جاں کر پندِ شاہِ بحروبر |
| ہست شیطاں از جماعت دور تر | ”ہیں جماعت سے شیاطیں دُور تر“ |

-----

”بحرِ رَمَل مُسدّس“ کی مختصر بحر میں بڑے بڑے مطالب کے حامل چھوٹے چھوٹے مصرعے اور ان کے الفاظ سلیقے اور مہارت کے ساتھ موتیوں کی طرح پروئے ہوئے۔ کہیں کہیں ایک ایک مصرع میں ایک ایک صفحے کا مضمون۔ گویا دریا کوزوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال: تو صاحبِ کمال تھے ہی۔ مترجم نے بھی وہی صنّاعی دکھائی ہے۔ جس مظاہرہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں کیا تھا۔ دیکھیے:

| اقبالؒ نے رمُوزِ بیخودی میں بزبان فارسی کہا | مہرؔ تقوی بے پوریؒ نے بزبان اردو کہا |
|---|---|
| تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما | ایک ہی ترکش کے ہم سب ، تیر ہیں |
| یک نُما یک بیں یک اندیشیم ما | یک نُما، یک بِیں ویک تدبیر ہیں |

-----

ما زِ نعمتہائے اُو اخواں شدیم  نعمتِ توحید سے اِخواں ہیں ہم
یک زبان و یک دِل و یکجاں شدیم  یک زباں و یک دل و یک جاں ہیں ہم

-----

مہرؔ تقوی جے پوریؒ نے رموزِ بیخودی کے ترجمے، ترجمانِ بیخودی میں بھی ترجمہ کے حسن کو برقرار رکھا ہے

**اقبال نے فارسی میں کہا  مہرؔ تقوی جے پوریؒ نے اردو ترجمہ میں کہا**

تو ہمی خواہی مرا آقا شوی  تیری خواہش ، تو مرا آقا بنے
بندۂ آزاد را مولا شوی  بندۂ آزاد کا مولا بنے

-----

بے نیازی ناز ہا دارد بسے  بے نیازی میں ہزاروں ناز ہیں
نازِ اُو انداز ہا دارد بسے  ناز میں بے انتہا انداز ہیں

-----

گزشتہ برس حضرت علامہ کے یوم ولادت پر ایک ٹیلی وژن چینل کو اپنے انٹرویو کے موقع پر راقم الحروف نے علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت بھی کہی جو نذر قارئین ہے:

(الف) "چشم عطا، فیض نُورِ مُحمّد سے اِقبال آیا"

۷۷ عیسوی ۱۸

(ب) "سالِ تاریخ ولادتِ اِقبال"

۷۷ عیسوی ۱۸

(ج) "جَزَاکَ اللّٰہِ فِی الدّارین خَیراً"

۹۴ ہجری ۱۲

اقبال کی باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز ۱۸۹۳ء سے ہوتا ہے جو ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس دور میں داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ داغؔ سے رومیؔ تک کے سفر کے دوران اقبال تاریخ گوئی

بھی کرتے رہے ہیں۔ اُن کے اس رُخ پر کسی کی توجہ ہی نہیں ہے یہ فنِ تاریخ گوئی کی مظلومیت ہے کہ اس فن کو ادب سے ایسے نکالا جا رہا ہے جیسے دودھ سے مکھّی۔ حالانکہ اقبال نے نہایت عُمدہ تاریخیں کہی ہیں مثلاً

(الف) کتبہ بردروازۂ مسجدِ مُلحق درگاہِ داتا بخش صاحبؒ لاہور:

سالِ بنائے حرمِ مومناں
چشم بہ "المسجد الاقصیٰ" فگن
+ ۳۷۰

خواہ از جبریل و از ہاتف مجو
"الذی بارکنا" ہم بگو
۹۶۹ = ۱۳۳۰ھ

-----

(ب) ۱۹۳۷ء میں سَر راس مسعود کی دُختر "نادرہ مسعود" کی ولادت پر قطعۂ تاریخ کہا آخری شعر یہ ہے:

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
"باسعادت دخترِ مسعود ہے"
۱۹ عیسوی ۳۷

-----

علامہ اقبال کی وفات پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور وفاتِ اقبال کو لفظوں میں یادگار بنانے کے لیے بہت سے شعراء نے قطعاتِ تاریخِ وفات کہے۔ اُن میں سے چند پیش ہیں۔

(الف) حضرت شاد جے پوریؒ (وفات: ۱۹۶۰ء) نے قطعۂ تاریخ کہا۔ جس کے ہر مصرع سے وفاتِ اقبالؒ سنہ عیسوی یا سنہ ہجری برآمد ہوتا ہے صرف ایک شعر قارئین کی نذر ہے:

"تجھ کو اے اقبالؒ تھا ادراکِ قوم"
۱۳ ہجری ۵۷

"تو ہی تھا اے محترم! قربانِ ہند"
۱۹ عیسوی ۳۸

-----

(ب) حضرتِ حفیظ ہوشیارپوری مرحوم نے کئی تاریخیں کہیں۔ ایک تاریخ خود اقبال کے مصرع سے حاصل کی:

"صدق و اخلاق و صفا باقی ماند"
۱۳ ہجری ۵۷

ان تاریخی منظوم نذرانہ ہائے عقیدت کے علاوہ اَن گنت سادہ منظومات بھی نذرِ اقبال کیے گئے۔ بطور نمونہ منظوم نذرانہ عقیدت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (مؤلف فکرِ اقبالؒ) ملاحظہ ہو::

دُنیا سے گیا، دِل سے گزرتا نہیں ہرگز — اس صفحے سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز
جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی — عالم کے جریدے پہ ترا نام ہے باقی

-----

## قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجود ''الاقربا'' کی سطور میں حرفی ولفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے مسودات پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔ ہم ازحد ممنون ہوں گے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

## محمد رضا انصاری، فرنگی محل لکھنؤ (انڈیا)

# یگانہ سے متعلق کچھ یادیں

یہ میری پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہے جب مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی لکھنؤ میں بعض اساتذۂ لکھنؤ کے مقابلہ میں خُم ٹھوکے ہوئے تھے مگر میرے بزرگانِ خاندان سے خاص طور پر میرے خسر مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی متوفی ۱۹۳۵ء شاگرد امیر مینائی سے یاس صاحب کے تعلقات تھے ان تعلقات کی نشانی وہ چند کتابیں ہیں جو مرزا صاحب نے لکھنؤ کو خیرباد کہتے ہوئے اونے پونے دوستوں کے ہاتھوں فروخت کی تھیں جن پر مرزا صاحب کے دستخط ''مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی'' ہیں۔

اس زمانہ میں انھوں نے بعض لکھنوی اساتذہ کو اتنا چڑایا تھا کہ ان کے شاگردوں نے لکھنؤ میں ان کا رہنا دوبھر کر دیا جس کی تفصیل خود انھوں نے بھی لکھی ہے اور میں نے اپنے بڑوں سے بھی سنی ہے کبھی کبھی ان حالات سے پناہ لینے وہ فرنگی محل میں پناہ گزیں رہا کرتے تھے۔

لکھنؤ سے نکل کر اور مختلف مقامات پر بستے بساتے وہ ریاست نظام میں ملازم ہو گئے ان سے میرا پہلا غائبانہ تعارف ان کی کتاب ''غالب شکن'' کے ذریعہ ہوا۔ اب وہ یگانہ چنگیزی بن چکے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے ہمارے ایک بزرگ کو بھیجی تھی اس میں ان کی تصویر بھی تھی۔ جس کے تیور ان کے ہی اس شعر کے ترجمان تھے

جفائے پنجۂ خوں خوار سے جو بس نہ چلے تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

------

اُس زمانہ میں لکھنؤ کی مذمت میں ان کی یہ رباعی بھی سننے میں آئی تھی دوسروں کی زبانی:

پڑھ لے یوں ہی وضو کی ایسی تیسی بیکار کی شُست و شُو کی ایسی تیسی

کس کام کا گومتی کے پانی سے وضو     ہت تیرے لکھنؤ کی ایسی تیسی

------

اس سے قبل اپنے ایک بزرگ کی زبان سے ان کی ایک غزل سننے میں آئی تھی جو قیام لکھنؤ کے زمانہ کی تھی، اس وقت تک یاس تخلص تھا۔ مطلع یہ تھا:

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے     بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

مزاریاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے     دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

------

اُس زمانے میں لکھنؤ، دہلی وغیرہ کے بیشتر ممتاز شعراء فرنگی محل ضرور آتے تھے، زیادہ تر اپنے دیوان خانے ہی میں ان کی زیارت کے مواقع مجھے ملتے رہے، مگر یگانہ کو کبھی نہیں دیکھا اور ایسے شاعر کو دیکھنے کا خاص شوق تھا، غالباً ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد سے لکھنؤ آئے اور فرنگی محل اپنے جاننے والوں سے ملنے آئے، مجھے ان سے ملایا گیا اس وقت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ شاخ کا سکریٹری تھا۔ رات کو آئے تھے اور اس رات فرنگی محل میں ایک مختصر شعری صحبت ہونے والی تھی حفیظ جالندھری کے اعزاز میں یگانہ صاحب اس صحبت میں سامع کی حیثیت سے شریک ہونے پر بمشکل آمادہ ہو گئے مگر بے حد اصرار پر غزل سنانے پر مروتاً آمادہ ہوئے۔ سوٗ اتفاق ایسی بات ہو گئی تھی کہ یگانہ کی نظروں کے سامنے اپنا لکھنؤ کا وہ زمانۂ قیام آ گیا جس کی یاد ان کے لیے سبب اشتعال بن جایا کرتی تھی۔

غالب کی مشہور غزل ''کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو'' کا حوالہ دے کر اسی زمین میں اپنی غزل یہ کہہ کر شروع کی: ''ملاحظہ فرمائیں کہ مرزا غالب نے کیا کہا ہے اور میں نے کس طرح اس زمین کو استعمال کیا ہے۔''

مطلع پڑھا

بہار زندگی ناداں، بہار جاوداں کیوں ہو     یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرام جاں کیوں ہو

------

ایک نوجوان سامع نے سرگوشی کے انداز میں مزاحاً اپنے نوجوان ہم نشین سے کہا:
"اچھا نہیں کہا ہے" وہ تو انھوں نے نہ سنا ہوگا مگر اس پر ہم نشین کی ہنسی انھوں نے دیکھ لی۔ بیاض بند کی اور تیکھے تیوروں سے اُدھر گھورتے ہوئے نشست گاہ سے اتر کر چپ بیٹھ گئے، بڑی مشکل سے منایا گیا اور غزل سنی گئی۔ شعر پڑھا:

کہیں رسمی عبادت، روح کو بیدار کرتی ہے نماز بے عمل سے حق مذہب رایگاں کیوں ہو

------

اسی غزل میں یہ شعر بھی تھا:

کہاں وہم و خیال اتنے حقائق ہر طرف بنتے نگاہ نارسا! یہ نقد فطرت رایگاں کیوں ہو

------

غزل کے بعد حاضرین کو متنبہ کیا:

"لکھنؤ والوں کو جائز طور پر مجھ پر ہنسنے کا موقع انشاء اللہ کبھی نہیں ملے گا"

دوسرے سال ۴۴ء میں جب فرنگی محل آئے تو میں نے ان کی غزل کی جو دہلی ریڈیو کے مشاعرے سے نشر ہو چکی تھی تعریف بھی کی تھی۔

میں سمجھ لوں گا دوست سے تُو کون مجھے رہ رہ کے تاننے والا
حسن کافر گناہ کا پیاسا بے گناہوں کو سانٹنے والا
چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے میں کہاں ہار ماننے والا

------

اس غزل کی تعریف یا مجنوں گورکھپوری نے کی ہے دوسرے آپ ہیں اور پھر وہی ہنسی ہنسے کہنے لگے "بعض نکتہ چینوں نے اس شعر کو فحش قرار دیا ہے 'چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے' میں کہاں ہار ماننے والا میں نے سیاست دانوں پر چوٹ کی ہے مخالفین اسے فحش بتاتے ہیں"

اس کے کچھ دنوں کے بعد یگانہ کا ایک پوسٹ کارڈ میرے نام آیا، سننے کے لائق ہے بسم اللہ یا ۷۸۶ کی جگہ لکھا تھا "ادب جدید تھو"

پھر یہ اشعار تھے:

سنترے رس بھرے کرارے گول نیتیں کیوں نہ ہوں گی ڈانواں ڈول
حسن وعصمت کی اب وہ قدر کہاں کیوں نہ بک جائے کوڑیوں کے مول

پوسٹ کارڈ کی پشت پر)

مائی ڈیر رضا صاحب! سلام علیکم۔ میں بحمداللہ بخیریت ہوں میز پر یہ پوسٹ کارڈ پڑا تھا میں نے کہا اس سے کچھ کام لینا چاہیے چنانچہ چند اشعار آپ کی تفریح طبع کے لیے بھیجتا ہوں۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب اور ان کے بھائی کیا نام ہے؟ مولوی ارادۃ اللہ صاحب اور دیگر یاد فرماؤں کی خدمت میں سلام شوق حکیم سید محمد قاسم صاحب سے ملاقات ہو تو بہت بہت سلام کہیے۔ راقم مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

غوری منزل حیدر گوڑہ حیدرآباد دکن ۲۴ مئی ۴۴ء

جولائی ۴۴ میں کل ہند اردو کانگرس حیدرآباد دکن میں ہوئی، اس میں شرکت کے لیے گیا معلوم ہوا کہ یگانہ اس شہر میں ہیں۔ اردو کانگرس کے آخری دن کل ہند مشاعرہ ہوا جسے حیدرآباد ریڈیو نے ریلے کیا جب اس میں یگانہ صاحب کو نہیں دیکھا تو ان کی قیام گاہ معلوم کر کے بعد مغرب ملنے گیا وہ ایک بڑے سرکاری عہدیدار کے بنگلے میں گیٹ سے ملے ایک سرونٹس کواٹر میں سائبان کے تلے خاموش کرسی پر بیٹھے تھے خوش ہوئے، مشاعرہ سن چکے تھے کہنے لگے "صاب کتنا پھسپھسا مشاعرہ تھا کسی کی بھی غزل نظم نہیں چلی سوائے جگر کی غزل کے اور تو کچھ سننے والا تھا ہی نہیں خیر جگر صاحب نے اپنے مقام کو باقی رکھا"

سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ میں بالآخر مقیم ہو گئے، بال بچے پاکستان جا چکے تھے اکیلے رو رہے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں یہاں ہی ان کا جلوس شہر میں اس طرح نکلا کہ وہ گدھے پر سوار کیے گئے، منہ کالا کیا گیا، راستہ میں جلوس والے ان پر تھوکتے بھی جاتے تھے۔

ہماری قریب والی سڑک وکٹوریہ اسٹریٹ سے یہ جلوس گزرا چھٹی کا دن تھا اور ۹۔۱۰ بجے دن کا وقت مجھے "مژدہ" سننے کو ملا کہ ایسا جلوس ابھی گزرا ہے میں ایک مقامی اخبار کا اسٹاف رپوٹر

تھا، خبر لینے لپکا پوچھتے پاچھتے کہ کدھر جلوس گیا ہے؟ اسی طرف چل پڑا، ایک جگہ معلوم ہوا کہ پولیس آگئی تھی وہ سب جلوس والوں کو پکڑ لے گئی ہے پولیس بھی یوں آئی کہ میرے ساتھی اور اس وقت نیشنل ہرالڈ کے اسٹاف رپوٹر صلاح الدین عثمان صاحب نے یہ جلوس دیکھ کر کوتوال شہر کو بذریعہ فون اطلاع کردی تھی، وزیر گنج تھانے کی پولیس آئی تھی وہاں ہی سیدھا پہنچا جلوس والوں کی رپورٹیں لکھی جارہی تھیں یگانہ وہیں تخت کے کونے پر بیٹھے تھے منہ دھل چکا تھا مگر کانوں کے قریب سیاہی لگی رہ گئی تھی اور شیروانی جو وہ پہنے ہوئے تھے پان کھانے والوں کے تھوکنے سے داغدار تھی، بالکل حواس باختہ تھے بمشکل مجھے پہچانا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا " رضا صاحب ایک مشورہ چاہتا ہوں آپ سے۔ یہاں سے میں کہاں جاؤں؟ فرنگی محل بھی جا سکتا ہوں مگر اس وقت کسی مسلمان کے یہاں جانا ٹھیک نہیں۔ آنند نرائن ملا کے یہاں آپ کے خیال میں میرا چلا جانا اس کے لیے کسی پریشانی کا سبب تو نہ بنے گا۔"

میرے کہنے پر کہ آپ گھر ہی واپس جائیں بولے نہیں نہیں یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے تھانہ انچارج سے میں نے یگانہ صاحب کا اندیشہ بتایا اس نے دو کانسٹبل ان کے گھر کی حفاظت کے لیے لگا دیئے۔

اخباروں میں " نہ صرف مقامی بلکہ تمام قومی اخباروں میں اس جلوس کی خبر چھپی۔ یوپی اسمبلی کا اجلاس چل رہا تھا وہاں توجہ مبذول کرانے والا سوال اٹھایا گیا۔

مگر اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوئی جب چار پانچ روز کے بعد ایک امریکن میگزین کے نامہ نگار خصوصی مقیم دہلی جو بنگالی تھے میرے ایک مہربان وشنودت ٹائمز آف انڈیا دہلی کے نمائندہ مُقیم لکھنؤ کا سفارشی خط لے کر گھر آئے کہ ان کو یگانہ صاحب سے ملا دیا جائے۔

سعادت گنج تھانے کے علاقے میں یگانہ صاحب کا مکان گلیوں کے اندر تھا سوچا کہ پہلے تھانے میں صحیح پتہ معلوم کر لیا جائے ہم دونوں پہلے تھانے ہی پہنچے دیکھا کہ تھانے کے گیٹ پر سفید چادر اوڑھے یگانہ صاحب بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وزیر گنج تھانے سے گھر جانے کے

بجائے سعادت گنج تھانے میں رہ رہے ہیں اور کہا ''یہاں تھانے والوں نے خدا ترسی میں ایک کھٹیا دیدی ہے۔''

امریکن میگزین کے نمائندہ نے اپنے کیمرے سے دھڑا دھڑ ان کے فوٹو لینا شروع کر دیے اس نے مجھ سے کہا میں کچھ سوالات بھی کرنا چاہتا ہوں، یگانہ صاحب سے اس کا ارادہ بتایا کہنے لگے یہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسا دیں گے'' اس نے سوالات سینکڑوں کر ڈالے مگر واقعہ جلوس سے متعلق ایک سوال بھی نہیں پوچھا، ان کے عقیدے کے بارے میں جب اس نے پوچھا تو بہت سٹپٹائے مگر جواب دیا ''میں محمدی ہوں کبھی کبھی نماز پڑھتا ہوں مسجد نہیں جاتا۔''

اپنے مذکورہ پوسٹ کارڈ میں جن حکیم سید محمد قاسم صاحب کو بہت بہت سلام لکھا تھا وہ لکھنؤ کے ایک نامور اور خاندانی طبیب حکیم صاحب عالم کے عرف سے مشہور تھے۔ بڑے راسخ العقیدہ مگر بڑے فراخ دل، ادب سے شغف، ادیبوں سے محبت، پابند صوم وصلوٰۃ، متقی پرہیزگار، جوش صاحب سے بھی گاڑھی چھنتی تھی وہ ان کے گھر میں بھی اپنا شغل کرتے تھے حکیم صاحب ترقی پسند ادب کا مذاق بھی تہذیب وشائستگی کے ساتھ اڑاتے تھے مگر ماہنامہ 'نیا ادب' کو جب ایسی مالی دشواری پیش آجاتی کہ پریس کا بل ادا نہ کرنے پر وہ رسالہ باہر نہیں آپاتا تھا تو حکیم صاحب عالم سے میں رجوع کرتا ایک بار تو انھوں نے عیدالاضحیٰ میں قربانی کے جانور خریدنے کے لیے جو رقم اپنے دواخانے کے منیجر عبدالعزیز کے پاس رکھوائی تھی، میری درخواست اعانت پر اس میں سے رقم دلوائی عبدالعزیز نے مجھ سے یہ بتایا وہ میرا جاننے والا تھا۔

جوش صاحب دہلی سے آتے تو حکیم صاحب عالم کے یہاں اکثر قیام کرتے یگانہ صاحب کے بھی وہ قدر دان تھے۔ جلوس سے پہلے کی بات ہے جوش صاحب آئے ہوئے تھے حکیم صاحب نے مختصر شعری نشست کی جس میں یگانہ صاحب بھی مدعو تھے۔ یگانہ نے جو غزل پڑھی اس کے دو شعر یاد سے لکھے جا رہے ہیں:

نگاہِ شوق کی گرمی خدا کی قدرت ہے — مزے پر آہی گیا حسن نارسیدہ سہی

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی

---

حکیم صاحب عالم نے دوسرے شعر پر مجھ سے فرمایا "دیکھو ملحدانہ باتیں کہنے کے لیے بھی شاعرانہ انداز چاہیئے" یہ نشست حکیم صاحب عالم کے دیوان خانہ میں ہوئی تھی یہ گھر اب شیعہ کالج سٹی برانچ ہو گیا ہے۔

دوسرے دن جوش صاحب کے ساتھ تانگے پر ہم لوگ سید صدیق حسن آئی سی ایس کے یہاں جا رہے تھے، جوش صاحب نے کل یگانہ کے شعروں کی خوب داد دی تھی ان ہی کا تذکرہ میں نے چھیڑ دیا اور یہ کہا یگانہ کی شاعری کا وہی حال ہے کہ اس کا بلند شعر بغایت بلند ہوتا ہے اور بعض شعر بغایت پست (میرے ذہن میں ان کے پوسٹ کارڈ کے اشعار تھے) جوش صاحب نے کہا: "اس کا پہلا جز یعنی بغایت بلند) ان پر صادق نہیں آتا"۔

جلوس والے واقعہ کے بعد یگانہ صاحب رشتے کی ایک سالی کے یہاں رہنے لگے تھے دمہ کے مریض تھے، لکھنؤ ریڈیو کے ایک مشاعرے میں جوان کے لیے آخری تھا پکڑ کر لائے گئے میں نے بڑھ کر مزاج پوچھا کہنے لگے میں نے آپ کو اور احتشام کو خطوط لکھے تھے کسی نے جواب دینے کی زحمت نہ کی۔

ان کا مجھے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ میں نے اظہار افسوس کیا، تو بولے

کبھی کبھی پوچھ لیا کیجیے، میری اب حالت ایسی ہو گئی ہے کہ پوچھتے رہنے کی ضرورت ہے زیادہ دنوں آپ کو تکلیف نہیں دوں گا، بدقسمتی سے ان کو پوچھنے کے بجائے ان کی وفات کی تصدیق کرنے مجھے ان کی قیام گاہ پر جانا پڑا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ان کی تعزیت کی خبر اخبار کے دفتر آئی میں نے تصدیق کرنے لیے کئی واقف کاروں کو فون کیا تقریباً سب ہی نے لاعلمی ظاہر کی۔ جس محلے میں وہ رہتے تھے وہ مسلمانوں کا محلہ تھا مگر میں اس گھر میں بھی گیا نہیں تھا محلے میں جا کر گھر دریافت کرنا پڑا نام سے سب ہی ناواقف نکلے جب یہ پوچھا کہ آج یہاں جس گھر میں غمی ہوئی ہے وہ کون سا ہے؟ ایک بھینس والے نے کہا "وہ بڈھا جو کل مرا ہے؟ وہ مکان یہ ہے"

اندر سے کسی خاتون نے آڑ سے بات چیت کی، یہ بتایا کہ میت لے جانے اور نماز جنازہ پڑھنانے پر کوئی تیار نہ تھا پھر خاتون نے کہا "مگر سب ہی ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں آپ ہی ہیں رات کو ڈھونڈ ھتے ڈھانڈ تے آ گئے ہاں میاں وہ تو اچھی جگہ جا چکے ان کا معاملہ ان کے اللہ میاں کے ساتھ ہے مگر بہت دکھ جھیلے مرنے والے نے۔"

مقامی اخباروں میں تو وفات کی خبر شائع ہو گئی مگر قومی پریس میں اس کو کوئی جگہ نہ ملی وہی پریس جو جلوس کی خبر کی تشہیر میں پیش پیش تھا۔

تیسرے دن میں علی گڑھ گیا اور سرور صاحب سے ملنے ان کے شعبہ میں حاضر ہوا، اور باتیں ہوئیں، مثلاً اردوئے معلّیٰ کا آج جلسہ ہے آپ بھی شریک ہوں وغیرہ وغیرہ، اندازہ ہو گیا یہاں بھی یگانہ کی خبر نہیں پہونچی ہے، میں نے ہی سنائی۔ سرور صاحب چونک پڑے اور سیدھے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو سانحے کی خبر دینے چلے گئے۔

------

---

نوٹ: ہم محترم مراسلہ نگار سے معذرت خواہ ہیں کہ ہمیں چند اشعار اور ایک نہایت مختصر عبارت کو بوجوہ حذف کرنا پڑا ہے۔ (ادارہ)

## شاکر کنڈان

# شاعرِ شباب ۔۔۔ الطاف مشہدی

بھاٹی گیٹ لاہور میں مجلس احرار کا جلسہ تھا۔ عطاءاللہ شاہ بخاری سٹیج پر براجمان تھے سڑک پر اُن کی نظر تھی۔ وہ یکدم اٹھے اور آگے بڑھ کر سڑک پر جاتے ہوئے ایک تانگے کو روک لیا۔ اس تانگے میں کوچوان کے علاوہ ایک بھاری بھرکم شخصیت بیٹھی تھی۔ مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری نے اس شخص کو بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ سٹیج پر لے آئے۔ ان دنوں دو نظمیں بڑی مشہور تھیں ایک کا نام ''ترانۂ مستی'' اور دوسری نظم ''اقبال کا پیغام'' تھی عطاءاللہ شاہ بخاری نے اُس شخصیت سے درخواست کی کہ ''اقبال کا پیغام'' مجمع کو سنائیں۔ اُس شخص نے تحت اللفظ مطلوبہ نظم پڑھی اور ایک سماں باندھ دیا۔

کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں تحت اللفظ دو شخصیات ہی سٹیج پر شعر پڑھنا جانتی تھیں۔ اُن میں سے ایک نفیس خلیلی تھے اور دوسرے الطاف مشہدی۔ اور یہ شخصیت الطاف مشہدی تھے جن کی مذکورہ بالا دونوں نظمیں معروف تھیں۔ بقول پرویز بزمی:

''الطاف مشہدی جب نظم سُنا چکے تو سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اٹھ کر انہیں گلے لگالیا اور اُن کا منہ چومنے لگے جب کہ الطاف مشہدی کے منہ سے شراب کی بو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔''[1]

الطاف مشہدی بے تحاشا پینے والوں میں سے تھے اور پرویز بزمی کو کئی بار سفر وحضر میں اُن کے ساتھ رہنے کے مواقع ملے بلکہ ایک واقعہ تو وہ ایسا بتاتے ہیں کہ

''ایک مشاعرہ سے واپسی پر رات فیصل آباد ایک ہوٹل میں رُکنا پڑا تو جو معاوضہ ملا تھا وہ الطاف صاحب نے شراب میں اڑا دیا اور پھر یہ حالت ہوئی کہ انہیں ٹیکسی پر بے ہوشی کی حالت میں سرگودھا لانا پڑا۔''[2]

چونکہ جوش ملیح آبادی بھی کثرتِ مے نوشی میں بہت مشہور تھے۔ایک بار انہوں نے شراب چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا۔الطاف مشہدی اُن کے ہم مشرب تھے اور انسان کو غلطی کا پتلا سمجھتے تھے لہٰذا جوش صاحب کا یہ اعلان انہیں برا عجیب لگا جس پر انہوں نے لکھا کہ

اے فرشتے لوٹ کر آجا کہ تُو انسان ہے ۵

بہر حال الطاف مشہدی کی شخصیت اور شاعری دونوں ساتھ ساتھ رواں دواں رہیں۔اور متوازی کے علاوہ ایک دوسرے کے لیے آئینہ تھیں۔ایک میں سے دوسرا عکس صاف نظر آتا تھا۔ اور کہیں بھی کوئی بُعد دکھائی نہیں دیتا تھا۔

الطاف مشہدی کا نام الطاف حسین اور آپ سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔الطاف مشہدی کی تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش میں کہیں کہیں اختلاف دیکھنے میں آیا ہے۔پروفیسر محمد اسلم کے مطابق ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے ۶ الطاف مشہدی کے شعری مجموعے "داغ بیل" ۷ "شاخِ گل" ۸ محمد شمس الحق کا انتخاب "گلہائے رنگ رنگ" ۹ "تذکرہ ماہ و سال" ۱۰ "ہمارے اہل قلم" ۱۱ "اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر" ۱۲ "سخنورانِ سرگودھا" ۱۳ اور "نعت گویانِ سرگودھا" ۱۴ وغیرہ میں متفقہ طور پر تحریر ہے کہ "۱۰ فروری ۱۹۴۱ء" کو پیدا ہوئے۔تاریخ پیدائش کی بات چلی ہے تو ایک اور اختلاف جو سامنے آتا ہے وہ ہے آپ کی قبر کا کتبہ، جس پر بوقتِ وفات آپ کی عمر ۶۴ سال تحریر ہے ۱۶

آپ کی وفات چونکہ ۲۴ جون ۱۹۸۱ء بروز بدھ رات ۱۰ بجے ہوئی تھی۔سو ۱۹۸۱ء سے ۶۴ کو منہا کیا جائے تو سنِ پیدائش ۱۹۱۷ء بنتا ہے۔یوں وفیاتِ مشاہیر پاکستان میں محررہ تاریخ صحیح ثابت ہوتی ہے۔لیکن کتبہ پر لکھے ہوئے ایسے ہندسے کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ وہ ہندسے بعد میں تحریر کیے جاتے ہیں جس میں مرحوم خود تصحیح نہیں کر سکتا۔اور الطاف مشہدی کی قبر پر لگا ہوا یہ کتبہ اُس کی وفات کے نجانے کتنے عرصہ بعد ان کے داماد نے لگوایا تھا۔اور وفیاتِ مشاہیر پاکستان میں تحریر سن اسی کتبے کے حوالے سے نکالا گیا ہے۔ہارون الرشید تبسم نے سنِ وفات ۱۹۸۰ء

۱۷؎ لکھا ہے جسے نہ تو کسی محقق نے تسلیم کیا ہے اور نہ ہی قبر کے کتبے سے وہ سن میل کھاتا ہے۔ البتہ اُن کا یہ کہنا کہ "انہوں نے ۶۶ سال تک غم دوراں اور غم جاناں کا مقابلہ کیا" تو اس حساب سے انہوں نے سنِ پیدائش ۱۹۱۴ء کو درست ثابت کر دیا ہے۔ چونکہ اکثریت کی رائے الطاف حسین نام اور ۱۰ فروری ۱۹۱۴ء تاریخ ولادت پر متفق ہے لہٰذا اسے ہی درست تسلیم کیا جاتا ہے اور چونکہ الطاف مشہدی نے بھی اپنی تصانیف کے ابتداء میں یہی لکھا ہے سو اس سے اختلاف کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح آپ کی پیدائش کس شہر ہوئی۔ یہ بھی قابلِ غور ہے۔

اوپر دیئے گئے حوالوں سے ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہے کہ الطاف مشہدی "آلومہار شریف" ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ ان میں سے اکثریت نے اسی کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ سوائے مالک رام کے۔ جس نے مقامِ پیدائش چک نمبر ۱۰۱ جنوبی ضلع سرگودھا ۱۸؎ تحریر کیا ہے۔ لیکن پرویز بزمی کا کہنا ہے کہ "الطاف مشہدی چک شیخ چوگانی ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔" ۱۹؎

الطاف مشہدی کا تعلق "شیخ چوگانی" سے کسی حد تک تو تھا۔ لیکن ان کا پیدائشی تعلق تحریری طور پر اس گاؤں کے ساتھ کہیں سے بھی ثابت نہیں۔ ممکن ہے الطاف کی نظم "شیخ چوگانی" یہاں بھی شکوک کا باعث بنی ہو۔ اس نظم کے چند خوبصورت اشعار:

شیخ چوگانی سپہرِ حسن کا وہ آفتاب — شیخ چوگانی وہ سجدہ گاہِ دریائے چناب

جس کی پیشانی پہ رقصاں ہے زمانے کا وقار — غازۂ روئے ثریا جس کے تلووں کا غبار

زمزموں کا زیر و بم جس کی رگوں میں تیز ہے — زلفِ موسیقی ہواؤں پر ترنم ریز ہے

نیند کی پریاں نقابِ بے خودی ڈالے ہوئے — حسن کی تابانیوں کو قلب میں ڈھالے ہوئے

بہہ رہا ہے مست دریا نیند میں کھویا ہوا — اک ردائے نیلگوں کی گود میں سویا ہوا

-----

جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو زیرِ تذکرہ ہستی کی اپنی ہی کوئی تحریر معاونت کر سکتی ہے۔ اور اس سلسلے میں الطاف مشہدی رقمطراز ہیں:

''۱۰ جون ۱۹۴۱ء کو چک نمبر ۱۰۰ جنوبی سرگودھا میں پیدا ہوا۔۔۔۔ بچپن میں والدِ محترم کا سایہ اٹھ گیا۔ یتیمی کی گود اور والدہ محترمہ کے سایہ میں پل کر جوان ہوا۔ چک نمبر ۱۱۰ جنوبی ضلع سرگودھا، لالیاں ضلع جھنگ، جامکی ضلع سیالکوٹ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ ادب برائے زندگی کو ادب برائے ادب کے لباس میں پیش کرنا میرا آرٹ ہے۔'' [۲۱]

شاعرِ شباب سید الطاف مشہدی کی اِس تحریر سے ان کی جنم بھومی اور ابتدائی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کا آبائی وطن بلاشبہ آلومہار ضلع سیالکوٹ تھا چونکہ چک نمبر ۱۱۰ جنوبی نزد کڑانہ پہاڑی آپ کے بزرگوں کو کچھ زمین الاٹ ہوئی تھی لہٰذا آپ اسی شہر کے پیدائشی اور باسی تھے۔ آپ نے لڑکپن میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور الم مظفرنگری سے اصلاح لینے لگے لیکن ''شعرستان'' سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کا تعلق شاید سیماب اکبرآبادی سے بھی تھا۔ آپ شروع شروع میں چک نمبر ۱۱۰ جنوبی سے سرگودھا شہر کی ادبی محفلوں میں شمولیت کے لیے تانگے پر آیا کرتے تھے۔ بعد ازاں آپ نے سرگودھا شہر بلاک نمبر ۱۸ میں رہائش اختیار کر لی۔ آپ ابتداء سے ہی حسن پرست واقع ہوئے تھے اور یہی ذوقِ جمالیات آپ کی شاعری میں بھی ظاہر ہونے لگا جو وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا اور بالآخر آپ کو شاعرِ شباب کا نام دے دیا گیا۔ ناقدین اور قارئین نے تو آپ کو یہ نام دیا ہی، آپ نے خود بھی اسے اعزاز سمجھا جس کا اظہار آپ کی نظم ''میرے پری جمال'' میں شاعر شباب کے الفاظ سے ہوتا ہے''

ساقی ! مرے حسین و جواں ساقیا ادھر
گاتی ہوئی نگاہ تو بہکی ہوئی نظر
ساغر اٹھا کہ موسمِ گل ہے شباب پر

مستانہ انکھڑیوں کی جوانی ہے لازوال
میرے پری جمال
میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال
میرے پری جمال

مے خانے کھیلتے ہیں تری انکھڑیوں کے پاس
مجھ کو یہ سہمی سہمی جوانی نہیں ہے راس
الطاف تیرا ہو کے رہے اس طرح اداس

اک جامِ آتشیں کہ طبیعت ہے پُر ملال
میرے پری جمال
میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال
میرے پری جمال

۲۲ -----

"شاعرِ شباب" کی اِس اصطلاح کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے الطاف مشہدی کی شاعری کی مناسبت سے اِن الفاظ میں استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ شاعری آشفتگی محبت کی شاعری تھی۔ سیاست کی ہنگامہ خیزیوں کے پہلو بہ پہلو ایک شاعرِ شباب شاہد کے نغمے الاپ رہا تھا اور جو باتیں رمز و کنایہ میں ادا ہوا کرتی تھیں اس شاعر نے اُن کا کھلم کھلا اظہار کر دیا۔ اس میں سرمستی و سرشاری، رندی و ہوسناکی، فغانِ تنہائی اور شوقِ آوارگی کے سبب چونکا دینے والے عناصر جمع ہو گئے۔" ۲۳

شاعرِ شباب الطاف مشہدی نے سرگودھا کے ادبی ماحول اور اپنے دبنگ لہجے سے ایک مقام بنا لیا تھا اور برصغیر کا کوئی بڑا مشاعرہ اس کی موجودگی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا تھا اور اگر آپ موجود نہ ہوتے تو اس مشاعرے کے فلاپ ہونے کا خدشہ رہتا تھا۔ ان کی شاعری کے دو حصے

ہیں۔ ایک حصہ انقلابیت اور مزاحمت اور دوسرے حصہ میں رومان اور شباب نیز شراب شامل ہیں۔ حالات بدلے حاکموں کو برصغیر کی اقوام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے علیحدہ ریاستیں وجود میں آئیں۔ آزادی کے اس موقع پر جو خون خرابہ ہوا اور الطاف مشہدی نے جو رنگ دیکھا تو شعر میں ڈھل گیا۔

الطاف مشہدی نے ایک ہفت روزہ اخبار ''خلوص'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کامیاب رہا۔ لیکن الطاف صاحب کو اس سے کافی نقصان ہوا۔ بعد ازاں ماہنامہ ''ہم لوگ'' جاری کیا۔ لیکن وہ بھی کامیابی کے باوجود نہ چل سکا۔ تو اس طرح کے حالات نے انہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں وہ تخلیقی بلندی پر ہونے کے باوجود تنہا تھے اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جس سے کچھ عرصے تک اُن کی کوئی تحریر سامنے نہ آئی اِس دوران پرویز بزمی نے ایک قطعہ لکھا۔

کوئی الطاف مشہدی سے کہے ــــ کب تلک ہو گی بے رخی کی جیت
کب سے سونی پڑی ہے بزم سخن ــــ اے شہنشاہِ گیت ، کوئی گیت

-----

تو اس پر الطاف مشہدی نے لکھا کہ ــ اب کوئی گیت گا نہیں سکتا

لیکن اُن کے لیے شاعری اور شراب سے دور رہنا بہت مشکل تھا بقول شاہد بخاری انہوں نے ایک دفعہ شراب بھی چھوڑی تھی۔ راقم کے نام ایک خط میں شاہد بخاری نے لکھا تھا۔

''۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا کے ایک مشاعرہ میں سید حسن عباس زیدی نے ایک نعت پڑھی۔ جسے سُن کر الطاف مشہدی نے شراب کی بوتل توڑ دی تھی۔'' [۲۶]

لیکن اُن کی یہ توبہ بھی شاعری کی چپ واقع ہوئی۔ جس کا عکس ہم اُن کی نظم ''توبہ'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

اگر شراب کو چھوؤں بھی آج سے ناصح — چراغِ حُسن کی لو پر مجھے جلا دینا

کسی حسین کے جادو فروش زانو پر — تھپک کے، نیند قضا کی مجھے سُلا دینا

مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن — تو آبِ خوشۂ انگور سے بجھا دینا

نظر کی، دل کی، جبیں کی، جگر کی، ہونٹوں کی — غرض جو جی میں ترے آئے وہ سزا دینا

اگر شراب کو چھوؤں بھی آج سے ناصح

۲۷ -----

شراب اور شعر اُن کے سکون کا سبب تھے تو شباب اُن کی سوچ اور فکر کا مرکز تھا۔ نیز محبت اُن کے لیے تحرک کا سامان اور جب ہم اُن کی پوری شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے کئی معاشقے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب آپ کو جوش کے بعد شاعری میں دوسرے نمبر پر رکھا جا سکتا ہے تو معاشقوں میں بھی وہ اپنے اس نمبر پر ہمیں برقرار نظر آتے ہیں۔ آپ نے اپنے شعری مجموعہ ''شاخِ گل'' کا انتساب ''فضلاں کے نام'' کیا ہے۔ فضلاں کون تھی؟، کیا تھی؟ الطاف کی زندگی میں اُسے کیا عمل دخل تھا؟ یا اُس کی کیا اہمیت تھی؟ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی شاعر جب کسی کے نام اپنی کتاب کا انتساب کرتا ہے تو اُس شخصیت یا شے سے اُسے ایک گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس نام سے اُسے جذباتی یا نفسیاتی کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہاں انتساب کے ساتھ جو اضافی تحریر ہے وہ ایک خاص جذبے یا پہلی محبت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تحریر کچھ یوں ہے:

''فضلاں کے نام

جو آج بھی گاؤں کی کچی دیواروں کا سہارا لے کر شاعر کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔''

اگرچہ الطاف مشہدی کی کئی نظمیں اس پس منظر کی عکاس ہیں اور دیہاتی ماحول کے اس تصور کی تصویر ہیں اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ''فضلاں'' الطاف مشہدی کے گاؤں خواہ چک

۱۱۰ جنوبی ہو۔ شیخ چوگانی ہو یا آلو بہار کی کوئی دوشیزہ ہوگی۔ اور پہلی پہلی محبت ہوگی جس کی یاد میں انہوں نے کئی نغمے لکھے۔ جنہیں پڑھتے ہوئے اگر نام ذہن میں ہو اور گاؤں کا ماحول، ایک چرواہی، گاؤں سے باہر کی ملاقاتیں اور دوسرے بیان کردہ مناظر کسی ایک سمت کے تعین میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن گاؤں کی فضلاں کی بہتر عکاس جو نظم ہے۔ وہ ''دوشیزۂ صحرا'' ہے۔ جسے اگر ہم دیہات کے اس ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے فضلاں کو ذہن میں رکھیں اور پڑھیں تو ایک حقیقی تاثر پیدا ہوتا ہے۔

بانسری ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھے راتوں کو
کھیت آ آ کے مرے پاؤں پہ سر رکھتے ہیں
میں نے آنکھوں میں جگا رکھا ہے برساتوں کو
آ بھی جالوٹ کے ہر صحرا بنا ہے فردوس

-----

سبز ٹیلوں نے تجھے یاد کیا اور روئے
گاؤں کی گلیاں بھی بیمار ہیں تیرے غم میں
تیری یادوں نے کئی آنکھوں میں آنسو بوئے
میں ہی برباد نہیں صرف مرے پردیسی

-----

اک حسیں جھنڈ کھجوروں کا مجھے کہتا ہے
لے کے جب لغزشیں نکلتی ہوں میں صحراؤں میں
کون سے دیس میں محبوب ترا رہتا ہے
سچ بتا اُو مرے سایوں سے لپٹنے والی

-----

مجھ کو رنگین دوپٹے کی نہیں ہے چاہت
مست و شاداب فضاؤں کی ردا حاصل ہے
ڈھونڈ لوں گی تری بانہوں میں سمٹ کر راحت
جھلملاتے ہوئے ملبوس نہ لے کر آنا

-----

ایک دوشیزہ کو رسوائیاں دینے والے　　انگلیاں مجھ پہ شب و روز اٹھا کرتی ہیں

تازہ دم خون کی مانگوں نے مجھے گھیرا ہے　　تھلیاں میرے تعاقب میں رہا کرتی ہیں

------

دن ڈھلے جب بھی نکلتی ہوں اٹھا کر گاگر　　تاڑتا رہتا ہے تا دیر زمیندار مجھے

میرا احساس ہے مجروح اسی نشتر سے　　کبھی برباد نہ کر ڈالے یہ آزار مجھے

------

سرخ ہونٹوں کے گلستاں میں بہار آئی ہے　　باغباں بن کے حسیں پھولوں سے دامن بھر لو

بے سہارا ہوں نہیں مجھ سے حفاظت ممکن　　لوٹ کر اپنی امانت کی حفاظت کر لو　!

------

''دوشیزہ صحرا'' کے علاوہ ''اجڑا ہوا گاؤں'' ۔''پنگھٹ''۔''دیہاتی محبوبہ سے''۔ ''چرواہی'' اور ''اظہار عشق'' جیسی کئی ایسی نظمیں ہیں جنہیں پڑھ کر دھوکا کھایا جاسکتا ہے یا پھر کئی ''فضلائیں'' الطاف مشہدی سے جوڑی جاسکتی ہیں، لیکن صغیرہ بیگم سے الطاف مشہدی کی شادی بھی اس کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ ایک عاشق مزاج کے لیے اُس کو اِس طرح کے بندھن میں باندھنا کبھی کبھی آتشِ عشق کو مزید بھڑکانے کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ صغیرہ بیگم نے زندگی کا ایک طویل حصہ الطاف کے ساتھ گزارا۔ وہ الطاف سے عمر میں دس سال چھوٹی تھیں اور جب الطاف کی وفات ہوئی تو اس شوہر پرست بیوی نے اس دنیا میں مزید رہنا گوارا نہ کیا اور پھر جب لوگ الطاف مشہدی کے چالیسویں سے فارغ ہوئے تو ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء کو صغیرہ بیگم بھی آخری ہچکی لے کر اپنے خاوند کے پہلو میں جا سوئی۔

الطاف مشہدی کی زندگی میں جو بیوی بن کر صغیرہ بیگم کے ساتھ دوسری شخصیت آئی اس کا نام قیصر جہاں تھا۔ بقول پرویز بزمی بھوپال کے کسی مشاعرے میں دونوں کا ٹاکرا ہوا تھا۔ جو بعد

میں شادی پر منتج ہوا۔ مشاعرے اور شاعری کے حوالے سے جو قیصرہ جہاں میرے ذہن میں آتی ہے وہ خود بھی ایک شاعرہ تھیں۔ اور مولانا بصیر کی صاحبزادی تھیں مولانا بصیر بھی پاک و ہند کے اپنے زمانے کے ایک پہچان رکھنے والے شاعر تھے۔ قیصر جہاں پاکستان کے قیام سے پہلے ہی مختلف رسائل میں چھپ رہی تھیں۔ بلکہ جو لوگ ماہنامہ عصمت دہلی کے قاری رہے ہیں وہ اِس نام سے بخوبی واقف ہوں گے۔ کیونکہ عصمت کے ہر شمارے میں قیصر جہاں کی کوئی نہ کوئی نظم یا تحریر ضرور ہوتی تھی۔ ان کی نظمیں حمدیہ، نعتیہ، اصلاحی اور اخلاقی ہوا کرتی تھیں۔ اِس وقت مجھے اُن کی ایک نعت کے تین شعر یاد آرہے ہیں:

گھٹا ظلمت کی جب چھائی ہوئی تھی سارے عالم پر　　چمک اٹھا عرب کی وادیوں میں نورِ پیغمبرؐ

-----

جو سرخی تھی ازل کے روز سے ہر اک فسانے میں　　محمد مصطفیٰؐ تشریف لے آئے زمانے میں

-----

انہیں بھیجا گیا تھا بزمِ فطرت کے سجانے کو　　وہ آئے تھے جہاں میں کفر کی بنیاد ڈھانے کو

-----

۲۹

یہ خاتون الطاف مشہدی کے مشاعرے پر چھا جانے والے لہجے اور رومان انگیز اشعار سے متاثر ہوئی تھیں۔ لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ البتہ شادی سے پہلے کے میل میلاپ اور تعلق اور پھر علیحدگی کے بعد کی کیفیات نے الطاف مشہدی کو کئی خوبصورت نظمیں دیں۔ یہ نظمیں محبت، اور پھر دکھ کا ایک حسین تاثر پیش کرتی ہیں ''قیصر جہاں وہ تم ہو؟'' میں موسیقیت کی بھرمار ہے۔ جس سے خوشیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دل میں مچلنے والے جذبات کو نغمے کے رنگ میں لفظوں سے اِس نظم میں ایک ایسا سُر چھیڑا گیا ہے جس نے قیصر جہاں کو موسیقی کی رانی بنا دیا ہے۔ الطاف مشہدی کو دھنوں سے بھی واقفیت تھی۔ اس کی زندگی میں شراب اور شباب کے علاوہ

موسیقی کا بھی دخل تھا اور ''قیصر جہاں وہ تم ہو؟'' میں اس نے اپنے اسی علم کے باعث شعروں میں جان ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

دُرگا، اڈانا، چھایا، باگیشری تمہیں سے — بھیروں، بلاس خانی، راگیشری تمہیں سے

دیپک، ملار دیسی بھرتے ہیں جس کا پانی — کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی

قیصرہ جہاں وہ تم ہو

استھائی اور ٹپہ سجدے میں جھک رہے ہیں — شیرینیوں کے دریا تانوں میں رک رہے ہیں

لکشن، خیال میں بھی کوئی نہیں ہے ثانی — کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی

قیصر جہاں وہ تم ہو

-----

''قیصر جہاں وہ تم ہو؟'' الطاف مشہدی کی نظم اُن کے مجموعہ کلام ''داغ بیل'' میں اِسی نام سے شامل ہے۔ پھر یہ نظم ''شاخِ گل'' میں ''اختر جہاں وہ تم ہو'' کے ٹیپ کے مصرع کے ساتھ شامل ہے۔ ممکن ہے بعد میں اختر جہاں کوئی محبوبہ کے روپ میں الطاف کی زندگی میں داخل ہوئی ہو یا کسی کو فلرٹ کرنے کے لیے نظم میں نام تبدیل کر دیا ہو۔ اور کسی مصلحت کے تحت اسے دوسرے نام سے معنون کر دیا ہو۔ کیوں کہ ایسا کئی نظموں میں ہوا ہے۔ اسی طرح کی دوسری نظم جو ''داغ بیل'' میں ''قیصر کی جوانی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ''شاخِ گل'' میں ''وینس'' کے عنوان سے موجود ہے۔ یہ نظم بھی ایسے لگتا ہے کہ قیصر جہاں کے معاشقے میں شادی سے پہلے یا اُن چند یادگار دنوں میں لکھی گئی جو ملاقات کا ایک حسین سپنا ہے۔ ۱۲ اشعار کی اس نظم میں سے تین شعر دیکھیے اور الطاف مشہدی کے اظہارِ جذبات اور لفظیات کی داد دیجیے۔

ابرو کے حسیں موڑ پہ جاگی ہوئی نظمیں — تخئیل کی آبادی سے بھاگی ہوئی نظمیں

انگڑائیاں لیتی ہے جو ہنس ہنس کے سرِ بام　　گر جاتا ہے نظروں سے مری بادۂ گلفام

چلتی ہے تو تھم جاتی ہے رفتارِ زمانہ　　راہوں پہ لکھا جاتا ہے اک شوخ فسانہ

-----

قیصر جہاں جو بھی تھی وہ اطاف مشہدی کی جوانی کی کہانی تھی اور اُس کی جوان امنگوں کی ایسی یاد تھی جس نے اس کی شاعری میں ایک انجانی سی تبدیلی کی۔ صغیرہ بیگم چونکہ کم عمری میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کا دیہاتی ماحول اور خاندانی پس منظر چلبلاہٹ، شوخی اور تیزی وطراری سے خالی تھا جب کہ عورت کا حسن، عمر کی پختگی اور ادا مرد کی سوچ کو بدل دیتے ہیں۔ الطاف ایک شاعر تھے۔ رنگینیوں کے دلدادہ تھے۔ روشنیاں اُن کے من کو بھاتی تھیں لہٰذا قیصر جہاں سے تعلق اِس بنا پر بھی ہوا ہوگا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ کیونکہ قیصر جہاں نہ جانے کیا سوچ کر یہاں آئی تھیں۔ جب اُنھوں نے سب کچھ متضاد پایا تو علیحدگی میں ہی بہتری سمجھی۔ قیصر جہاں کے چلے جانے کے بعد جدائی اور مفارقت نے حسن اور عشق کی جگہ لے لی۔ اس جدائی کا تاثر ہمیں الطاف کی ایک نظم 'قیصر' سے بھی ملتا ہے۔ اس میں کچھ ماضی کی یادیں، کچھ قسمت کا شکوہ، کچھ بچھڑنے کا دکھ، محبت کی یاد اور پھر قیصر کے چھوڑ کر چلے جانے اور واپس لوٹ کر نہ آنے کے غم کا اظہار ہے۔ نو بندوں کی اس نظم میں سے دو بند اِن تاثرات کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہوں۔ اگر چہ یہ تاثر نامکمل ہوگا۔ ''وہ تم ہو؟'' میں انھوں نے اپنے اِسی علم کے باعث شعروں میں جان ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

اک حسیں جسم کی خوشبو ہے فضا میں اب تک　　گلستاں تیرتے ہیں بادِ صبا میں اب تک

تم نہیں لوچ تمہارا ہے ہوا میں اب تک　　ان حسیں یادوں سے تڑپاؤ گی معلوم نہ تھا

لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا

چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

مجھ سے چھینو نہ امیدوں کا سہارا قیصر　　آ بھی جاؤ کہ نہیں صبر کا یارا قیصر

میں بُرا ہوں کہ بھلا، ہوں تو تمہارا قیصر　　اپنے الطاف کو ٹھکراؤ گی معلوم نہ تھا

چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا

-----

''داغ دِل'' میں شامل ''قیصر'' کے عنوان سے یہ نظم ''لذتِ رنگ و بو'' میں بھی اسی نام سے ہے لیکن ''شاخِ گل'' میں اس کا عنوان ''لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا'' ہو گیا اور قیصر کی جگہ نکہت نے لے لی۔ اس سے یہ پتہ تو چلتا ہے کہ قیصر جہاں کے غم کو بھولنے یا قیصر کا نعم البدل ''نکہت'' نامی کوئی صنف الطاف کی زندگی میں در آئی۔ لیکن اس نظم سے نکہت کے مزید Where-abouts کا پتہ نہیں چلتا۔ اُس کے لیے ہمیں ''شاخِ گل'' کی نظم ''نکہت'' معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ جس سے نکہت نام کے علاوہ نظم کے شروع میں مندرجہ ذیل چند الفاظ بھی رقم ہیں:

''سرزمینِ گجرات کو سلام۔ جس نے سوہنی کے بعد ''نکہت'' کے پیکرِ جمیل کی تخلیق سے ''دیارِ حسن و عشق'' کا مرتبہ حاصل کر لیا۔''

قیصر جہاں کا نعم البدل نکہت۔۔۔ دراصل یہ اندازے الطاف مشہدی کی شاعری کے مطالعے سے لگانے پڑ رہے ہیں اور چونکہ ہمیں یہ احساس ہو چکا ہے کہ اُن کے داخل اور خارج یعنی ظاہر اور باطن میں زیادہ بُعد نہیں تھا۔ وہ اپنی ہر سوچ کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ لہٰذا اُن کے معاشقوں کے قصے کہانیاں اگر کوئی رقم کرنا چاہے تو اُن کی شاعری سے اخذ کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ہمیں الطاف کی زندگی کے وہ گوشے بھی ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں جو عام طور پر ظاہر نہیں کیے جاتے اور وہ گوشے ہم ان کے لفظوں اور نظموں کے تبدیل ہوتے ہوئے عنوانات سے بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔ ان نظموں نے الطاف مشہدی کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ ممکن ہے نکہت حقیقی نام نہ ہو اور فرضی نام ہو۔ لیکن جو کچھ سامنے ہو دیکھا تو وہی جاتا ہے اگر ''نکہت'' کے

عنوان سے جو نظم ہے اُس میں وہ حقیقی نام سے ایک جگہ پہلو تہی کر رہے ہیں۔ بہر حال نظم کیا کہتی ہے خود فیصلہ کیجئے۔

مری نکہت! ترے گجرات کی راتوں کا کیا کہنا　　شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی راتوں کا کیا کہنا

تری رفتار کی مستی شرابوں کے جزیرے میں　　تری تصویر آویزاں ہے خوابوں کے جزیرے میں

ترے ہونٹوں کی نکہت بھی تو اک بادِ بہاری ہے　　تری زلفوں کا بادل وصل کی راتوں پہ بھاری ہے

تری آنکھوں سے پی کر لڑکھڑانا سب کو پڑتا ہے　　تری قربت میں رہ کر گنگنانا سب کو پڑتا ہے

میرے گیتوں پہ ہوتا ہے گماں تیری کہانی کا!　　مرے اشعار میں پرتو سہی تیری جوانی کا

تری راہوں کو میں سجدوں کے پھولوں سے سجاؤں گا　　مگر تیرا حقیقی نام ہونٹوں پر نہ لاؤں گا

کئی ساون ہیں آنکھوں میں مگر میں رو نہیں سکتا
مری نکہت تجھے رسوا کروں یہ ہو نہیں سکتا

-----

سلمیٰ

فضلاں، قیصر جہاں اور نکہت کے علاوہ کوئی سلمیٰ نامی لڑکی بھی الطاف مشہدی کی شاعری کا حصہ رہی۔ سلمیٰ کا نام اگرچہ بہت سے شعراء نے اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ مثلاً علامہ اقبال نے، پھر اختر شیرانی نے، میرے خیال میں احمد ندیم قاسمی نے بھی یہ نام اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ نام اردو شاعری میں کوئی استعارہ بن گیا ہے۔ ایسے ہی الطاف مشہدی نے بھی خدا جانے اِس نام کو استعارہ کے طور پر لیا ہے یا حقیقت میں اس نام کی کسی ہستی سے اس کا تعلق رہا ہے۔ ''سلمیٰ سے'' نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی باسیرت خاتون تھی جس سے الطاف متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں

تیری صورت سے سلمیٰ تیری سیرت خوبصورت ہے　　مجھے مدت سے اک ایسی ہی ساتھی کی ضرورت ہے

-----

''سلمٰی سے خطاب''، نظم کے دس بندوں سے بھی کوئی غیر مہذب تاثر نہیں ابھرتا۔۔محبت کا ہیولا سا اٹھتا ہے، کچھ ملاقاتوں کے ذکر ہوتے ہیں۔خاموش الفت کی بات ہوتی ہے۔پھر مذہب کے آڑے آجانے کے تذکرے سے دھارا ایک اور رخ اختیار کرلیتا ہے۔

ہماری گردنوں پر چل گئی تلوار مذہب کی　　ہمارے عشق میں حائل ہوئی دیوار مذہب کی

وہی مذہب کہ جس کی گود میں جنت کے سائے تھے　　بڑھی بربادیوں سے رونقِ بازار مذہب کی

مری سلمٰی مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو　　کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے

-----

اوپر دیے گئے ناموں کے علاوہ حمیدہ مشرف، زہرہ جبیں، مغویہ لڑکی، پری جمال اور نجانے کتنی عورتیں الطاف مشہدی کی شاعری کی زینت بنیں۔الطاف مشہدی کا بازارِ حسن میں بھی آنا جانا تھا۔حُسن سے لگاؤ، موسیقی کا شوق اور غم سے وقتی فرار انہیں اس بازار میں لے جانے پر مجبور کرتے تھے۔اور اُن کے احباب کو اس بات کا علم تھا۔دراصل اسلام میں شراب کو اُمُ الخبائث اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس سے بہت سی دوسری برائیاں جنم لیتی ہیں۔الطاف وہاں کے حالات اور رسومات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔وہاں کے ماحول کے بارے میں کئی نظمیں اُن کی تصانیف میں بھی شامل ہیں۔جن میں طوائف اور انتقام جیسی نظمیں تو بہر حال بہت کچھ بتاتی ہیں لیکن ''کوٹھا'' ایک ایسی نظم ہے جس میں وہاں کا پورا ماحول اپنی کئی کیفیات کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ اکیس اشعار کی اِس نظم میں اُس ماحول کے پس منظر پر بات کرنے کے بعد آخر میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔

جنس کا آتش کدہ دہکا ہوا　　جسم مے کی باس سے مہکا ہوا

گنگناتی جھومتی پھُل واریاں　　عصمتوں کے خون سے گل کاریاں

-----

جام صہبائے ہوس چھلکا ہوا آدمیت کا کفن ڈھلکا ہوا

دودھ اور سیندور کے انسان دیکھ نان کی تحویل میں ایمان دیکھ

-----

اور سرگودھا کے اسی ماحول کی پروردہ ''پکھراج بی بی'' بالآخر الطاف مشہدی کے لیے جز وقتی سکون کا سامان بنی۔

الطاف اور پکھراج کے تعلق کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم تھا یا ہے۔ سرگودھا کے فیکٹری ایریا کے قبرستان میں ایک قبر پر درج ذیل کتبہ پڑھ کر مجھے حیرانی ہوئی

پکھراج بی بی زوجہ الطاف مشہدی

وفات ۲۱ رمضان ۱۹۹۹ء بروز اتوار

پرویز بزمی اور سلیم حسن مرزا سے قبل ازیں میری بات ہو چکی تھی۔ جس میں الطاف مشہدی کی دو شادیوں کا ذکر رہا۔ یہ کتبہ پڑھ کر میں نزدیک ہی رہائش پذیر نصرت چوہدری کے ہاں گیا اور اُن سے دریافت کیا:

الطاف مشہدی نے کتنی شادیاں کی تھیں ؟

''غالباً تین''

کون کون سی ؟

''ایک شاید خاندان میں تھی جس سے ایک بیٹی تھی۔ دوسری ہندوستان کے کسی علاقے کی کوئی دوشیزہ تھی اور تیسری میں نے سُنا ہے کہ اِسی بازارِ حسن کی کوئی عورت تھی۔''

اس کا نام آپ کو پتہ ہے؟

''نہیں میں نے سُنا تھا ''

'' پکھراج بی بی تو نہیں ؟

''شاید''

اور یوں میں ایک یقین کے ساتھ وہاں سے واپس آیا۔ الطاف مشہدی کی وفات کے بعد پکھراج بی بی اسی علاقے میں رہی اور تقریباً اٹھارہ سال کی بیوگی کی مدت گزار کر وفات پائی۔ البتہ یہاں کے لوگوں کو اس بات کا علم تھا اور یہی وجہ ہے کہ وفات کے بعد اس کی قبر پر الطاف مشہدی کی زوجہ کی حیثیت سے کتبہ لگایا گیا۔

اس پورے منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم الطاف مشہدی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی شاعری ہمیں اُس کے باطن سے پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کئی باتیں جنہیں وہ شعر میں ڈھالنے سے قاصر رہے۔ وہ نثر میں محفوظ کر دیں۔ ''ریحانہ'' اُن کا ڈراما ہے جس کے ابتدائیہ میں وہ اِس بات کا اعتراف بھی کرتے یں۔ اس کتاب کے آخر میں یعنی ڈرامے کے بعد اُن کے دو افسانے بھی شامل ہیں۔

شاعری میں ابھی تک ہم نے الطاف مشہدی کی نظم کی بات کی ہے جب کہ اُن کی غزل میں بھی وہی جذبوں کی چاشنی ہے جو ان کی نظم کا خاصہ ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے صرف چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کیونکہ یہ علیحدہ وضاحت کا طالب موضوع ہے۔

کوئی گاتی ہوئی اک شام دینا بڑھا کر ہاتھ ماضی کے افق سے

-----

کس کا پرتو میری آنکھوں میں مکیں ہے آجکل جلوہ گاہِ طور شرمانے پہ کیوں مجبور ہے

-----

میں رو رہا ہوں مگر آنکھ اشکبار نہیں بپاسِ حسن یہ جلووں کا احترامِ تمام

------

میکدے کو گنگنانا آگیا مست آنکھوں کا ترنم الاماں

-----

الطاف مشہدی کا خمیر چونکہ ایک گاؤں کی مٹی سے اٹھا تھا۔ لہٰذا سادہ زندگی کے وہ لطیف جذبے راگ کی ڈوری میں بندھ کر گیت بنتے رہے اور اِن گیتوں نے جہاں الطاف کی کئی کتابوں

میں جگہ پائی وہاں ''الطاف کے گیت'' ''الطاف کے نغمے'' ''پریت کے گیت'' تین مجموعے اردو گیت نگاری میں خوبصورت اضافہ ہیں۔ نفیس اقبال نے الطاف مشہدی کی گیت نگاری پر تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''الطاف مشہدی سرتاپارومانی شاعر ہیں۔۔۔ نغمہ، ترنم اور روانی الطاف کے گیتوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ تین چیزیں گیت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ وہ عربی، فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ۳۳

اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''محبت شعر ہے اور شعر نغمہ۔ الطاف مشہدی محبت کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ محبت کی تان کو سمجھتے ہیں۔ اُن کے دل پر جو گزرتی ہے اُسے دل نشیں، مؤثر اور سحر آگیں انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ ''پریت کے گیت'' میں ہمیں حسن و عشق کے دلفریب مناظر ملتے ہیں جو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے گیتوں میں نغمہ، شعر کی موسیقیت کو دو چند کرنے کے علاوہ ہر مصرع اور بول میں بجلیاں بھر دیتا ہے اور سننے والا ترنم و آہنگ کے ایک بحرِ ناپیدا کنار میں غرق ہو جاتا ہے۔'' ۳۴

الطاف مشہدی کی گیت نگاری ایک علیحدہ اور بھرپور مضمون کی متقاضی ہے۔ ایک گیت کے صرف چند مصرعے پیش کرنے کے بعد اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے تشنہ رکھ کر اُن کی ماہیا نگاری پر تھوڑی سی بحث شاملِ مضمون کرنا چاہوں گا۔

کون کسی کا میت ہے جگ میں
کون کسی کا میت
یہ دنیا ہے پاپ کی نگری
جس کی ڈوری اس کی گگری
ہار کے اس کو جیت
کون کسی کا میت ہے جگ میں
کون کسی کا میت

ہمارے ہی ماہیا کو لوک گیت کہا جاتا ہے کیونکہ ماہیا بھی دھرتی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور

فوک کا درجہ پا کر ہمارے دیہاتوں کے جوانوں اور خاص طور پر دشت وصحرا میں پھرنے والے چرواہوں کے دل کی دھڑکن بن کر فضا میں بکھرتا ہے۔ الطاف مشہدی کے مجموعہ ''الطاف کے گیت'' میں کل ۲۵ ماہیئے شامل ہیں۔ جن میں سے دس ماہیئے نعتیہ، پانچ بہاریہ اور دس متفرق ہیں یہ تفصیل بتانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان ماہیوں کے عنوانات ''ماہیا'' ہیں۔ ہمارے ہاں کافی عرصہ تک ایک بحث چلتی رہی کہ اُردو ماہیا سب سے پہلے کس نے لکھا۔ ایک گروہ نے ہمت رائے شرما کے حق میں ووٹ ڈالا تو دوسرے نے چراغ حسن حسرت کے۔ الطاف مشہدی کی کتاب ''الطاف کے گیت'' دوسری بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ تلاش بسیار کے باوجود میں اس کتاب کی پہلی اشاعت سے انجان ہوں۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۳۶ء میں تیرہ سال کا درمیانی عرصہ ہے۔ کسی بھی کتاب کی پہلی اشاعت کو نکلنے میں کچھ عرصہ تو لگتا ہے اور دوسرا یہ کہ کتاب لکھ چکنے کے بعد ترتیب دینے اور اشاعت میں بھی کچھ عرصہ لگتا ہے۔ اگر ''الطاف کے گیت'' کی پہلی اشاعت کی کوئی کاپی کہیں سے دستیاب ہو تو اس مسئلہ کے حل میں پیش رفت ہو سکتی ہے۔ کہ زبان کا پہلا ماہیا نگار کون تھا۔ کیونکہ اوپر جن دو گروپوں کا ذکر ہو چکا ہے وہ اس بات پر بھی معترض ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ ہمت رائے شرما نے بھی گانا لکھا تھا اور چراغ حسن حسرت کے ماہیئے بھی بنیادی طور پر گیت تھے۔ تو اگر ان کو ماہیا ہونے کے باوجود ہم گیت شمار کریں تو ماہیا عنوان کے ساتھ سب سے پہلا ماہیا نگار الطاف مشہدی ہیں اور ان کے حق میں دوسرا قدم یوں بھی بڑھتا ہے کہ کسی کتاب میں جو ماہیا شامل ہوا وہ میرے خیال میں الطاف مشہدی کا ماہیا ہے۔ اور اگر ہم ضد پر ڈٹے بھی رہیں تو الطاف کو کم از کم اردو زبان کے اولین ماہیا نگاروں میں شامل کر سکتے ہیں (ویسے راقم نے جب اس موضوع پر تحقیق کی تو ایک ماہیا کبیر کی بیجک میں بھی موجود پایا) تو الطاف مشہدی کے چند ماہیئے حاضر ہیں تا کہ اس فوک صنف کا حظ بھی اُٹھایا جا سکے۔

اب اور نہ شرماؤ
آنکھ کے رستے سے سینے میں اتر آؤ

پھولوں کو ہنسی آئی
ایک حسینہ نے لی ناز سے انگڑائی

---

لہروں پہ سفینہ ہے
کس نے کہا مجھ سے پینا ہے تو جینا ہے

---

وہ جھوم گئیں کرنیں
کومل کلیوں کا منہ چوم گئیں کرنیں ۳۵

---

الطاف مشہدی کی کل دس تصانیف شائع ہوئیں۔ جن میں سے ''ریحانہ'' اور'' مقاماتِ نظر'' دونوں نثر میں ہیں جب کہ ''تصویرِ احساس'' ۔''الطاف کے گیت''۔ ''الطاف کے نغمے''۔''پریت کے گیت''۔ ''ڈگر''۔ داغ بیل''۔''لذتِ رنگ و بو'' اور ''شاخِ گل'' شعری مجموعے ہیں۔ آپ نے شاعری میں تقریباً تمام اصناف میں اظہارِ خیال کیا۔ جن میں ٹپہ اور ماہیا تک موجود ہیں۔ جو مجموعے میری نظر سے گزرے انہیں پڑھنے کے بعد جو بات مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ بہت سی نظمیں ایک ہی نام یا مختلف عنوانات سے دو یا دو سے زائد مجموعوں میں شامل ہیں۔ اور یوں تحقیق کرنے والا اِس سے ایک منفی اثر لیتا ہے۔ اگر سب مجموعوں کو تلاش کر کے ترتیب دیا جائے تو ایک ہی خوبصورت کتاب کلیات کی صورت میں ۳۰۰ صفحات کے درمیان مکمل ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ الطاف مشہدی کو ہم اس انداز میں دیکھیں کہ اُسے کیوں فراموش کر دیا گیا اُس کے چند معاصرین کی رائے دیکھ لینا ضروری ہے۔

کرشن چندر کا کہنا ہے:

''الطاف کے کلام میں سوز اور درد ہے اور جوش اور ولولہ، لیکن ان جذبات کی وسعت محبت

تک ہی محدود نہیں۔ اُس نے خود اپنے لیے محبت کا دائرہ وسیع کر لیا ہے۔۔۔ وہ ایک پھول سے محبت نہیں کرتا بلکہ سارے چمن سے۔۔۔ اُسے ایک پھول کے مرجھانے کا افسوس نہیں ہوتا اُسے افسوس ہے تو یہ کہ سارے چمن پر خزاں چھا گئی ہے۔" ۳۶

ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مطابق:

"میں نہایت ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ الطاف مشہدی معاصرین میں قابلِ رشک مقام کے مالک ہیں۔" ۳۷

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ

"الطاف بلاشبہ از سر تا پا رومانی شاعر ہے۔ اس کا اسلوب فکر، طریق، انتخاب الفاظ اور کمالِ نگارش ہر صاحبِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر لیتا ہے اور نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں اپنے اس ترجمان کے گیتوں کے اثر سے تیز تر ہو جاتی ہیں۔ اس کی شاعری الفاظ و معانی کی گرانباری کو روا نہیں رکھتی بلکہ نسیم سحر اور پہاڑی ندی کی طرح چلتی ہے اور اس میں جوانی کا لاابالیانہ پن، رومان کی جمال پرستی اور نغمۂ حیات کا لوچ نظر آتا ہے۔" ۳۸

علامہ پنڈت برجموہن کیفی دتاتریہ دہلوی کا خیال ہے کہ:

"الطاف مشہدی کی ایک ایک نظم ایک ایک دیوان پر بھاری ہے۔" ۳۹

شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے کہا:

"اقبال کے بعد زمانہ نے ایک اور کروٹ بدلی اور شعراء کے نوجوان طبقے میں جوش اور الطاف جیسے نبض شناس پیدا ہوئے۔" ۴۰

ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کا قول ہے:

"اردو زبان اُس وقت تک پوری طرح جلوہ آرا نہیں ہو سکے گی جب تک الطاف مشہدی جیسے شاعر اس کی طرف پوری طرح توجہ نہ دیں گے۔" ۴۱

سید عبدالحمید عدم نے دو اشعار میں اپنی بات یوں واضح کی

جو کچھ ہے اس کے اپنے خیالوں کا حسن ہے　　　　اس کے علاوہ دوسری صورت نہیں کوئی

الطاف مشہدی کے مرصع کلام کو　　　　رسمی تعارفوں کی ضرورت نہیں کوئی

------

علامہ نیاز فتح پوری نے اپنی بات یوں سمیٹی

"الطاف کا نام عرصہ سے ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے اُن کی شاعری ہم کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور ایک نئے نظام کا پتہ دیتی ہے۔"

ماہنامہ آجکل نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"اردو شاعری میں ہئیت کے تجربے کرنے والوں میں الطاف کا نام پیش پیش ہے اور وہ اسی لحاظ سے زیادہ بلند ہیں کہ انہوں نے بحر و عروض اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ اپنے تجربات کی نئی بنیادیں رکھیں اور طرح توڑ ڈالی۔"

الغرض بہت سے معتبر ناقدین کی آراء آج بھی مختلف رسائل اور کتب میں موجود ہیں جن میں الطاف مشہدی کی شاعری پر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ آج تو تنقید میں دور ہی متن اور معروضیت کا ہے۔ شخصیت تو بہت پیچھے چلی گئی ہے۔ فرض کیا کہ شخصیت میں کوئی خامیاں ایسی تھیں بھی تو وہ جدید تنقید میں سامنے نہیں لائی جاتیں۔ ہاں متن میں سے شاعر کو کھنگالنا چاہیئے اور الطاف مشہدی کی شاعری تقاضا کرتی ہے کہ اُس میں سے الطاف کی شکل کو سامنے لایا جائے۔ لیکن آج ایک ایسے شاعر کو جس نے اپنے عہد کے بڑے بڑے ناقدین کو متاثر کیا عجیب بات ہے کہ یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ اور ہمارے عہد کے محققین، ناقدین اور مؤرخین اُس شخصیت کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے اور اس کی شاعری کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ میں نے کئی کتب اس حوالے سے دیکھیں لیکن صرف نفیس اقبال نے گیت کے سلسلے میں الطاف مشہدی کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں نام لینا تک گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ سلیم اختر الطاف مشہدی کو جانتے تھے اور اُن کی برسی پر بھی سرگودھا تشریف لائے

تھے برسی کے حوالے سے احمد سرفراز اعوان کی ایک تحریر میری نظروں کے سامنے آ گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک زمانے میں الطاف مشہدی کی دھوم خیبر سے راس کماری تک تھی اور برصغیر میں ہونے والا کوئی بھی بڑا مشاعرہ الطاف مشہدی کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس کی نظم ''اقبال کا پیغام'' ہر شخص کی زبان پر تھی۔اس کا یہ مصرع ''پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے'' تو ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ریڈیو کی ہر مجلس میں اس کے گیت شامل ہوتے تھے۔اس کی موت کے ساتھ ہی رومانی شاعری کا یک عہد ختم ہو گیا۔لیکن مقامِ عبرت ہے کہ لاہور میں اُس کے لیے سوائے اظہر جاوید کے کسی نے ایک آنسو نہ بہایا۔ لاہور کا ایک ترقی پسند رسالہ جو اپنی ہر اشاعت میں ادیبوں کی وفات کا ذکر کرتا ہے۔اس کے صفحات بھی الطاف مشہدی کے ذکر سے خالی تھے۔مرحوم کے فرزندِ نسبتی۔۔۔۔نے الطاف مشہدی کی برسی منانے کا اہتمام کیا تو لاہور سے جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر اور جناب عطاء الحق قاسمی نے بھی شرکت کی۔'' ۲۷

پروفیسر غفور شاہ قاسم جن دنوں گورنمنٹ کالج سرگودھا کے طالب علم تھے ان دنوں الطاف مشہدی کا شہرہ تھا۔ممکن ہے اُن کی ملاقات بھی ہوئی ہو۔انہوں نے ''پاکستانی ادب'' کے حوالے سے بڑا کام کیا ہے۔جس میں سرگودھا کے چند شعراء کا نام شامل ہے لیکن یہ بڑی حیرت کا مقام ہے کہ الطاف مشہدی کا نام اس میں بھی دکھائی نہیں دیا۔

انور سدید کا نہ صرف سرگودھا سے بنیادی تعلق ہے بلکہ ''سرگودھا'' ''سکول آف تھاٹ'' اُن کے بغیر نامکمل ہے۔انہوں نے ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں الطاف مشہدی پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا:

''الطاف مشہدی نے زلف ورخسار کی عبادت کی اور شاعری میں ایک حساس دنیا دار شاعر کا پرتو پیش کیا معنوی طور پر الطاف کے ہاں اختر شیرانی کی بازگشت موجود ہے۔'' اقبال کا

پیغام'' اور'' پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے'' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ اُن کی غزل میں بے ساختگی اور خستگی موجود ہے۔''۴۳

ہم عصر شعراء کے حوالے سے عرض کرتا چلوں کہ الطاف مشہدی کی شاعری میں ایک اُس کی اپنی گھن گرج ہے۔ تلاشِ حسنِ بے باک کا عنصر جو اختر کی شاعری میں تھا الطاف اُس سے چند قدم آگے دکھائی دیتا ہے۔ جو جذبوں کی پرستاری میں شدت جوش کے کلام میں تھی اُس کا پرتو الطاف کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔ ساغر نظامی نے جو تہذیبی تبدیلی کی بات کی تھی اُسے یہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حفیظ جالندھری کا سا نئے ماحول کا احساس اور حسن و شباب الطاف کے ہاں بھی ہے۔ احسان دانش کی محنت و عظمت کے پہلو، ٹیگور کی طرح ہلکے پھلکے گیت جن میں سادہ شیریں جذبات کی عکاسی ہے یہ سب کچھ الطاف کے ہاں موجود ہے۔ نیز الطاف کی شاعری رومانیت سے بھرپور ہے اور رومانی تحریک کے زیرِ اثر پل کر جوان ہونیوالی شاعری ہے۔ اختر شیرانی یا دیگر شعراء کے خیالات سے میل کھا جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ بلکہ سیف الدین سیف نے تو اس کا فیصلہ صرف ایک شعر میں یوں کر دیا ہے

سیف اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے　　　　ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

-----

ہمیں الطاف مشہدی کی شاعری میں یہ تلاش کرنا ہے کہ اس نے اپنے لیے کوئی الگ راہ نکالی یا نہیں۔ اور میرے خیال میں وہ کافی حد تک اِس میں کامیاب رہا۔ اس کی کامیابی کی ایک مثال تو ''کہانی'' افسانہ ہے۔ جس میں الطاف مشہدی کی شاعری کو بنیاد بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے سے الطاف کے بارے میں ایک یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ وہ ایک عہد تک جوان دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ اِس افسانے سے چند سطور ملاحظہ کیجئے:

''یہ اسٹڈی روم ہے اور ایک نازک اندام لڑکی صوفے میں دھنسی نہایت محویت سے نظموں کی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُس کے سامنے میز پر کسی شاعر کی تصویر رکھی ہے۔

جسے کچھ کچھ دیر کے بعد وہ کتاب سے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتی ہے اور مطالعہ میں محو ہو جاتی ہے۔ اور اس محویت کے عالم میں اُس کے متبسّم چہرے پر ایک عجیب سا کیف، ایک لطیف سا نشہ چھایا ہوا ہے۔ اُس کی بھیگی بھیگی پلکوں کے آس پاس آنکھوں کے ڈوروں میں خمار پیدا ہو رہا ہے۔ شاید یہ اُن رومانی نظموں کے خیالات کا اثر ہے جو وہ پڑھ رہی ہے۔" ۴۴

اسی اثناء میں ایک نوجوان اس کمرے مین داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اس لڑکی سے پوچھتا ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اندر آنے والے لڑکے کا نام انور اور مطالعہ کرنیوالی لڑکی کا نام نزہت ہے۔ درمیانی منظر ہماری بحث سے متعلق نہیں۔ انور کہتا ہے

"نزہت، تم کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"میں شاعرِ شباب کی رومانی نظمیں پڑھ رہی تھی۔"

"شاعرِ شباب کون؟"۔۔۔وہ استفہامیہ انداز میں پوچھتا ہے

"وہ۔۔۔!"

نزہت شوخی سے مسکرا کر سامنے میز پر رکھی ہوئی تصویر کی جانب اشارہ کر دیتی ہے۔

"شاعرِ شباب" انور بڑبڑاتے ہوئے پڑھتا ہے۔۔۔"اچھا! الطاف مشہدی؟"

"الطاف مشہدی میرا محبوب فنکار ہے"۔۔۔نزہت کہتی ہے۔

"الطاف مشہدی تمہارا محبوب فنکار ہے"۔۔۔انور محبوب کے لفظ پر زور دیتا ہے۔۔۔"تو اگر یہ فنکار ہی تمہارا محبوب ہے تو پھر مجھے کیون محبت کا حسین دھوکا دے رکھا ہے؟۔۔۔شاعر ہی کو محبت پر مجبور کرو"

انور طنز کرتا ہے، اُسے غصہ آجاتا ہے اور وہ واپس مڑنے لگتا ہے۔ نزہیت اس کا بازو تھام لیتی ہے۔ "انور تمہیں یہ کیسے غلط فہمی ہو گئی کہ میں شاعر سے محبت کرتی ہوں؟" وہ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انور کو فنکارانہ انداز سے سمجھاتی ہے۔۔۔

"انور! میں فنکار سے محبت نہیں کرتی لیکن اُس کے فن سے ضرور محبت کرتی ہوں۔ فنکار اپنے فنی

نقطۂ نگاہ سے ہمارے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں سنتا ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کی گہرائی میں محبت کے نشان دیکھتا ہے اور ہمارے دل میں انگڑائی لیتی ہوئی جوان امنگوں کو بھانپ لیتا ہے اور پھر اپنی نظموں میں ہمیں وہ محبت کے گیت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ اس کے نغمے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ اُس کی نظمیں شیریں لبوں، کالی آنکھوں اور پُر پیچ زلفوں سے عبارت ہوتی ہیں۔

یہ اس کا فن ہے اور فنکار عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر میں بھی اُسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں تو مضائقہ ہی کیا ہے۔۔۔؟" ۴۵

ممکن ہے یہ چند سطور الطاف مشہدی کی اہمیت جتانے میں کوئی کردار ادا کر سکیں۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ پورا افسانہ پڑھنے سے جو تاثر ابھرتا ہے اور سوچ پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے وہ افسانے کے اقتباس سے متوقع نہیں۔

الطاف مشہدی کی شاعری کی اگرچہ کئی جہتیں ہیں اور تمام ہی بحث طلب ہیں۔ لیکن ایک اور جہت جس کا میں ذکر کرنا صرف سرسری طور پر ضروری سمجھتا ہوں وہ ہے انقلابی یا مزاحمتی جہت۔۔

کرم حیدری نے ۱۹۴۵ء کے مری کے ایک آل انڈیا مشاعرہ کی روداد بیان کرتے ہوئے الطاف مشہدی کی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"الطاف مشہدی اپنی شاعری میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ اور کھلے روس پسندانہ جذبات کا اظہار بڑی شدومد سے کرتے تھے۔ مشاعروں میں وہ اپنی باغیانہ انداز کی نظم "اپنے دن اور اپنی راتیں" بڑے جوش وجذبات سے سنایا کرتے تھے۔ آواز پاٹ دار تھی اور پڑھنے کا انداز نہایت عمدہ تھا" ۵۴

یہ بات صرف ایک نظم تک محدود نہیں الطاف کی بہت سی نظمیں اس ضمن میں اُن کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں چونکہ اس نظم کا ذکر ہوا ہے تو اسی پر ہی اپنی ان سطور کو ختم کرنا چاہوں گا۔

## اپنے دن اور اپنی راتیں

خونیں ہے آکاش کی رنگت دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے دولت کی دیوی راہوں میں سینہ پکڑے ہانپ رہی ہے

بندوقیں کاندھوں پر رکھ کر باغی ہر سو گھوم رہے ہیں اونچے اونچے میناروں پر سبز پھریرے جھوم رہے ہیں

چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فواروں کا منظر خون کے فواروں کا منظر، پیلے انگاروں کا منظر

آگ کے شعلے خون کے چھینٹے تیر رہے ہیں سرخ فضا میں چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوا میں

جھونپڑیوں نے اونچے ایوانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی مظلوموں نے ظالم انسانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی

بھوک کے مارے کی رگ رگ میں آگ کے طوفان جاگ اٹھے ہیں فطرت جن پر نازاں ہے وہ کامل انساں جاگ اٹھے ہیں

مزدوروں کی آنکھوں میں ہیں کڑوی تحریروں کے فقرے شریانوں میں دوڑ رہے ہیں خونی تقریروں کے فقرے

ابھرے شانوں والے دہقاں شہروں میں چنگھاڑ رہے ہیں زرداری کے سینے پر افلاس کا پرچم گاڑ رہے ہیں

دوشیزائیں بک نہ سکیں گی عصمت اب نیلام نہ ہوگی بھوکی بیواؤں کی عزت زرداروں پر عام نہ ہوگی

کالی آنکھیں نیلی آنکھوں کے آگے اب جھک نہ سکیں گی سرمایہ کی سانسوں سے مزدور کی سانسیں رک نہ سکیں گی

مزدوروں کے سر پر اینٹوں کو ترجیح نہ دی جائے گی ابھرے شانوں چوڑے سینوں کی توہین نہ کی جائے گی

پتلے ہونٹوں لمبی آنکھوں کا اب سے بیوپار نہ ہوگا کاغذ کے ٹکڑوں سے اچھا عُسرت کا بیمار نہ ہوگا

باتوں پر اب قید نہ ہوگی لب سینے کا حکم نہ ہوگا بھوکے ننگ کی موت کے سائے میں جینے کا حکم نہ ہوگا

آج سے جیون اپنا ہوگا اپنا دن اور اپنی راتیں

میٹھی بولی، مست ترانے، اُتّم نغمے سندر باتیں

۴۷

----

# ماخذات


۱ پرویز بزمی، گفتگو ۱۶ جولائی ۲۰۰۸ء (سرگودھا)

۲ ایضاً ص ۱۳۴

۳ الطاف مشہدی ، داغ بیل ، عوامی کتب خانہ بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا۔ ۱۹۵۰ء ص ۱۲۱ ، ۱۲۲

۴ پروفیسر محمد اسلم، وفیاتِ مشاہیر پاکستان ، مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ۱۹۹۰ء ص ۳۰

۵ الطاف مشہدی، داغ بیل، ایضاً ص ۹

۶ الطاف مشہدی، شاخِ گل، ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور۔ ۱۹۵۴ء

۷ محمد شمس الحق ، گلہائے رنگ رنگ (جلد دوم) نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۵ء ص ۴۶۰

۸ مالک رام، تذکرہ ماہ وسال، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۹۱ء ص ۴۵

۹ زاہد حسین انجم، ہمارے اہلِ قلم، ملک بک ڈپو اردو بازار۔ لاہور ۱۹۸۸ء ص ۱۰۲

۱۰ پروفیسر ہارون الرشید تبسم ، اب انہیں ڈھونڈ چراغِ زیبا لے کر، بزمِ علم وفن کوٹ فرید سرگودھا ، ۲۰۰۳ء ، ص ۲۹

۱۱ محمود اسیر ، سخنورانِ سرگودھا ، ادارہ شاہین ادب بلاک نمبر ۲۱۔ سرگودھا، ۱۹۸۳ء ص ۸۶

۱۲ شاکر کنڈان ، نعت گویانِ سرگودھا ، ادارہ فروغِ ادب استقلال آباد۔ سرگودھا، ۲۰۰۶ء ، ص ۱۶۱

۱۳ عبدالقدوس ہاشمی، تقویم تاریخی ، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، طبع دوم ۱۹۸۷ء۔ ص ۳۳۳

۱۴ لوحِ قبر، مرکزی قبرستان سرگودھا

۱۵ پروفیسر ہارون الرشید تبسم، ایضاً ص ۲۹

۱۶ مالک رام ایضاً ص ۴۵

۱۷ پرویز بزمی ایضاً

۱۸ الطاف مشہدی، داغ بیل ایضاً ص ۹۸

۱۹ نعمان تاثیر و مظہر صدیقی، شعرستان، مکتبہ پرچم حسن آفندی روڈ۔ کراچی، ۱۹۵۲ء ص ۱۳۷

۲۰ الطاف مشہدی، لذتِ رنگ و بو، عوامی کتب خانہ بلاک نمبر ۱۸۔ سرگودھا، ۱۹۷۷ء ص ۸۸ تا ۹۱

۲۱ ڈاکٹر سید عبداللہ، دیباچہ، لذتِ رنگ و بو از الطاف مشہدی، ایضاً

۲۲ شاہد بخاری (لاہور) مکتوب بنام راقم (شاکر کنڈان) ۹ اگست ۲۰۰۵ء

۲۳ الطاف مشہدی، داغ بیل، ایضاً ص ۱۱۶

۲۴ الطاف مشہدی ،شاخِ گل، ایضاً ص ۱ تا ۳

۲۵ ماہنامہ عصمت دہلی۔ مارچ ۱۹۴۴ء

۲۶ الطاف مشہدی، داغ بیل، ایضاً ص ۷۲۔۷۳

۲۷ الطاف مشہدی ،شاخِ گل، ایضاً ص ۲۷

۲۸ ایضاً ص ۱۷۹

۲۹ ایضاً ص ۱۸۱

۳۰ الطاف مشہدی، الطاف کے گیت ، اردو اکیڈمی لاہور۔ بار دوم۔ ۱۹۳۹ء
ص ۱۱۱۔۱۱۲۔۱۱۳

۳۱ کرشن چندر، دیباچہ داغِ بیل از الطاف مشہدی۔ایضاً

۳۲ الطاف مشہدی، شاخِ گل۔ایضاً فلیپ

۳۳ عبدالمجید سالک، پیش لفظ شاخِ گل از الطاف مشہدی ایضاً

۳۴ الطاف مشہدی، لذتِ رنگ وبو، ایضاً ص ۱۴

۳۵ ایضاً ص ۹۳

۳۶ ایضاً ص ۱۲۷

۳۷ ماہنامہ ''اردو زبان'' سرگودھا۔مئی جون ۱۹۸۴ء ص ۲۸

۳۸ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز اردو بازار لاہور۔۱۹۹۶ء
ص ۴۱۶

۳۹ سید احمد ہمدانی، کہانی، (افسانہ) مشمولہ ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی۔مئی ۱۹۵۲ء،
ص ۵۳

۴۰ ایضاً ص ۵۴

۴۱ کرم حیدری، گل گفتار، مکتبہ الحمود ۹۔بی سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی۔۱۹۹۹ء
ص ۷۵

۴۲ الطاف مشہدی، داغِ بیل، ایضاً ص ۱۰

قدرت اللہ شہزاد

# علی احمد رفعت کی غزل میں سیاسی عنصر

بعض لوگ غزل میں سیاسی عنصر کو تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھتے وہ اسے حسنِ تغزل کے لیے سمِ قاتل قرار دیتے ہیں لیکن جو شخص زمانے کو کھلی آنکھ سے دیکھے گا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی تخلیق میں سیاسی حالات کا اثر ضرور آئے گا۔ اگر اساتذہ کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں خالص غزل کے شعراء کے ہاں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ میر، آتش، مومن، غالب غرض کوئی بھی بڑا شاعر اس سے مبرا نہیں۔ اور جب شاعر صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوگا تو اس کی غزل ضرور سیاسی فکر سے ''آلودہ'' ہوگی۔ حسرت موہانی، فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام اس ضمن میں لئے جا سکتے ہیں۔ علی احمد رفعت کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک زمانے میں انہوں نے علاقائی سیاست میں بھی بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ جس کے سبب ان کا سیاسی شعور اتنا بلند جس کا آج کل کے قومی سیاسی رہنماؤں میں فقدان ہے۔ لہٰذا رفعت صاحب کی غزل میں ایسے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جو اُن کی فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

---

(نوٹ) علی احمد رفعت مرحوم اُن آباد کاروں میں ایک نہایت منفرد اور محترم شخصیت تھے جنھوں نے نہ صرف سابق ریاست بھاولپور کے معاشی و معاشرتی ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا بلکہ شعروادب اور صحافت کو بھی فکروفن کی اعلیٰ اقدار سے روشناس کرایا۔ ریاست کے مغربی پاکستان میں انضمامی ادغام کے بعد بھی رفعت مرحوم بھاولپور میں کاروانِ ادب وصحافت کے ہدی خوانوں میں شامل رہے اور اپنے اخبار ہفت روزہ 'ستلج' کے ذریعہ آزادیٔ ابلاغ واظہار کے پرچم کو سربلند رکھا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا' (ادارہ)

وطن عزیز کو آزادی نصیب ہوئی تو ہوا اپنے دامن میں خونچکاں حکایتیں سمیٹے ہوئے تھی جس نے ہر ایک کے وجود کو لرزا دیا۔ رفعت صاحب خون میں لت پت آزادی کو دیکھ کر کہتے ہیں:

صبحِ نو آئی ہے خود اپنے ہی خوں میں غلطاں ساغرِ شام میں ہے، ڈوبتے سورج کا لہو

-----

رات بھر پلکوں پر اشکوں کے دیئے جلتے رہے اس چراغاں کا سماں، آتے تو تم بھی دیکھتے

-----

آزادی کا سورج تو طلوع ہو گیا لیکن اس سے فیضیاب ہونے کے لیے اچھی قیادت میسر نہ آئی۔ رفعت صاحب نے جب یہ دیکھا کہ زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے میدان میں نظم وضبط سے عاری ہیں۔ اہل ہوس نے لاکھوں افراد کی بے مثال قربانیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ تعمیر وطن کے مقصد کو پس پشت ڈال کر لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ اور ایسی بندر بانٹ ہوئی کہ خدا کی پناہ! رفعت صاحب نے دیکھا کہ حکمران اپنے ہر غلط فعل کو قومی مفاد قرار دے کر اس کے فوائد گنوانے لگے ہیں جب کہ عوام زہر کو امرت قرار دینے سے خوب باخبر ہیں اس لیے وہ ہراساں نظر آتے ہیں۔ اس کیفیت پر رفعت صاحب نے ارباب اقتدار سے استفسار کیا۔

اِس میں رُشد و ہدیٰ کا چرچا اُس پر ابرِ کرم کا سایہ
پھر کیوں اس نگری کے باسی سہمے سہمے ڈرے ڈرے ہیں

-----

نیا ملک کیا بنا ارباب سیاست کے لیے عیش و نشاط کے دروازے کھل گئے طرفہ تماشا یہ کہ عوام کے غم مین گھلنے والے رہنما جب آپس میں ملتے یا سیاسی امور پر غور و خوض کے لیے محافل منعقد کی جاتیں تو شغلِ مے نوشی بھی جاری رہتا۔ سیاستدانوں کی اس روش پر رفعت صاحب یوں اظہار کرتے ہیں۔

ارغوانی ساغروں کے دور بھی چلتے رہے بزم میں ذکرِ غم جمہور بھی ہوتا رہا

-----

ایک اور مقام پر وہ سیاستدانوں کی "عظیم مصروفیات" کو یوں شعری پیرہن عطا کرتے ہیں

مصروفیت میں ان کی بھلا کیا کلام ہے عشقِ بتاں کا شغل ہے بادہ ہے جام ہے

-----

بہر حال رفعت صاحب سیاستدانوں کے طرزِ عمل سے سخت بیزار تھے۔ انہیں کسی کی بھی بات کا اعتبار نہ تھا۔ یہ شعر ان کی اسی سوچ کا عکاس ہے۔

زہد و تقدس کے دامن پر ہم نے دیکھے داغ ہوس کے

بھوکوں کا غم کھانے والے جتنے ہیں سب پیٹ بھرے ہیں

-----

آزادی کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ قوم کو عزم و ہمت اور عمل پیہم کی راہ پر گامزن کیا جاتا اس کی تقدیر کو سنوارا جاتا لیکن اس کے کھیون ہاروں کے مایوس کن طرزِ عمل نے قوم کے سفینے کو تلاطم کے بحرِ ذخار کے سپرد کر دیا۔ قوم دورِ غلامی سے بھی زیادہ ادبار کا شکار ہو گئی۔ دور دور تک اس صورتحال سے نکلنے کے کوئی آثار نہیں تھے یہ دیکھ کر رفعت صاحب یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

موسم گل میں نہیں رنگ و نمو تیرگی چھائی ہوئی ہے ہر سُو

-----

رہنماؤں کی بداعمالیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم بھی بے حسی و بے عملی کا شکار ہو گئی۔ اِدھر ملک آزمائشوں سے گزرنے لگا لیکن خوش فہمیوں کے سراب نے اس کا ادراک نہ ہونے دیا۔ اس منفی قومی روش پر رفعت صاحب نے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

مطمئن ہیں اس طرح جیسے ہُوا کچھ بھی نہیں آشیاں پر بجلیوں کی یورشیں ہیں اور ہم

-----

پاکستان بنتے ہی ملی سیاست پر منفی رویہ کے حامل لوگ قابض ہو گئے جب تحریک پاکستان کے مخلصین اور مثبت اقدار رکھنے والے رہنما بے توقیر ہوتے چلے گئے ایک وقت ایسا آیا کہ وہ گمنام ہو گئے اور پھر خارزارِ سیاست میں قدم نہ رکھا جس کی کسک کو رفعت صاحب نے محسوس کیا اور میدان سیاست کو سراب کا استعارہ دیتے ہوئے کہا:

اہلِ خرد کا کارواں ڈوب گیا سراب میں ڈوبے تھے جو سراب میں پھر نہ کبھی اُبھر سکے

-----

سانحہ مشرقی پاکستان ایک ایسا المیہ ہے کہ جو بھلائے نہیں بھولتا۔ اس سانحۂ عظیم پر پوری قوم سکتے کے عالم میں تھی۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اہلِ دانش دم بخود تھے۔ فیض احمد فیض اور بعض دوسرے حساس دانشوروں کو صدمے کے سبب چپ سی لگ گئی تھی۔ علی احمد رفعت نے بھی سقوطِ ڈھاکہ کا گہرا اثر قبول کیا پھر سکوت کو توڑنے کے لیے کہا:

غم منزل کی کوئی بات کرو کچھ تو کہو اتنے خاموش ہو کیوں ہمسفرو کچھ تو کہو

قافلے والوں پہ اس دشت میں کیا گزری ہے تم بھی خاموش ہوائے رہ گزرو کچھ تو کہو

-----

وطن عزیز حوادث کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔ طوفانی امواج کے تھپیڑے اسے بار بار ہلکان کئے دے رہے ہیں۔ نااہل قیادت اس کی تباہی کے درپے ہے۔ بے شمار لوگ ملک کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہیں لیکن رفعت صاحب تمام تر صورتحال کے باوجود پُر امید رہے اس لیے انہوں نے کہا:

وقت کی پنہائیوں میں حادثے پلتے رہے شب کے ہنگامے سحر کے گیت میں ڈھلتے رہے

-----

انہوں نے نامساعد حالات پر مایوسی کے اظہار کی بجائے اچھے حالات کی نوید سنائی اور ہر مشکل مرحلے پر ہمت بندھائی اس لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے۔

حوادث خیز تھے طوفاں اگرچہ بحرِ امکاں کے دیئے جلتے رہے ہر رنگ میں حسنِ فروزاں کے

-----

آزادی اظہار انسان کا بنیادی حق ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ غلامی سے نجات ملنے کے بعد بھی حیلے بہانوں سے اس حق کو سلب کیا گیا۔ علی احمد رفعت ریاست بہاولپور کے باسی تھے، ریاست کا پاکستان سے الحاق ہو گیا تھا۔ ریاست کے سیاسی حکمرانوں کے جمہوری طرزِ عمل سے اربابِ سیاست وصحافت سخت نالاں تھے۔ رفعت صاحب نے آواز اٹھائی اور

حکومتی دعوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا:

فکر و عمل کی آزادی جو مجبوروں کو آپ نے دی ہے ہم تو اس سے بھر پائے ہیں باز آئے ہیں ہم گزرے ہیں

-----

حق گوئی پر انہی ابتلا و آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا انہوں نے تمام مصائب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا

سن سن کے جھوم اُٹھے ہیں سب اہل دل اسے رنگِ طرب حکایتِ دار و رسن میں ہے

-----

انہوں نے چپ سادھ لینے والوں کی بھی ہمت بندھائی اور انہیں حق گوئی کی ترغیب دیتے ہوئے کہا:

بات پھر حرفِ سرِ دار تک آ پہنچی ہے رسمِ عشاق کو رُسوا نہ کرو کچھ تو کہو

-----

رفعت صاحب نے حکمرانوں کی زیادتیوں پر گلہ نہیں کیا، آہ و بکا نہیں کی فریاد نہیں کی بلکہ کمال شوخی سے کام لیتے ہوئے کہا:

ہم پر بھی ہو ہی جاتے ہیں تیرِ نظر کے وار ہم پر بھی ان کی تیغِ ستم بے نیام ہے

-----

جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرانا امریکی درندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایٹم کی تباہ کاریوں کا احساس ہر ایک نے کیا۔ کسی نے بھی ایٹم کی ایجاد کو مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس حوالے سے رفعت صاحب کا یہ شعر ان کے عصری شعور کی دلالت کرتا ہے۔

تم نے ذرے کا جگر چیر کر کیا دیکھا ہے نقشِ دیوار ہو کیوں دیدہ ورو کچھ تو کہو

-----

اس سب کچھ کے باوجود علی احمد رفعت کی غزل میں سیاسی فضا کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے لیکن یہ رنگ ان کی شاعری پر حاوی نہیں ہوتا۔ ان کے اس انداز سے ان کی غزل کا حسن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ معنوی طور پر ان کی غزل سب کے دل کی آواز بن جاتی ہے۔

افسانہ

## سلیم زاہد صدیقی

# سفارش

انور میرا دوست تھا۔ ہم ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اتفاق سے ہمارے دفتر کے بڑے صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ رضوان صاحب آگئے۔ انور، رضوان صاحب کے ساتھ پہلے بھی ایک دفتر میں کام کر چکے تھے اس لحاظ سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی۔ جب رضوان صاحب نے دفتر کا چارج سنبھالا اور لوگوں کے علم میں یہ بات آئی کہ انور سے ان کی پرانی جان پہچان ہے تو دفتر کے لوگوں نے انور کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا کہ وہ انور کے ذریعہ رضوان صاحب سے تعلق پیدا کریں اور ان کے نزدیک ہو کر اپنے کام کرا سکیں۔ انور بھی اس بات کو سمجھتا تھا کہ دفتر کے ساتھیوں میں اچانک اس کی قدر و قیمت کیوں بڑھ گئی ہے۔

ہم ایک دن کیفے ٹیریا میں انور کے ساتھ چائے پی رہے تھے ہم نے انور سے کہا۔ جب سے لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارا اور رضوان صاحب کا ماضی میں کوئی تعلق رہ چکا ہے ہر آدمی تمہارا دوست بننے پر تلا ہوا ہے۔ اسی وقت راشد بھی آگیا۔ اس نے گرم جوشی سے انور اور مجھ سے مصافحہ کیا اور چائے کے ساتھ لوازمات بھی لانے کا آڈر دے دیا۔ ”کیا بات ہے راشد! بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے ہماری“ ارے نہیں یار میں ناشتہ کر کے نہیں آیا ہوں۔ تو منگوالیا ہے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد راشد مطلب پر آگیا۔۔۔

”یار انور! معلوم ہوا کہ تمہاری رضوان صاحب سے پرانی دوستی ہے۔“

”دوستی!!!۔۔نہیں بھئی! باس سے دوستی وغیرہ نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی جان پہچان کہہ سکتے ہو، دراصل میں نے ان کے ساتھ آج سے چار سال پہلے ایک ادارے میں کام کیا ہے۔ وہ وہاں بھی میرے باس تھے اور یہاں بھی باس ہیں“۔۔۔انور نے کہا

”چلو جان پہچان ہی سہی۔۔۔۔کیسے آدمی ہیں؟“
”بہت نفیس، بہت محنتی، با اخلاق اور سب سے بڑھ کر سخت اصول پسند، قانون اور ضابطے کے پابند۔نہ چاپلوسی کرتے ہیں اور نہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی ان کی چاپلوسی کرے۔نہ سفارش سنتے ہیں نہ سفارش کرتے ہیں“۔۔انور نے ان کی پوری شخصیت بیان کر دی ۔ راشد ہنسا۔۔۔”یار انور! دنیا میں کوئی بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو چاپلوسی پسند نہ کرتا ہو۔مکھی اور مکڑے والی منظوم کہانی جو اقبال نے لکھی یاد ہے نا؟۔۔تو بھائی چاپلوسی ہر آدمی کی کمزوری ہے۔پیغمبر اور اولیاء کی بات نہیں کر رہا مگر اس معاشرہ کے عام آدمی کی بات کر رہا ہوں۔اور رضوان صاحب اولیا میں سے نہیں ہوں گے۔“

میں سچ کہہ رہا ہوں۔”راشد وہ چاپلوسی۔بالکل پسند نہیں کرتے۔“

”تم صحیح کہہ رہے ہوگے مگر بھائی چاپلوسی کرنا ایک فن ہے۔“

یہ سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا اور ”تم اس فن کے ماہر ہو“۔ہم سب ہنس پڑے

راشد نے کہا میں تم کو ایک حقیقی واقعہ سناتا ہوں۔ ہوا یوں کہ ہم جب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ہمارے ایک سبجیکٹ کے پروفیسر نوید کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ وہ سفارش نہیں سنتے۔اور جو کوئی بھی، خواہ وہ ان کے خاندان کا فرد یا، بہترین دوست ہی کیوں نہ ہوا گر کسی کی سفارش کر دے تو وہ اس سفارش کرنے والے کے بھی لتے لے لیتے تھے اور جس کی سفارش کی گئی ہوتی تھی اس کا تو سمجھو کام تمام ہو گیا۔ہوتا ہوا کام بھی نہیں ہوتا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ فائینل ایر میں میرا وہی پرچہ خراب ہوا اور ایسا خراب ہوا کہ پاس تو شاید میں ہو جاتا مگر اوّل ڈویژن نہیں مل پاتی۔سخت پریشان تھا۔اپنے دوست مبارک سے ذکر کیا کہ یار اگر کوئی اور پرچہ ہوتا تو کسی سے سفارش کر لیتے مگر سر نوید تو کسی کی سفارش سنتے ہی نہیں ہیں۔ اگر کسی سے سفارش کرائی تو پاس ہو بھی رہا ہو تو فیل کر دیں گے۔تب مبارک نے کہا، ابے گدھے!

کسی سے نہیں اپنی سفارش خود کر۔۔۔میں نے کہا وہ کیسے۔۔۔اور یار وہ سنیں گے ہی کب؟۔۔۔
مبارک نے کہا دنیا میں کسی کی تعریف کرنا سب سے بڑی چاپلوسی بھی اور سفارش بھی۔۔میں نے کہا مگر وہ تو چاپلوسی کو بھی بہت بُرا سمجھتے ہیں۔

اور چاپلوسی کرنا تو مجھے آتا بھی نہیں ہے۔اس نے کہا تو کیا تو ان سے کہے گا کہ سر میں آپ کی چاپلوسی کرتا ہوں آپ مجھے پاس کر دیں۔ابے احمق! اس کو سفارش اور اپنی تعریف کرانا پسند نہیں ہے نا بس اسی کو ہتھیار بنا۔ پھر میں مبارک کی دی ہوئی لائن پر سر نوید کے پاس گیا اور ان سے کہا ''سر! میرا ایک مسئلہ ہے جو آپ ہی حل کر سکتے ہیں۔آپ کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ آپ کو سفارش سے نفرت ہے اسی لیے میں کسی کی سفارش لے کر نہیں آیا ہوں۔سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔کیونکہ میرا آپ کا استاد شاگرد کا تعلق ہے اور آپ اگر میری بات سن کر میری مدد کر دیں گے تو کر دیں گے ورنہ کسی کے بھی کہنے پر نہیں کریں گے کیونکہ یہی آپ کا اصول ہے۔''
وہ مسکرائے اور مجھے سفارش کے خلاف ایک بھرپور لیکچر دیا۔اور چاپلوسی کے حوالے سے سمجھاتے رہے کہ چاپلوسی کرنا گھٹیا پن ہے۔دونوں چیزیں گناہ کے زمرے میں آتی ہیں، ہمیں اس سے بچنا چاہیے بالکل صحیح کہا تم نے میں دونوں سے پرہیز کرتا ہوں۔نہ کسی کی سفارش سنتا ہوں نہ ہی کرتا ہوں۔اور چاپلوسی کو تو میں برداشت ہی نہیں کرتا۔کوئی میرے بارے میں مجھ سے زیادہ تو نہیں جان سکتا ہے۔یہ تو میں جانتا ہوں میں کتنا اچھا یا بُرا ہوں۔اگر کوئی میری غلط تعریف کرے گا مجھ میں وہ خوبیاں نکال لائے گا جو مجھ میں نہیں تو کیا ہوگا۔یہی نہ کہ مجھ میں غرور پیدا ہو جائے گا اور غرور اللہ کو پسند نہیں ہے۔رہ گئی مدد کی بات تو مدد کرنا تو میرا فرض ہے۔ہم تم کو پڑھاتے ہیں تو گویا تمہاری کامیابی کی کوششوں میں ہم تمہاری مدد ہی تو کرتے ہیں۔۔۔خیر چھوڑو بتاؤ کیا مدد مانگنا چاہتے ہو۔''

تب میں نے کہا ''سر آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے نالائق شاگردوں میں نہیں ہوں۔اس مرتبہ بھی میرے سارے مضامین کے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں، امید ہے فرسٹ ڈویژن

آ جائے گی۔ فائینل ایر ہے۔ مگر سر آپ کے پرچے کے بارے میں میں تھوڑا سا شک میں ہوں۔ سوال نمبر ۲ میں کچھ معمولی سی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ میتھڈ درست ہے مگر کیلکولیشن میں ضرب تقسیم میں غلطی ہو گئی ہے۔ بس سر اگر آپ ان سے صرف نظر کر دیں تو مہربانی ہو گی۔''

انہوں نے کہا ''اپنا رول نمبر بتاؤ میں دیکھتا ہوں۔ کیا ہو سکتا ہے''

میں نے نمبر بتا دیا اور واپس آ گیا۔ اور پاس بھی ہو گیا تو میرے بھائی چاپلوسی کے طریقے ہوتے ہیں سب پر ایک نسخہ نہیں چلتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کس کو کیسے ڈیل کرنا ہے''

''مگر رضوان صاحب پر تمہارا کوئی وار نہیں چلے گا'' میں نے کہا

''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔؟''

دراصل ایک ایسا واقعہ ان کی زندگی میں گزرا جس کے بعد وہ سفارش کے نام سے بالکل آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

وہ کیا؟

مجھے ان کے بیٹے نے بتایا کہ ایک دن صبح فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو کوئی خاتون تھیں جو بابا کے دفتر میں کام کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے بابا سے بات کرنی چاہی، بابا فون سن کر بہت گھبرا گئے۔ وہ خاتون رو رہی تھیں۔ بابا نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ ان کے بیٹے نے میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے ٹسٹ دیا تھا مگر اس کا نام کامیاب امیدواروں میں نہیں آ سکا۔ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ سلیف فائیننس کے تحت اس کا داخلہ کرا سکیں۔ بیٹا بہت جذباتی ہو رہا ہے اور کہتا ہے ماما مجھے زہر لا دو میں خودکشی کر لوں گا۔ اسے بہت سمجھایا بلکہ ایک خودکشی کی کوشش بھی وہ کر چکا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں سر!۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ آپ کے ایک دوست میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں۔ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، سر خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاتون بلک بلک کر رونے لگیں۔ بابا بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس بچے کا داخلہ کرانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ اور پھر بابا نے کوشش کی اور اس بچے کا داخلہ

ہوگیا۔ بابا بہت خوش تھے کہ ان کی وجہ سے بچہ کی جان بچ گئی اور خاتون کی مدد ہوگئی۔

مگر اس کے چند دن بعد ان کی نظر سے مقامی اخبار میں ایک خبر گزری کہ

''ایک یتیم بچہ جو اسی میڈیکل کالج کے داخلہ میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس کا نام کامیاب طلباء کی لسٹ میں آخری تھا کو سلیف فائنس لسٹ میں شامل کردیا گیا اور کسی اور کا نام کسی کی سفارش پر کامیاب ہونے والوں کی لسٹ میں شامل کردیا گیا۔ وہ بچہ سلیف فائینس کی رقم کا بندوبست نہیں کرسکا اور اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے ٹرین سے کود کر خودکشی کرلی۔''

بابا کو بہت افسوس ہوا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ اس کی خودکشی کا ذمہ دار خود کو محسوس کرنے لگے۔ اور بار بار کہتے کہ اس بچے کی خودکشی کی وجہ میری کسی کے لئے ناجائز سفارش بنی ہے۔ بس اس دن کے بعد سے جب کوئی سفارش کا نام بھی لیتا ہے خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

## گذارش

بعض موصولہ نگارشاتِ نظم ونثر ''الاقربا'' میں بوجوہ شائع نہیں کی جاسکتیں جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے تاہم ایسے مسودات کے محترم مرسلین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی نقل اپنے پاس محفوظ فرمالیا کریں کیونکہ ادارہ کے لیے انہیں واپس بھیجنا ممکن نہیں۔ شکریہ

# امین راحت چغتائی

## نعت

طیبہ کی فضاؤں میں پیغمبرِ لاثانی
توحید کا پرچم ہے سرچشمۂ ایمانی

یہ عشق کی دلداری اور عقل کی حیرانی
ملبوسِ بشر ہیں وہؐ اور عرش کی مہمانی

دیکھا ہے اُنھیں جب سے جچتا نہیں نظروں میں
وہ حسنِ بہاراں ہو یا لعلِ بدخشانی

اللہ کی عظمت پر کٹتے ہوئے سر دیکھے
آقا کی عطا کہیے ، یہ جذبۂ ایمانی

وہ گنبدِ خضرا بھی ، ایماں کی حرارت بھی
دیتا ہے یہی منظر جذبوں کو فراوانی

جب اسمِ محمدؐ کا آنکھوں میں اجالا ہو
مِل جاتی ہے ڈھونڈے سے مشکل میں بھی آسانی

یہ در ہے درِ اقدس نازاں ہو مقدر پر
ملتی ہے کہاں راحت ہر ایک کو دربانی

## نعت

اُس نامِ جہاں تاب پہ قربان ہزاروں
ہیں جس کے غلاموں میں بھی سلطان ہزاروں

ہو جاتے ہیں آسودۂ جاں حسنِ یقین ہے
آتے ہیں یہاں چاک گریباں ہزاروں

ملتی ہے یہاں آکے مساکین کو مسند
ٹوٹے ہیں سلاطیں کے یہاں مان ہزاروں

معراج ہے اعزاز فقط خواجۂ دیں کا
آئے تو ہیں دنیا میں رسولانِ ہزاروں

ہر روز میں بیٹھا رہا دہلیز نبیؐ پر
اللہ کے ہوتے رہے احسان ہزاروں

کب ختم ہوئی مدحتِ سرکارؐ دو عالم
لکھتے رہے ہم نعت کے دیوان ہزاروں

راحت ہے درودوں کی مہک اور درِ شہؐ
پھر بیٹھا ہے دل میں لیے ارمان ہزاروں

# شفق ہاشمی

## '۔۔۔تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!'

وہ پیہم رحم، الرحمٰن

بخشا علم کا سرچشمہ جس نے صورتِ قرآن

وہ (خلاقِ ازل) انسان کی تخلیق کی جس نے

عطا کی جس نے پھر نطق و بیاں کی مقدرت اس کو!

مہ و خورشید کو جس نے کیا ہے اک نظامِ خاص کا پابند!

ستارے (آسماں کے) اور (زمیں کے یہ) شجر سب تابع فرمان ہیں اس کے!

وہ جس نے رفعتیں افلاک کو بخشی ہیں اور میزان قائم کی!

تو پھر لازم ہے، اس میزانِ عالم میں نہ تم کوئی خلل ڈالو

تمہارا وزن ہو انصاف پر قائم، توازن ٹھیک ہو، کوئی کمی، بیشی نہ سرزد ہو!

زمیں کو اپنی مخلوقات کا اس نے بنایا ملجا و ماویٰ،

جہاں ہیں نو بہ نو اقسام کے پھل، تہ بہ تہ خوشے کھجوروں کے،

جہاں غلّے کی فصلیں، ان کا بھوسا اور گُل و ریحاں کی نکہت ہے،

تو (اے افرادِ جن و انس) جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

کیا تخلیق اس نے (اوّلیں) انساں کو مٹی کے کھنکتے خشک گارے سے،

بھڑکتی آگ کے شعلوں سے جن تخلیق فرمایا،

تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

وہی پروردگارِ مشرقین و مغربین (اور عالمِ اسباب کا خالق ہے، مالک ہے)،

تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

رواں اس نے کیے پانی کے دھارے دو، جو ٹھاٹھیں مارتے ملتے ہیں،
لیکن ایک پردہ سا جو حائل درمیاں ہے اس سے آگے بڑھ نہیں سکتے،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

یہی ہیں وہ سمندر جن سے موتی اور مونگے بھی نکلتے ہیں،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

سمندر میں رواں چٹان صورت یہ سفینے بھی اُسی کے ہیں،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

زمیں پر جو بھی ہے (بیشک، فنا اس کا مقدر ہے،
بقا ہے صرف ربِ ذوالجلال وذوالمِنَن کو،
(کہ جس کی ذاتِ والا شان یکتا اور بے ہمتا)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

سبھی جو آسمانوں میں، زمیں پر ہیں اُسی سے مانگتے ہیں حاجتیں اپنی،
نئی ہر آن اس کی شان (ہر لحہ نیا پہلو، نیا انداز ہے اس کا)
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

گروہِ جن وانساں، اے زمیں کے بوجھ!
ٹھہرو، ہم تمہاری (سرزنش) کے واسطے فارغ ہوئے جاتے ہیں
(بس وقتِ حساب آنے ہی والا ہے)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

گروہِ جن وانساں بھاگ سکتے ہو تو پھر ارض وسماء کی وسعتوں سے بھاگ نکلو تم،
مگر کس بل کہاں تم میں کہ رب العالمیں کی سلطنت سے دور جا پہنچو،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

تعاقب میں تمہارے آگ ہوگی، اس کا شعلہ اور دھواں ہوگا، نہ ہوگا کوئی نصرت کو،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

(بتاؤ) کیا کرو گے آسماں جب پھٹ پڑے گا اور دہکتا ہوگا چرمِ لالہ گوں صورت،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

وہ دن ہوگا کسی انسان یا جن سے نہ پوچھا جائے گا جس دم، 'بتا تیرا گنہ کیا ہے'
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

ہر اک مجرم کا چہرہ جرم کا آئینہ ہوگا اور وہی پہچان بھی اس کی،
گھسیٹا جائے گا پیشانیوں کے بل اسے، پیروں سے (جن میں بیڑیاں ہوں گی)
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

یہی ہے وہ جہنم مجرموں نے جس کو جھٹلایا تھا (دنیا میں)،
رہیں گے نارِ دوزخ، کھولتے پانی کے مابین اب وہ گردش میں،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

جسے ہے خوف پیشی کا حضورِ بارگاہِ رب تو اُس کے واسطے دو جنتیں ہوں گی!
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

گھنے اشجار سے آراستہ دونوں،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

رواں ہوں گے جہاں دونوں میں چشمے دو،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

جو پھل دونوں میں ہوں گے اس کی پھر قسمیں بھی ہوں گی دو،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

وہاں مسند نشیں ہوں گے وہ غالیچوں پہ جن کا ہے حریرِ پرنیاں استر،
پھلوں کے بوجھ سے باغات کی شاخیں جھکی ہوں گی،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

انہی باغات میں ہوں گی حیا پیکر جھکی پلکیں،
کہ جن کا حسن ہوگا لمسِ انس و جاں سے یکسر غیر آلودہ،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

وہ (حورانِ بہشتی) حسن ہے یاقوت و مرجاں سے سوا جن کا،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

صلہ احسان کا احساں نہیں تو اور پھر کیا ہے
(تمہاری نیکیوں ہی کا یہ پھل ہیں نیکیاں ساری)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

ملیں گے اور دو باغات بھی ان سے الگ باغاتِ جنت میں،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

گھنے، سرسبز اور شاداب (فردوسِ نظر باغات)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

جہاں ہوں گے ترنم ریز چشمے دو،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

جہاں ہوں گے فواکہ، نخلِ بارآور، انارِ (خوش نظر، خوش رنگ، فرحت بخش)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم

جہاں (ان نعمتوں کے درمیاں) پاکیزہ سیرت، خوبصورت بیویاں ہوں گی،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

غزالی چشم حورانِ بہشتی جلوہ گر جنّت کے خیموں میں
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

جنہیں انساں یا جن نے کبھی پہلے چھوا ہے (اور نہ ان سا خوبرو دیکھا)،
تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!

فردکش جنّتی ہوں گے جہاں قالین ہائے سبز اور نایاب و نادر مسندوں پر
اپنی جنت میں) !

سدا اونچا رہے وہ نام جس کی برکتیں ہر سو،
ترا وہ رب، علوئے شان و عظمت میں نہیں ہمسر کوئی جس کا۔ !!

(ہمارے رب، کہاں یارا ہمیں تکذیبِ نعمت کا !
بسر ہو زندگی تیری غلامی میں، رہے فیضان جاری تیری رحمت کا۔ آمین!)

------

قرآنِ عظیم الشان کا مکمل یا منتخب سورتوں کا ترجمہ و مفہوم نظم کرنے کی کوششیں آغا شاعر قزلباس مرحوم کی "نظم مقدس" اور حضرت جوش ملیح آبادی کے منظوم ترجمہ 'سورۂ رحمٰن' سے لے کر آج تک کی جاتی رہی ہیں۔ مگر کلامِ ربانی کی اعجاز سامانیوں کے آگے انسانی زبان و بیان کا عجز اور تنگ دامانی بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ بقول اقبالؒ الفاظ و آہنگ میں یکتا سورۂ رحمٰن کا یہ ترجمہ ایک حقیری کاوش ہے کہ شکوہِ الفاظ یا قوافی کی غیر ضروری بندش کا اہتمام کیے بغیر ربّ ذوالجلال کا پیغام اور آیاتِ پاک کے معانی و مفاہیم کا ابلاغ عام فہم اور سلیس پیرائے میں ہو جائے اور شعری تقاضے بھی ملحوظ رہیں۔ باری تعالیٰ اس ناچیز کوشش کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ (آمین)

## ڈاکٹر قاسم جلال

### حمد

لب پر ہے ذکر جاری ہر صبح و شام تیرا
ہے ثبت لوحِ دل پر نقشِ دوام تیرا

ہم ہیں خطا کے پیکر، تُو ہے عطا کا مصدر
لغزش کے ہم ہیں خوگر، بخشش ہے کام تیرا

جن کی بصارتوں میں شامل بصیرتیں ہیں
دیتا ہے ہر نظارا ان کو پیام تیرا

خورشید و ماہ و انجم عکسِ جمال تیرے
حُسن خرامِ دریا اک لطفِ عام تیرا

کس طرح سے سمائے قطرے میں ایک دریا
محدود عقل سمجھے کیسے مقام تیرا

اس پر بھی ہو خدایا ! ابرِ کرم کا سایہ
قاسم جلال ہے اک ادنیٰ غلام تیر

## پرتو روہیلہ

### نعت

پیکر خاکی نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
عزتِ انساں عظمتِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم

میری زباں پر ان کی ثنا ہو اور میں گریاں بے خودرحمت
محو بجودِ روضہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

عرش بریں پر دعوت دے کر آپ پہ کھولے راز دو عالم
بندہ ہوا اللہ کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم

رنگ، قبیلہ، منصب، مسکن، سب کا مٹا کر فخر و فضیلت
کر دیا تقویٰ سب پہ مقدّم صلی اللہ علیہ وسلم

قلب و نظر کا خاورِ تاباں، فکر و خرد کا ماہ درخشاں
تارِ نفس کا ہمدمِ پیہم، صلی اللہ علیہ وسلم

ظلمتِ کفر و جہل مٹائی، علم و عمل کی راہ دکھائی
رہبر امت ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

پرتو عاصی کی ہے دہائی روزِ قیامت اس پہ نظر ہو
شافعِ محشر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم

# نورین طلعت عروبہ

## حمد

تری مدحت میں وُہ الفاظ استعمال کرتے ہیں
سُخن کے باب میں ہم خود کو مالا مال کرتے ہیں

بہت بے فکر ہو جاتے ہُیں تجھ سے غم بیاں کر کے
خُوشی پاتے ہُیں جب تجھ کو شریکِ حال کرتے ہیں

تجھی پر چھوڑتے ہُیں فیصلہ اُن سارے لوگوں کا
ترے بندوں کا جو دُنیا میں استحصال کرتے ہیں

طوالت آتی ہے سجدے میں، گریہ بڑھنے لگتا ہے
پریشاں جب کبھی مُجھ کو مرے اعمال کرتے ہیں

مرے اللہ کی رحمت کی کوئی حد نہیں، بے شک
کرم اُس کے ہر اک نادار کو خوشحال کرتے ہیں

ہمیں وُہ چاہتا ہے چُونکہ ستّر ماؤں سے بڑھ کر!
گُزارش بھی اسی سے ہم بپے احوال کرتے ہُیں

کِسی معذور سے مِل کر کبھی جو دل پگھلتا ہے
تو ہم پہلے سے بڑھ کر شکرِ خدٔ و خال کرتے ہُیں

## حمد

آن کی آن میں اوقات بدل سکتا ہے
تُو ہر اک شخص کے حالات بدل سکتا ہے

امتحانِ غم دُنیا ہے ادق میرے لیے
تُو جو چاہے تو سوالات بدل سکتا ہے

جو بھی کاذب ہے ترے سامنے حاضر ہوگا
ابھی دُنیا میں تو وہ بات بدل سکتا ہے

بخشنا مجھ کو قناعت تجھے دُشوار نہیں
اِک ترا حُکم مری ذات بدل سکتا ہے

خیر کرتی بھی نہیں جن کے دِلوں بیچ گُزر
تُو تو اُن کے بھی خیالات بدل سکتا ہے

تُو ہی دے سکتا ہے کفّار پہ سبقت ہم کو!
جیت میں تُو ہی ہر اک مات بدل سکتا ہے

تُو نے رکھی ہے خزاؤں کے تعاقب میں بہار
صبح روشن میں سیہ رات بدل سکتا ہے

# پروفیسر حسن عسکری کاظمی

## نعت

مدحت سرا پہ معنیِ حرفِ ثناء کھلے
اسمِ جمالِ سیدِ خیرالوریٰؐ کھلے

آقاؐ کے ہر عمل میں ہے خیرِ عمل نہاں
انؐ کی ہر ایک بات سے رازِ بقا کھلے

بحرِ وفا میں شورِ تلاطم ہوا بپا
پھر بادبانِ کشتیِ دستِ دعا کھلے

عرفان و آگہی کی طلب ہے اگر تجھے!
ساقی سے عرض کر کہ درِ میکدہ کھلے

ایسا نہ ہو کہ رحمتِ حق ہم سے دور ہو
جو کھل سکا نہ بھید وہ رازِ جزا کھلے

امت میں انتشار کی صورت وہی رہی
دینِ مبیں کا کیسے مگر مدعا کھلے

پیشِ حضورؐ آگیا گریہ کناں حسن
ممکن ہے یوں بھی حالِ دلِ بے نوا کھلے

## نعت

روضۂ خیرالبشرؐ پر تم دعا کرتے رہو
سر جھکا کر زیرِ لب حمد و ثنا کرتے رہو

گنبدِ خضرا کے سائے میں رہے اُن کا خیال
یا مدینے میں گدا بن کر صدا کرتے رہو

زائرو! اپنے گھروں کو لوٹ کے آؤ گے تم
جو کیا وعدہ وہاں ان سے وفا کرتے رہو

کوئی اچھا یا برا ہے بخش دو سب کی خطا
جس طرح آقاؐ نے فرمایا بھلا کرتے رہو

شیوۂ عشاق ہے لب بستگی انؐ کے حضور
آنسوؤں سے آئینہ دل کا جلا کرتے رہو

قامتِ نیزہ پہ تھا انؐ کا گھرانہ یاد ہے
جتنے دن ٹھہرو غمِ آلِؐ عبا کرتے رہو

یاد رکھنا حالِ زارِ امتِ خیرالوریٰؐ
روبرو انؐ کے حسن نالہ بپا کرتے رہو

## صابر عظیم آبادی

### نعت

مثلِ انجم کیوں نہ چمکے قسمتِ حرف و نوا
آپؐ سے منسوب ہے ہر ندرتِ حرف و نوا

آپؐ کا طرزِ بیاں ہے دلفریب و دلنشیں
آپؐ کا قول و عمل ہے حرمتِ حرف و نوا

آپؐ کے دم خم سے رخشندہ معانی کے گہر
آپؐ سے تابندہ حسنِ عظمتِ حرف و نوا

آپؐ کے حسنِ تکلّم کے مہکتے پھول سے
ہے معطّر کشت زارِ لذتِ حرف و نوا

بات کرنے کا سلیقہ آگیا انسان کو
آپؐ نے رکھی بنائے جدّتِ حرف و نوا

رفتہ رفتہ وہ مقدر کا سکندر ہو گیا
جس نے پائی انؐ کے لب کی دولتِ حرف و نوا

جب میں کرتا ہوں تلاوت آیتِ قرآن کی
تازہ دم رکھتی ہے مجھ کو نکہتِ حرف و نوا

گفتگو سے ان کی صابر کھل اٹھے لفظوں کے پھول
بڑھ گئی لہجے سے ان کے زینت حرف و نوا

## حمیرا راحت

### نعت

حاصل عمر یہی پل ہو جائے
نعت روضے پہ مکمل ہو جائے

میں لکھوں اِسمِ محمدؐ اور بس
مسئلہ میرا ہر اِک حل ہو جائے

ابرِ رحمت اُٹھے اِن کے در سے
دل کی بستی مری جل تھل ہو جائے

سبز گنبد ہو مری آنکھیں ہوں
پھر جہاں سارا یہ اوجھل ہو جائے

ایک سجدہ مجھے ایسا ہو نصیب
درد جتنا ہے یہ بادل ہو جائے

کوئی کہہ دے کہ بلاوا ہے ترا
دل خوشی سے مرا پاگل ہو جائے

ذکر اُن کا ہو لبوں کی لالی
عشق اُن کا مرا کاجل ہو جائے

راحتؔ اُس در سے ملے گر نسبت
زندگی اپنی مکمل ہو جائے

## سیّد حبیب اللہ بخاری

### نعت

ہر وقت روضہ رہتا ہے میری نگاہ میں
پاتا ہوں اپنے آپ کو شہرِ پناہ میں

محبوب حقؐ سے حُسنِ تعلّق کے بعد پھر
کیا فائدہ کسی سے مجھے رسم وراہ میں

غمگین و پُر ملال میں ہوتا ہوں جب کبھی
کرتا ہوں وردِ اسمِ نبیؐ اپنی آہ میں

میرے نبیؐ رحیم و کریم و بشیر ہیں
رہتا ہوں مطمئن میں ہجومِ گناہ میں

دنیا تو اک مقامِ اذیّت ہے اے حبیب
ممکن ہے لُطف قُربِ رسالت پناہؐ میں

## محمد اویس ابنِ محمود بہاولپوری

### نعت

ہیں عرشی بھی فرشی، فلک بھی زمیں ہے
دو عالم کا دلہا یہیں ہے یہیں ہے

ملائک سلامی کو حاضر ہیں دیکھو
تجلّی کا منبع یہی سر زمیں ہے

حضورؐ آپ ہی کا کرم وجہ بخشش
حضورؐ آپ ہی کے کرم پر یقیں ہے

عطا آپؐ کی ہے عطائے الٰہی
کوئی اور اس مرتبہ پر نہیں ہے

تمنا ہے بس آپؐ کے آستاں کی
یہی میرا مذہب یہی میرا دیں ہے

# کلامِ حضرت علی ابنِ ابی طالب کرّم اللہ وجہہ

## منظوم ترجمہ: اختر علی خان اختر چھتاروی (امریکہ)

لَا تجزَعَنَّ مِنَ الھُزَالِ فَرُبَّما
نہ گھبرائے جو لاغر ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

ذُبِحَ السَّمِینُ وَعُوفِی المَحزُول
کہ فربہ ذبح ہو جاتا ہے، لاغر چھوٹ جاتا ہے

وَاجعَل فُوءَادَکَ لِلتَّوَاضُعِ مَنزِلاً
تم اپنے دل میں خاطر اور تواضع کی بِنا ڈالو

اِنَّ التَّوَاضُعَ بِالشَّرِیفِ جَمِیلٌ
شریف النفس پر بس، منکسر، ہونا ہی پھبتا ہے

وَاِذَا وُلِّیتَ اُمُورَ قَومٍ لَیلَۃً
اگر اک رات بھی تم کو کسی کا ذمّہ مل جائے

فَاعلَم بِاَنَّکَ عَنھُم مَسئُولٌ
سمجھ لو تم سے اس بارہ میں استفسار ہونا ہے

وَاِذَا حَمَلتَ اِلَی القُبُورِ جَنَازَۃً
کسی کا تم جنازہ لے کے قبرستان جب جاؤ

فَاعلَم بِاَنَّکَ بَعدَھَا مَحمُولٌ
نہ ہرگز بھولنا' ایسے ہی اِک دن تم کو جانا ہے

یَا صَاحِبَ القَبرِ مُنَقَّش. سَطحُہُ
مگر وہ شخص جس کی قبر اوپر سے منقش ہے

وَلَعَلَّہُ مِن تَحتِہِ مَغلُولٌ
یہ ہو سکتا ہے' اندر' طوق گردن میں لٹکتا ہے

مَا یَنفَعُہُ اَن یَّکُونَ مُنَقَّشاً
منقش قبر سے اس کو بھلا کیا فائدہ پہنچا

وَعَلَیہِ مِن حَلَقٍ لعَذَابِ کَبُولٌ
اُسے بھینچے عذابوں کا اگر اک تنگ حلقہ ہے

لَا تَغتَرِر بِنَعِیمِھِم وَبِمُلکِھِم
نہ دھوکہ کھانا ہرگز دوسروں کے مِلک و نعمت پر

اَلمُلکُ یُفنِیَ وَالنَّعِیمُ یَزُولٌ
یہ نعمت ختم ہونی ہے' فنا یہ مِلک ہونا ہے

## محمد طارق غازی آٹوا، کینیڈا

○

کل تک فقط ہمی تھے پریشان آرزو
ہیں آج وہ بھی دل سے ثنا خوانِ آرزو

تھا آرزو سے خالی دل سادہ خلد میں
سوز و گداز دہر ہے احسانِ آرزو

خوشبو کی طرح نکلے تھے ہم باغ عدن سے
لے کر بہار کا سروسامانِ آرزو

آدم کی داستانِ عروج و زوال میں
ہے شرح آرزو کہیں امکانِ آرزو

رقصاں ہے کائنات کا ہر ذرہ آج تک
اک روز کہہ دیا تھا انہیں جانِ آرزو

یا اس کو مانگ لے یا جہاں اس سے مانگ لے
کچھ تنگ تو نہیں ترا دامانِ آرزو

حرماں کدہ کو چھوڑ گئیں حسرتیں تمام
اب تم اکیلے ہو یہاں مہمانِ آرزو

تنہا تھے شام حشر میں ہم آپ کے قریں
بس اک حجاب تھی وہاں میزانِ آرزو

لب پر نہ التماس، نہ شکوہ، نہ التجا
کچھ اشک بول اٹھا سر مژگانِ آرزو

محرومیوں میں خوش ہے دل امتحاں پسند
غم نے بنا دیا اسے شایانِ آرزو

اک آرزو نہ پوری ہوئی عمر بھر تو کیا
کردیں ہزاروں حسرتیں قربانِ آرزو

چاہا بھی تجھ کو اور تجھے پوشیدہ بھی رکھا
پردہ ہے تیرا تارِ گریبانِ آرزو

وارفتگی میں کی تھی خطا کس کمال کی
تیرے ندیم رہ گئے حیران آرزو

ان کی عطا تو کم نہیں دل کی مراد سے
پھر کس لیے ہے سینہ میں ہیجان آرزو

حسن طلب کی بات ہے کیوں ہاتھ روکیے
دیکھیں وسیع کتنا ہے دامان آرزو

چلتے رہیں گے پیر جہاں تک بھی ساتھ دیں
پھیلا ہوا ہے سامنے میدان آرزو

ہم کو ملی ہے کشور غم اس جہان میں
ہم ہیں ترے جہان میں سلطان آرزو

دنیا کا بوجھ ڈھو کے یہاں تک تو آ گئے
لو سامنے ہے حشر میں میزان آرزو

سوچا کئے کہ قصہ میں لکھیں تو کیا لکھیں
لکھنے کو ہم نے لکھ دیا عنوان آرزو

چہرہ پہ تھا سکوت سمندر کی موج کا
سینے میں دھڑکنوں سے تھا طوفان آرزو

حالات میں خزاں کا نظارہ ہیں ہم، مگر
مہکا ہوا ہے دل میں گلستان آرزو

آؤ کبھی تو ساتھ قدم دو قدم چلو
بھاتی ہے دو کو سیر خیابان آرزو

اختر☆ کے اتباع میں طارق غزل کہو
شیرانی کی زمین ہے شیران آرزو

------

---

☆ اختر شیرانی مرحوم کی اس زمین میں غزل کی طرف اشارہ جس کا مطلع تھا:
میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

# مضطر اکبر آبادی

O

تھوڑی سی بے رخی بھی ہے آپ کے التفات میں
گھول دیا ہے جس نے زہر میرے تصورات میں

اُس کے علاوہ اور ذات کس کی ہے کائنات میں
شب کو جو دن میں ڈھل دے دن کو بدل دے رات میں

اِس میں نہیں ہے کوئی شک فرق ہے بات بات میں
بات بنے تو پھر ہے کیا حرج مذاکرات میں

خیر بھی ہے مزاج میں شر بھی ہے اس کی ذلت میں
آپ ہی اپنی ضد بھی ہے آدمی کائنات میں

صُبح سے تا بہ شام ہے کام ہے اور مُدام ہے
فرصتِ یک نفس نہیں کارگہِ حیات میں

آئی ہے اپنے ذہن میں جب بھی سہولتوں کی بات
ہو گیا ہے اضافہ کچھ اور بھی مشکلات میں

اپنی تباہیوں کے بعد ہم پہ ہوا یہ انکشاف
دوسرا کوئی بھی نہ تھا ہم تھے خود اپنی گھات میں

بات بگڑ بھی سکتی ہے بات ہی بن بھی سکتی ہے
یہ بھی ہے ممکنات میں وہ بھی ہے ممکنات میں

خوف کی لہر کے سوا تلخیٔ زہر کے سوا
روپ کی ایک دھوپ بھی ہوتی ہے حادثات میں

دل میں کسی کی یاد اب آتی ہے مضطرؔ اس طرح
جس طرح پھلجھڑی چلے کوئی شب برات میں

## صابر عظیم آبادی

○

یہ دنیا برسرِ پیکار نکلی
ذرا سی بات پر تلوار نکلی

صبا تو آئی تھی صحنِ چمن میں
مگر وہ نرگسِ بیمار نکلی

فضا مجھ کو ملی آزاد لیکن
مری حسرت کہاں سرکار نکلی

میں کس امید پر شمعیں جلاتا
ہوائے وحشت بھی عیار نکلی

بُری سب کو لگی اس انجمن میں
جو سچی بات منہ سے یار نکلی

خیالِ آخرت کس کو دلاؤں
یہ دنیا بھی تو دنیا دار نکلی

جدھر ہم ڈھونڈنے نکلے تھے اس کو
اُدھر اک درمیاں دیوار نکلی

ہوئے ہم اس قدر رسوا کہ گھر گھر
ہماری داستاں ہر بار نکلی

سمجھتے تھے جسے معصوم صابر
وہی صورت بہت ہشیار نکلی

## پرتو روہیلہ

○

اگر ڈھونڈیں گے ہم سونے کی کانیں
کہاں پھر آسمانوں کی اڑانیں

نہ جاگی ہے نہ جاگے گی یہ ملت
بھلے دیتی رہے دنیا اذانیں

تماشا بھی یونہی ہوتا رہے گا
تکلف ہوتی رہینگی یوں ہی جانیں

کجی بنیاد ہی میں ہے کہیں پر
مری بات آپ مانیں یا نہ مانیں

ہمارے تیر ہیں سارے خمیدہ
مگر سیدھی ہماری ہیں کمانیں

یہی انعام آزادی ملا ہے
کہ باہر آ پڑیں منہ سے زبانیں

یہ لگتا ہے گِدھوں کی ایک ٹولی
اڑاتی ہے کہیں لاشوں پہ تانیں

جو ہونا ہے وہی ہو کر رہے گا
ہم اپنے دل میں کچھ بھی کیوں نہ ٹھانیں

نتیجہ پھر وہی نکلے گا پرتوؔ
مسائل کو بھلے کتنا ہی چھانیں

## سحر انصاری

○

کسی منزل نہ کسی راہ گزر تک ہم تھے
ہے یہی یاد کہ آغازِ سفر تک ہم تھے

کیا خبر رحمتیں کس کس پہ ہوئیں پھر نازل
تیری محفل میں دعاؤں کے اثر تک ہم تھے

تجھ کو تو چاند ستاروں کی طلب تھی شاید
ہم یہ سمجھے کہ تری حدِ نظر تک ہم تھے

دُور ہیں کارِ ہوس سے یہ سمجھنا نہ کبھی
لب و رُخسار کے الماس و گہر تک ہم تھے

چھیڑیے مت صلۂ عرضِ ہنر کی باتیں
یہ بھی کیا کم ہے یہاں عرضِ ہنر تک ہم تھے

خود کو رکھا نہیں آشوبِ زمانہ سے الگ
خندۂ لب سے سحر دیدۂ تر تک ہم تھے

## سید صفدر حسین جعفری (مرحوم)

○

کوئی کہانی نئی نہیں ہے کوئی فسانہ نیا نہیں ہے
کوئی زمانہ نہیں پُرانا کوئی زمانہ نیا نہیں ہے

وُہی تقطّع وہی بناوٹ یہ تانا بانا نیا نہیں ہے
وُہی مرا قلبِ مضطرب ہے ترا نشانہ نیا نہیں ہے

محبتوں کا وُہی چلن ہے زمانہ جیسے ٹھہر گیا ہے
گریز پائی تری وہی ہے ترا بہانہ نیا نہیں ہے

جہاں سے جانا ہے امرِ ربی یہ امتحاں بھی ہے امرِ ربی
وہی ہے جینا وہی ہے مَرنا یہ کارخانہ نیا نہیں ہے

محبتوں کی وہی طلب ہے وفا شعاری وہی ہے صفدرؔ
وُہی ہے قربان گاہِ ہستی یہ آزمانا نیا نہیں ہے

## امین راحت چغتائی

O

لگ گئی سب کو زمانے کی ہوا
ابتدا میں ہر کوئی تھا باخدا

جانے کس نے کان میں کیا کہہ دیا
پھر وہی اوجِ ثریا پر گیا

آئینے میں اپنی صورت یوں لگی
شہر کی پہچان یوں آساں ہوئی

منزلِ مقصود اوجھل ہو گئی
وہ اُٹھے تو ساری محفل اُٹھ گئی

وہ بھی اب محوِ ثنائے شیخ ہے
طرۂ و دستار کیا ، آنچل ، ردا

پھر ہجومِ بت گراں میں کھو گیا
ہر کوئی کچھ کہتے کہتے رک گیا

ایک پل دہلیز پر جو سر جھکا
جیسے ناکردہ گناہوں کی سزا

ہر گزر گہ ، منظرِ آہ و بکا
اور مسافر دور تک چلتا گیا

کون کس سے پوچھتا کس کا پتا
ایک راحت تھا یہاں مردِ خدا

## پروین شیر۔ ونیپگ کینیڈا

O

تہہ گرداب تو بچنا مرا دشوار ہے، پھر بھی
کنارے دور ہیں، ٹوٹی ہوئی پتوار ہے، پھر بھی

تھکن سے چور ہوں سر رکھ دیا ہے اُس کے سینے پر
مجھے معلوم ہے یہ ریت کی دیوار ہے، پھر بھی

متاعِ رشتۂ جاں کاروبارِ منفعت کب تھی
خریداروں کے حلقے میں سرِ بازار ہے پھر بھی

مری مٹھی میں نازک پنکھڑی محفوظ رہتی ہے
بچانا سنگ باری میں اسے دشوار ہے، پھر بھی

سمندر تشنگی کا اب سرابِ عشق میں ضم ہے
شکستہ حال میرا شیشۂ پندار ہے، پھر بھی

ترے لہجے کی شبنم جذب کر دے کچھ نمی اس میں
اگرچہ دل سلگتی ریت کا انبار ہے، پھر بھی

چراغِ آرزو ہے منتظر دہلیز پر میری
وہ دوری کے دھندلکوں میں بہت لاچار ہے پھر بھی

یہ مٹی چاک پر تھمتی نہیں ہے اتنی گیلی ہے
کٹھن یہ مرحلہ ہے کوزہ گر لاچار ہے، پھر بھی

## سید مشکور حسین یاد

○

پھر وہی رُخ ہے جو دیکھا نہیں جاتا ہم سے
دیکھ لیتے ہیں تو سمجھا نہیں جاتا ہم سے

دیکھتے ہی اُسے جانے ہمیں ہو جاتا ہے کیا
جان کر بھی جسے جانا نہیں جاتا ہم سے

وہ تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہے بے حد نزدیک
اُس تلک کس لیے پہنچا نہیں جاتا ہم سے

یاد گو اُس کی طرف سے ہے ہمیں دعوتِ خاص
دل میں اُس شوخ کے اُترا نہیں جاتا ہم سے

کونسی منزلِ رجعت ہے یہ کوئی تو بتائے
لوٹ آتے ہیں تو لوٹا نہیں جاتا ہم سے

سوچ کے کونسے چوراہے پہ ہم آگئے یاد
سوچنا چاہیں تو سوچا نہیں جاتا ہم سے

کس کو اس دہر میں سمجھا نہیں ہم نے مشکور
بس وہی ہے جسے سمجھا نہیں جاتا ہم سے

○

منزلِ کون و مکاں ایک سفر کی تھکن
جیسا کہ ہے آسماں ایک سفر کی تھکن

آج کے اخبار کی طرح ہیں یہ روز و شب
ایک خبر کا دُھواں ایک خبر کی تھکن

چلتا ہوا رُک گیا مجمعِ سر سبز شوق
باغ کا باغ اب تو ہے بارِ دگر کی تھکن

منزلوں کا روپ ہے اور قیامت کی دھوپ
گزری ہوئی بات ہے راہگزر کی تھکن

کوئی ازل یا ابد وقت سے آگے نہیں
شام کا سایہ ہے یاد ایک سحر کی تھکن

## محشر زیدی

○

وہ اِک نظر کہ مسیحا بھی ہے قضا بھی ہے
علاجِ درد بھی ہے دردِ لا دوا بھی ہے

سنور رہے ہیں مقابل میں آئینہ بھی ہے
یہ دیکھتے ہیں کوئی ہم کو دیکھتا بھی ہے

جہاں یہ زخم لگا ہے وہیں تلاش کرو
ہجوم ہی میں کوئی خنجر آزما بھی ہے

غرورِ حسن جدا ہے گدازِ قلب جدا
وہ تند خو ہی نہیں درد آشنا بھی ہے

خفا نہ ہوں تو میں یارانِ شہر سے پوچھوں
کہ اِس دیار میں رسم و رہِ وفا بھی ہے؟

گناہگار کے دل کا نہ پوچھئے احوال
کہ ناامید بھی ہے مائلِ دعا بھی ہے

یہیں کہیں سے کوئی ہاتھ مجھ کو تھامے گا
خدا کے بندے بھی موجود ہیں خدا بھی ہے

یہ کیا کہ پھر بھی تری جستجو نہیں کرتا
وفورِ شوق بھی ہے عزمِ بے ریا بھی ہے

ہے رنگِ بزم اِسی کشمکش کے پردے میں
جہاں چراغ جلا ہے وہیں ہوا بھی ہے

زیارت اُس گُلِ رعنا کی یاد رکھ محشر
بہشت بھی ہے قیامت کا سامنا بھی ہے

# انور شعور

○

غم ہیں کیا ، شادمانیاں ہیں کیا
کیا بتائیں ، کہانیاں ہیں کیا

وقت کی مہربانیاں کیا ہیں
اور نامہربانیاں ہیں کیا

ظلم پر لوگ اُف نہیں کرتے
ہائے یہ بے زبانیاں ہیں کیا

کیوں ہیں دل کی جراحتیں محفوظ
یہ کسی کی نشانیاں ہیں کیا

اس قدر اجتناب کیوں صاحب
ہم سے کچھ بدگمانیاں ہیں کیا

مسکرا کیوں رہے ہیں آپ شعور
یہ فقط لن ترانیاں ہیں کیا

○

کس کرب میں ہم ہیں یہ بتا بھی نہیں سکتے
اور اپنے مسیحا سے چُھپا بھی نہیں سکتے

پیتے ہوئے رہتی ہے سکت ہم میں نہ سُدھ بُدھ
پیمانہ گرادیں تو اُٹھا بھی نہیں سکتے

چھوڑا تھا یہیں اُس نے ہمیں منتظر اپنا
ہم اُٹھ کے یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتے

کیا خاک نشیں سے غرض افلاک نشیں کو
آ بھی نہیں سکتے وہ بُلا بھی نہیں سکتے

سامع ہوں سخن فہم تو پڑھتے ہیں ہم اشعار
یہ گوہر و الماس لٹا بھی نہیں سکتے

بھجوائی ہے ساقی نے شعور آج ہی اتنی
کل کے لیے تھوڑی سی بچا بھی نہیں سکتے

## عبدالجبار اثر

○

چھیڑ کر ذکرِ محبت زخم تازہ کردیا
اے بتِ بے مہر تونے ہائے یہ کیا کردیا

کیوں بھری محفل میں ڈالی مجھ پہ چشمِ التفات
آپ بھی رسوا ہوئے مجھکو بھی رسوا کردیا

ناصبوری کی سزا اب دیکھیئے ملتی ہے کیا
"کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کردیا"

تم نہیں تو کون تھا جس کے رخِ پُر نور نے
ہجر کی تاریک راتوں میں اجالا کر دیا

کیا بتائیں کیا کشش تھی اک نگاہِ ناز میں
اس نے پلکوں کو اٹھایا ہم نے دل وا کردیا

وقتِ رخصت وہ اچانک مڑ کے تیرا دیکھنا
ایک ہی ساعت میں کیسا حشر برپا کردیا

اب تجھے میں خواب سمجھوں یا وفا کا واہمہ
خود ہی اپنایا اثر کو خود ہی تنہا کر دیا

## عقیل دانش

○

اس مریضِ غمِ غربت کو سنبھالا دیدو
ذہنِ تاریک کو یادوں کا اُجالا دیدو

ہم ہیں وہ لوگ کہ بے قوم و وطن کہلائے
ہم کو جینے کے لیے کوئی حوالہ دیدو

میں بھی سچ کہتا ہوں اس جرم میں دنیا والو
میرے ہاتھوں میں بھی اک زہر کا پیالا دیدو

اب بھی کچھ لوگ محبت پہ یقیں رکھتے ہیں
ہو جو ممکن تو انھیں دیس نکالا دیدو

وہ نرالے ہیں کرو ذکر تم اُن کا دانش
اپنی غزلوں کو بھی انداز نرالا دیدو

## معظم سعید

O

پہلے تو ہوا عشق ملاقات کی حد تک
پھر ان کے ستم دیکھے کمالات کی حد تک

دیکھا تھا کسے خواب میں کچھ یاد نہیں بس
اک نقش تراشا ہے خیالات کی حد تک

موسم بھی پلٹ جاتے ہیں اب شہر سے باہر
آتی ہیں بہاریں بھی مضافات کی حد تک

بے مہر زمینوں میں کہاں دودھ کی نہریں
ہے تیشۂ فرہاد حکایات کی حد تک

اس شہر کی ہر شام ہے اک شام غریباں
ہر صبح پراسرار، طلسمات کی حد تک

کیسا ہے ستم آنکھ سے آنسو بھی نہ ٹپکیں
رونے کی سزا مرگ مفاجات کی حد تک

جگنو کی طرح حرف چمکتے ہیں لبوں پر
تاثیرِ محبت ہے کرامات کی حد تک

## شفق ہاشمی

O

اتر گئی ہے جو آخر نقاب چہروں کی
اُڑی اُڑی سی ہے رنگت گلاب چہروں کی

بدلتی رُت نے دیا ہے پیام پھولوں کو
کہ مستعار ہے سب آب و تاب چہروں کی

لہو غریب کا، غازہ ہے ان کے عارض کا
عجب ادا ہے یہ عزت مآب چہروں کی

خود آگہی کا سفر جانے کیسے طے ہوگا
شناخت ہو تو کبھی بازیاب چہروں کی

دھلا ہے زنگ کہیں آئینوں کا بھی اے دوست
تو خاک لوٹ کے آئے گی آب چہروں کی

یہ غمکدہ مرا روشن اُسی کے دم سے ہے
کہ جل رہی ہے جو قندیل خواب چہروں کی

ہر ایک عارض گل ہے شفق صحیفۂ درد
کھلی ہوئی ہے چمن میں کتاب چہروں کی

# ضامن جعفری۔ کینیڈا

O

سزا جزا کے ہیں یا بندگی کے قصّے ہیں
کچھ اختیار کے کچھ بے بسی کے قصّے ہیں

طِلسم خانۂ تخلیق ازل سے تا بہ ابد
سب، عشقِ ذات کے اور آذری کے قصّے ہیں

یہ جبرِ باد یہ ذرّوں کی دشت پیمائی
یہ سب مری تری آوارگی کے قصّے ہیں

سکونِ جہل کو دیکھا تو یہ ہُوا معلوم
کہ سنگ و خشت فقط آگہی کے قصّے ہیں

کتابِ عشق میں بابِ انا نہیں کوئی
دلوں پہ زخم لبوں پر ہنسی کے قصّے ہیں

دُکھی دِلوں کی سُنیں جب حکایتیں ضامن
مجھ لگا یہ مری زندگی کے قصّے ہیں

O

اے جذب! اے جنوں! کوئی جلوہ دکھائی دے
اب تا بہ کے خرد کا تماشہ دکھائی دے

ہر شخص ہے تصورِ منزل لیے ہوئے
منزل تو جب ملے کوئی رستہ دکھائی دے

مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہُوں سرِ ریگزار دشت
شاید غبار میں کوئی چہرہ دکھائی دے

پردہ تو امتحانِ نظر کا ہے ایک نام
بینا ہے وہ جسے پسِ پردہ دکھائی دے

عہدِ شباب جانے کب آکر نکل گیا
ہم منتظر رہے کہ وہ لمحہ دکھائی دے

ضامن سرشکِ غم میں ہے ماضی کی آب و تاب
یادیں مجھے، زمانے کو قطرہ دکھائی دے

## سلیم زاہد صدیقی

O

کیا بتاؤں کسی کو کیا ہوں میں
زد پہ آندھی کی اک دیا ہوں میں

ڈھونڈ کر خود کو ساری دنیا میں
تیری محفل میں آگیا ہوں میں

کچھ نہیں تھا تو کیا نہیں تھا میں
آکے دنیا میں سوچتا ہوں میں

میں نہیں تھا، مگر میں تھا پھر بھی
جسمِ خاکی سے ماورا ہوں میں

صرف دیکھو نہیں ، مجھے پرکھو
عقدۂ لا کُشا رہا ہوں میں

تیری فرقت کے تند جھونکوں سے
میرے محبوب ! بجھ گیا ہوں میں

دھوپ اور چاندنی کا فرق مٹا
ایسی منزل پہ آگیا ہوں میں

رشک سے مجھ کو دیکھنے والو !
اپنے ماں باپ کی دعا ہوں میں

میری صورت میں سبکی صورت ہے
ایک بے نقص آئینہ ہوں میں

تم سے اظہارِ مدعا کر کے
کیوں پشیمانِ مدعا ہوں میں

شکوۂ بے وفائی کیا تم سے ؟
خود سے بھی بے وفا رہا ہوں میں

میں ملا تو نہیں ہوں زاہد سے
ہاں ، مگر اس کو جانتا ہوں میں

## صوفیہ انجم تاج۔ امریکہ

O

تری یاد جو مرے دل میں ہے، بس اسی کی جلوہ گری رہی
مرا غم بھی تازہ بہ تازہ ہے مری شاخ فن بھی ہری رہی

تجھے اپنے پردۂ شعر میں اس ہنر سے کس نے سجالیا
کہ غزل کبھی تو ہر اک غزل تری خوشبوؤں سے بھری رہی

یہی زندگی مری زندگی یہی زندگی مری موت ہے
تری یاد بن گئی اک چھری جو میرے گلے پہ دھری رہی

تجھے شوق میرے کلام کا، تجھے پیار میرے ہنر سے تھا
تجھے میں نہ اپنا بنا سکی یہی میری بے ہنری رہی

کبھی انجم آئیں گے وہ بھی دن کہ خوشی کی بزم سجائیں گے
وہ جو آرزو مرے دل میں تھی وہ یونہی دھری کی دھری رہی

## محمد اویس ابن محمود بہاولپوری

O

ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوگا
دور مجھ سے وہ جب ہوا ہوگا

کیا خبر تھی کہ غم کے رستے پر
شہرِ دل بھی لٹا لٹا ہوگا

آج بیٹھا ہے یوں مقابل دِل
صاف لگتا ہے معرکہ ہوگا

اُن کی غم آشنا نگاہوں نے
بھیگا کاغذ بھی پڑھ لیا ہو گا

ابن محمود بھی تو کاغذ تھا
تیری آتش میں جل گیا ہوگا

## محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

# گریۂ شبنم

ماخوذ از یونس اُمرے

(ترک صوفی شاعر ۱۲۳۸ء۔۱۳۲۰ء)

چشمے رواں فردوسِ بریں میں مدھم مدھم
سیلِ رواں اِک نور کا عالم
بلبل کے نغمہ میں گونجا
باغِ ارم میں وِردِ مبیں کا نغمۂ پیہم
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

طوبیٰ کی پھیلی ہیں باہیں
جھوم رہی ہیں دائیں بائیں
موجِ صبا سے اس کی شاخیں
سبزہ وگُل ہیں عطر بداماں
خوشبو سے مخمور ہوائیں
ہونٹوں پر ہیں سب کے رقصاں
حمدِ الٰہی آیۂ قرآں اور صدائیں
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

لے کے ملائک خوان آتے ہیں
ذکر سے محفل گرماتے ہیں
حق سے لے کر بادۂ عرفاں
ساغر ساغر چھلکاتے ہیں

شعر و سخن کا عشق ہے عنوان
ہر میکش سرشار و غزل خواں
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

حوریں جیسے سروِ خراماں
باتیں ان کی مشک اور عنبر، سنبل و ریحاں
چہرے ہیں مہتاب بداماں
ان کے لبوں پر ایک ترانہ
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

یونسؔ تم ہو عاشقِ صادق، کشتۂ حق ہو
دل میں لیئے ایماں کی حلاوت
ظاہر باطن ہجر میں غلطاں
جب آئے گی وصل کی ساعت
تم میں کہاں ہے ضبط کی طاقت
روک سکو گے تم اشکوں کو؟
روک سکو گے عشق کا طوفاں؟
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

جو بھی چاہو حق کی خاطر

اس سے ہی مانگو جو کہ غنی ہے
سیدھی سچی راہِ ہدایت
اس کی ہی توفیق سے ممکن
حرفِ دعا پر ''کن'' کا امکاں
انشاءاللہ، اللہ، اللہ
گُل کا حسن اور رنگ اور خوشبو
ایک کنایہ گر تم سمجھو
بلبل کا دل عشق کا مسکن
ایک اشارہ، گر تم جانو
زیست کا اس کی ایک ہی حاصل، ایک ہی ارماں
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ
عرشِ بریں کا روشن جادہ
آٹھوں در جنت کے وا ہیں
رضواں لباسِ نور میں غلطاں
جنت کے، فردوس کے درباں
اور اٹھا اک نعرۂ رنداں، نعرۂ مستاں
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ
آنکھیں کیا کچھ دیکھ رہی ہیں
اس منظر پر میں ہی نہیں ''ماں باپ بھی قرباں''
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہر شے کی تخلیق کے باعث

''لا نبیؑ بعدی'' آپؐ کا فرماں
آپؐ کی اپنی شان کے شایاں
ہر نیکی، ہر خیر کے عامل
اخلاص و اخلاق کے حامل
اعلیٰ و ارفع، منصف و عادل
کفر اور باطل آپ سے لرزاں
کامل رہبر، کامل انساں
آئین و دستور کے بانی
علم و عمل کی روحِ معانی
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ
سارے نبی اور سارے پیمبر
آپؐ کے پیچھے صف بستہ ہیں
مسجدِ اقصیٰ جس پر نازاں
اللہ اللہ کیسی اذاں ہے
اللہ اکبر کیسی اقامت کیسی صلوٰۃ
اور کیسا سلام اور کیسی دعا ہے، کیسا سماں ہے
بال و پرِ جبریل بھی عاجز
آپؐ شبِ معراج جہاں ہیں
شافعِ محشرؐ، پیکرِ رافتؐ، رحمتِ عالمؐ
اور چراغِ رُشد و ہدایت

ظاہر و باطن نور کا پیکر
جانِ جہاں، جاناں جہاں ہیں
آپؐ کے در پر شاہ، گدا ہیں
آپؐ امامِ ہر دو جہاں ہیں
آپؐ ہیں میری زیست کا عنواں
آپؐ سمندر حسنِ عطا کا
جود و سخا کا ملجا و ماویٰ منبع و سنگم
میرے آقاؐ
میں ہوں اویسؔ اک ایسا سوالی
جس کی فغاں تاثیر سے خالی
سر سے پا تک عصیاں، حرماں
غرقِ ندامت، چاک گریباں
راہ فنا پر اُفتاں و خیزاں
خالی ہاتھ اور خالی داماں
چشمِ کرم کی بھیک کا خواہاں
کر دیں دل کے درد کا درماں
کاسۂ جاں کو بخش دیں آقاؐ
عشق کی بادہ، نشۂ عرفاں

میری سدرۃ آپؐ کا در ہے
میری تمنا آپؐ کا داماں
آپؐ کی خاکِ پا پر آقاؐ
میں ہوں سو سو جان سے قرباں
ساقی کوثر، آپ مجسم فرقاں و قرآں
"ارض و سماں کا نور خدا ہے"
بعد میں اس کے آپؐ ہی آقاؐ مہر درخشاں
آپؐ "چراغِ نور افشاں" اور "ماہِ کامل ماہِ تاباں"
میری شبوں کو عطیہ دیجے ایک کرن کا
قلب و نظر پر، کشتِ جاں پر قہرِ خزاں ہے
میرے آقاؐ، آپؐ خدارا کچھ تو کیجے
آپ ہی آقاؐ فصلِ گل ہیں
آپؐ ہی آقاؐ ابرِ بہاراں
قریۂ جاں میں ایک طلاطم
اور پلکوں پر گریۂ شبنم
میری زباں پر ورد ہے پیہم
صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ، اللہ، اللہ، اللہ، اللہ، اللہ، اللہ

-----

# امین راحت چغتائی

## کام ندی

سانسیں آگ کے شعلے جیسے
دم بولائے،
سدھ بسرائے
تھک تھک گرتے
چلتے جائیں
چلتے چلتے تھکتے جائیں
تھکتے جائیں، چلتے جائیں
تھکتے جائیں، چلتے جائیں،

---

کام ندی سے سیکھا ہم نے
چلتے رہنا
دھیرے دھیرے
ساحل کو چھو لینا پھر بھی
اپنی موج میں بہتے رہنا

---

کام ندی بھی ایک بھاونی[1]
کھیل گگن سے کھیلے[2]
کھیلے
ناؤ دیکھے، ناوک[3] دیکھے
ہلکوروں کو ترتی[4] جانے
ابھرے، اچھلے
خود ترتی بن جائے
لیکن
ایک ہی بھید بتائے سب کو
سارے دریا، سات سمندر
کام ندی سے نکلیں

---

[1] محبوبہ [2] موجوں کا اچھلنا [3] ملاح [4] رقص

## سحر انصاری

# لکھنا پڑھنا

کیا سیکھا تھا یوں لکھنا پڑھنا
اخباروں میں روز تباہی کی خبریں پڑھتے جائیں
انسانوں کی ذلت کے نوحے پیہم لکھتے جائیں
کس نے بھوک سے پسپا ہو کر جاں دے دی
کس نے کس کی عزت لوٹی
خوں آلود ہر اک بستی ہے
فریادوں کے لشکر نکلیں
نیند سے منصف پھر بھی نہ جاگیں
رشتے ناتے کچے دھاگے
مہر و محبت کے پیڑوں پر
پھول نہ پتے
گولی کی بوچھار کے آگے
لوگ نہتے
جو اپنی اوقات میں شاید زاغ و زغن سے بھی کم تر ہیں
پھول بدن والوں کی خاطر
خارِ مغیلاں کے بستر ہیں
عریانی فیشن ہی نہیں ہے
عریانی مجبوری بھی ہے
سیاروں کے بیچ نہ دیکھی ہوگی شاید
انساں سے انسان کی جتنی دوری بھی ہے
روز جہنم کے دروازے
نام پہ جنت کے کھلتے ہیں
موتی خاک میں یوں رُلتے ہیں
خاک کو بھی ہوتا نہیں کچھ غم
لالہ و گل بھی دیکھ رہے ہیں
انگاروں پہ رقصِ شبنم
لکھنا پڑھنا یوں سیکھا تھا
موت کی خبریں پڑھتے جائیں
زیست کے نوحے لکھتے جائیں

## پروفیسر حسن عسکری کاظمی

### روشنی کا سفر

سحر کہ جس کی تمنا ہے زندگی اپنی
کہیں سے ڈھونڈ کے لائیں تو کوئی بات بنے
وہ خواب خواب اجالا جو ہم نے دیکھا تھا
اسی بھی کاش ملے پیرہن حقیقت کا
یہ سرزمیں کہ ہے قائد کی آرزو کا جہاں
یہاں بہار کے خیمے ہمیشہ نصب رہیں
وہ اک پیام کہ رزقِ ہوا نہ ہو جائے
یہی پیام امانت ہے اپنے قائد کا
کوئی لبادۂ مذہب نہ اوڑھ کر نکلے
کسی کو فتویٰ تکفیر کی نہ جرأت ہو
کسی کے چہرے پہ غازہ نہ ہو تعصب کا
کوئی نہ فخر کرے رنگ و نسل پر اپنے
یہ سوہنی دھرتی ہماری ہم اس کے رکھوالے
کہ ہم ہیں اوّل و آخر اسی زمیں کے لیے
عدو کو ضد ہے کہ ٹکڑوں میں بانٹ دے ہم کو
ہمارا عزم تشخص کہ ہم موحد ہیں
ہماری زندہ اکائی نہ منقسم ہوگی
ہم ایک ہو کے جئیں گے تو سرخرو ہوں گے
اسی پیام اسی حرفِ معتبر کی قسم!
ازل سے تا بہ ابد ہے یہ روشنی کا سفر
اسی زمیں کی فضا نے ہمیں اجالا ہے
ہماری فکر و نظر کا یہی حوالہ ہے

## کرامت بخاری

### امن

میں شاعروں سے
رموزِ فطرت کے ساحروں سے
مفکروں سے قلم کے سارے شناوروں سے
یہی کہوں گا کہ وہ مسرت کا باب لکھیں
محبتوں کے اخوتوں کے مروتوں کے
نصاب لکھیں،
وطن کی مٹی کی خوشبوؤں سے گلاب لکھیں،
نئے زمانے کے خواب لکھیں
وہ کل جو لکھنا ہے آج لکھیں

\-\-\-\-\-\-\-

میں شاعروں سے رموزِ فطرت کے ساحروں سے
مفکروں سے قلم کے سارے شناوروں سے
یہی کہوں گا، کہ امن کی داستان لکھیں
محبتوں کی زبان لکھیں
جو ہو سکے تو تتلی کی سرخی کو نیلے ابر و بجلی کو لکھوں،
گلابی گالوں کو آدمیت پہ دان لکھیں

\-\-\-\-\-\-\-

میں شاعروں سے رموزِ فطرت کے ساحروں سے
مفکروں سے قلم کے سارے شناوروں سے
یہی کہوں گا کہ اپنی مٹی کی رفعتوں کا بیان لکھیں
کہیں یہ معلوم مسکراہٹ کو امنِ عالم کی جان لکھیں
جو ہو سکے تو تمام عالم کو ایک ہی خاندان لکھیں

## صوفیہ انجم تاج (امریکہ)

# اک سوال

میں روزِ ازل سے
نمودِ سحر کی تمنا کو جاں میں سموئے
ترے عہد و پیماں کے ایفا کی امید دل میں سجائے
سنہرے سے خوابوں کی گٹھری کو سر پر اٹھائے
کڑی دھوپ میں زندگی کی
غموں کو دُکھوں کو سہے جا رہی ہوں
چلی جا رہی ہوں
بہت پُر خطر رہ گزر ہے
زمیں تپ رہی ہے
تو سورج سے لاوے کا طوفاں رواں ہے
ہر اِک گام مشکل ہے کوہِ گراں ہے
مگر چل رہی ہوں کہ جذبہ جواں ہے
مگر حاکمِ شہر یہ تو بتا دے کہ کب تک
لہو کے مناظر، یہ دہشت، یہ وحشت
یہ ماؤں کی ویران گودیں
یہ گلیاں یہ معصوم جانوں کی قربان گاہیں
یہ خوں میں نہائی ہوئی بستیاں اور یہ کوچے
لہو رنگ راہیں
گھروں سے یہ اٹھتا دھواں اور کراہیں
یہ اشکوں کے سیلاب اور سرد آہیں
نہ قانون و آئین کی پاسداری
ہر اک فرد مظلوم، ہر اک بھکاری
مگر حاکمِ شہر تجھ کو خبر ہے
نمودِ ازل سے طلوعِ ابد تک
نہاں کا عیاں کا جہانوں کا سارے
بس اِک حکمراں ہے
وہ محشر کے میداں کا اکلوتا منصف
حساب آخرش تجھ سے مانگے گا
جب تیرے قول و عمل کا
تو تُو کیا کہے گا، بتا کیا کریگا ؟

## صابر عظیم آبادی

# رباعیات

ایسی بھی کرامات دکھاؤ نہ سکھی
یوں اپنی جوانی کو گنواؤ نہ سکھی
صندل کے تلے سانپ ہے بیٹھا دیکھو
اس پیڑ کو تم ہاتھ لگاؤ نہ سکھی

☆☆☆

نظاروں میں شامل ہیں تمہاری آنکھیں
اور دید کے قابل ہیں تمہاری آنکھیں
عشاق کو رہتی ہے شکایت تم سے
جلاد ہیں قاتل ہیں تمہاری آنکھیں

☆☆☆

مشکل میں کہاں کام ہیں آنے والے
بے درد ہیں یہ سارے زمانے والے
ہر شخص کو دیتے ہیں محبت سے جواب
ہم لوگ نہیں دل کو دکھانے والے

☆☆☆

یوں دوست اگر مجھ پہ ستم ڈھاؤ گے
پھر دیکھنا اک روز سزا پاؤ گے
انسان ہو تو اتنا تکبر کیسا
تم خاک کے ہو خاک میں مل جاؤ گے

☆☆☆

گرتے ہیں کبھی گر کے سنبھل جاتے ہیں
حالات کی بارش میں پھسل جاتے ہیں
رہتے جو نہیں اپنی روش پر قائم
وہ لوگ ذرا سے میں بدل جاتے ہیں

☆☆☆

تہذیب کا مفہوم بتانے کے لیے
خوابیدہ ثقافت کو جگانے لیے
کرنا ہیں تمہیں علم کی شمعیں روشن
دنیا سے جہالت کو مٹانے کے لیے

☆☆☆

تاروں سی چمک رکھتی ہیں پیاری آنکھیں
ہیں کتنی دلآویز کٹاری آنکھیں
تلوار کسی کی ہیں کسی کی ہیں خدنگ
اک جیسی نہیں ہوتی ہیں ساری آنکھیں

☆☆☆

ملیے اپنوں اور پرائے سے مدام
ہوتی ہے اس طرح شکایت بھی تمام
رکھنا ہے اگر سب سے تعلق بہتر
رکھیے ہر بندے سے دعا اور سلام

☆☆☆

# نقد و نظر

| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | تم جلاؤ تو دیا (شعری مجموعہ) |
| مصنف | : | سید ابرار حسین |
| مبصر | : | سید منصور عاقل |
| ناشر | : | منزل پبلی کیشنز۔ اسلام آباد |
| قیمت | : | ۲۵۰ روپے |

زیرِ نظر شعری مجموعہ کئی اعتبار سے ایک منفرد تخلیقی کاوش ہے۔ مشرق و مغرب میں شعری تخلیقات پر مشاہیر ادب نے اپنے نظریات بھی پیش کیے ہیں اور شعر کی تعریف بھی کی ہے مثلاً ایک عرب نقادِ سخن غالباً اسمعی شعر کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "شعر وہ کلام ہے کہ اگر کوئی اُسے سنے تو دل میں یہ خیال کرے کہ ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں مگر جب کہنا چاہے تو نہ کہہ سکے" مولانا حالی کا تصورِ شعر بھی کم و بیش اسی نوع کا ہے۔ حالی کے ہم عصر اور رفیق خاص پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی جنھیں سر سید مرحوم سے بھی قربت کا شرف حاصل تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ان کا ارشاد ہے کہ "نفیس الفاظ کا انتخاب اور اُن الفاظ کے سانچے میں گہرے اور بلند خیالات ڈھالنا اور تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ معنی آفرینی اور جذبات و خیالات کی دنیا میں ہلچل ڈال دینا شاعر کا کام ہے" مغرب کی مسلم الثبوت علمی شخصیت لارڈ میکالے کے خیال میں شاعری کی ایسی جامع تعریف ناممکن ہے جس کا اطلاق شعر کے ہر پہلو اور ہر صورت پر کیا جا سکے

تاہم میکالے نے شاعری کو مصوری اور بت تراشی سے مشابہ قرار دیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹینکا نے شاعری کے بارے میں بالعموم اگر کسی ''تعریف'' کا تعین کیا ہے تو وہ یوں ہے کہ ''منظوم و مقفیٰ عبارت میں انسانی جذباتِ لطیفہ کا اظہار شاعری ہے''

انگریز شاعر شیلے کی متعین کردہ تعریف قافیہ کی پابندی سے مشروط نہیں۔ اُس کے خیال میں ''شاعری فطرت کی ڈھکی چھپی دلفریبیوں کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتی ہے'' البتہ انگریزی ادب کے ایک نہایت معتبر اُستاد اور نقاد ڈاکٹر جانسن صرف منظوم و مقفیٰ شاعری کو تسلیم کرتے ہیں جب کہ کارلائل شاعری کو ''موسیقانہ خیال'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ افکار و نظریات کے اس تناظر میں علامہ اقبالؒ کا درج ذیل شعر اردو اور فارسی شاعری کے سیاق و سباق میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است　　　شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

------

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زیرِ نظر مجموعۂ شعری کے خالق سید ابرار حسین حضرت علامہ اقبالؒ کے تصورِ شعر سے بڑی حد تک معنوی ہم آہنگی رکھتے ہیں جس کا ترجمان اُن کا یہ شعر ہے۔

فکر کو جذبے کی لَو آنچ نہ دے گی جب تک　　　شعر کی ضو بھی مرے پاس نہیں آئے گی

------

سید ابرار حسین نے اسی تصورِ شعر کا اقرار اپنی کتاب کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''فکر اور جذبہ کی آمیزش کو جب الفاظ کا خوبصورت پیرہن ملتا ہے تو شعر تخلیق ہوتا ہے''

''تم جلاؤ تو دیا'' تمام تر اس تصورِ شعر کا برملا ثبوت ہے اور کم از کم مجھے اس کے باوجود کہ شاعر نے کہیں بھی اپنی شعر گوئی پر اظہارِ تفاخر نہیں کیا ہے اور عجز و انکسار ہی اُن کی طبیعت کا تقاضا نظر آتا ہے۔ پورے مجموعہ میں ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آیا کہ جس میں سطحیت پائی جاتی ہو۔ اس اعتبار سے اُن کا کلام منفرد ہے جس کا آغاز حمد و نعت سے اور اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے بلکہ نعتیہ اشعار نے اکثر و بیشتر حُبِ رسولؐ کی خوشبو سے اُن کی غزلوں کو بھی مہکا دیا ہے۔ ایک نعتیہ نظم

بعنوان ''روشنی'' سے اشعار ملاحظہ ہوں:

ذات ، پیغامِ سعادت کا ثبوت　　نورِ سیرت ، روشنی ہی روشنی
نقشِ پا ہیں کہکشاں در کہکشاں　　خاکِ پا بھی اُن کی ٹھہری روشنی
اُن سے ہی صبحِ ازل کا حسن ہے　　اُن سے ہی شامِ ابد کی روشنی

------

ایک غزل جس کی معروف ردیف کی تخلیق کا سہرنواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد و نورتن اور داماد نواب مرزا سائل دہلوی کے سر ہے اسی ردیف میں ابرار صاحب کا درجِ ذیل نعتیہ شعر کس قدر سلیقہ، ارادت اور فنی حسن کا مظہر ہے ملاحظہ ہو:

اُسے اُمی لقب کہہ کر بھی شہرِ علم گردانوں　　کہ ناموسِ قلم وہ بے قلم یوں بھی ہے اور یوں بھی

------

ایک اور غزل کا نعتیہ مطلع جو ابرار صاحب کے حُبِ رسول کا عکاس ہے:

تمہیں جو آسماں پر کہکشاں معلوم ہوتی ہے　　ہمیں وہ ان کے قدموں کا نشاں معلوم ہوتی ہے

------

نواب سائل کا مقطع ہے:

تجھے نواب بھی کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں　　زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

------

جناب ابرار حسن اپنے مجموعۂ شعری کا اختتام خضوع و خشوع سے معمور اس دعا پر کرتے ہیں

عطا الفت کا ایسا نور فرما　　دلوں سے ہر کدورت دُور فرما
نہ ہو سینوں میں نفرت اور تعصب　　محبت سے ہمیں معمور فرما
ہر اک بیمار کو صحت عطا کر　　ہر اک ناشاد کو مسرور فرما
الٰہی فتح و نصرت کو ہمیشہ　　ہمارے واسطے مقدور فرما
ترا فضل و کرم ہم پر ہو دائم　　ہماری التجا منظور فرما

------

میں نے زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ شاعر فکری تنوعات کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں نیز موضوعاتِ اظہار کو حسین فنی سانچوں میں ڈھالنے کے قرینوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہ انفرادیت بھی اُن کا اختصاص ہے کہ وہ روایتاً غزل کے اشعار کی تعداد طاق رکھنے یا تعداد کم سے کم پانچ رکھنے کے قائل نظر نہیں آتے چنانچہ اُن کی متعدد غزلیں پانچ سے کم اشعار پر بھی مشتمل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی اس احتیاط اور سلیقہ مندی نے اُن کی شاعری کو جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ معیار فکر و فن اس مجموعہ کی شناخت بن گیا ہے فکری تنوعات کے ضمن میں اخلاقی اقدار۔ کردار کی عظمت اور حب الوطنی اُن کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ مثلاً

تیرگی میں بھی چمک ساتھ لیے پھرتا ہوں ‏ ‏ اک دیا آج تلک ساتھ لیے پھرتا ہوں

مجھ میں رچ بس گئی ہے خاک وطن کی خوشبو ‏ ‏ میں یہ مٹی کی مہک ساتھ لیے پھرتا ہوں

ساتھ رہتا ہے میرے سبز ہلالی پرچم ‏ ‏ چاند تارے کی دمک ساتھ لیے پھرتا ہوں

ہے مرے دیس کی الفت کا خزینہ مرے ساتھ ‏ ‏ میں زمیں پر بھی فلک ساتھ لیے پھرتا ہوں

------

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر کے سفارتی منصب کا عکس صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے جنھیں ان کے عزم و استقلال اور نسبی وجاہت و تربیت نے اخلاقی حیات کو زندگی میں مشعل راہ بنانے کی سعادت نصیب فرمائی نیز طہارت فکر اور عظمت کردار سے فیضیاب کیا:

ہر سو وفا کے پھول کھلاتے ہوئے چلیں ‏ ‏ سب خار و خس چمن سے ہٹاتے ہوئے چلیں

جینے کا ڈھنگ، مرنے کی جرأت، وفا کے طور ‏ ‏ آؤ زمانے بھر کو سکھاتے ہوئے چلیں

پھر آندھیوں کی زد میں ہے اخلاص کا چراغ ‏ ‏ آؤ پھر اس کی لو کو بڑھاتے ہوئے چلیں

------

الم کا، سوز کا، تنہائیوں کا ساتھی ہو ‏ ‏ کوئی تو درد کی شہنائیوں کا ساتھی ہو

مرے خدا کوئی دشمن نصیب ہو ایسا ‏ ‏ جو میرے ظرف کی پہنائیوں کا ساتھی ہو

ہمارے شہر میں ہے کون ایسا یوسف ظرف ‏ ‏ جو اپنے دشمن جاں بھائیوں کا ساتھی ہو

------

جو شخص خطا کر کے پشیماں نہیں ہوتا　　سچ یہ ہے کہ وہ صاحبِ ایماں نہیں ہوتا

کچھ ایسے گزر آئے رہِ سود و زیاں سے　　ناراض بھی دنیا ہو تو نقصاں نہیں ہوتا

انسانیت اور زر میں تعلق نہیں کوئی　　بت سونے کا ہو پھر بھی وہ انساں نہیں ہوتا

ہوتی نہیں شاہوں کی گداؤں سے خوشامد　　اُس در پہ چلو جس در پہ کہ درباں نہیں ہوتا

------

مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ شعری ذوق رکھنے والے قارئین کو اس مجموعۂ شعری میں فنکارانہ سوچ سے مزّین اشعار اور مصرعے جیسے ''بُت سونے کا ہو پھر بھی وہ انسان نہیں ہوتا' جا بجا ملیں گے۔ لفظوں کو معنوی پس نظر کی وسعت دینے کے ساتھ ساتھ حسنِ ظاہر و باطن سے غزل کو مرصع کرنے کی صلاحیت بھی شاعر کو ودیعت ہوئی ہے۔

دولت فقر مرا زاد سفر ہے یارو　　یہ بھی چھن جائے نہ مجھ سے مجھے ڈر ہے یارو

حسن وہ رنگ ہے جو حسن عمل سے جھلکے　　جس میں خوشبو نہ ہو وہ کیا گُل تر ہے یارو

مُرتعش اس سے بھی ہو جاتی ہے احساس کی جھیل　　کیسی پتھر یہ زمانے کی نظر سے یارو

پھیلتے سائے سمٹتی ہوئی کرنوں کا سماں　　صاف کہتا ہے کہ یہ شام نگر ہے یارو

-----

شرم سے چہرہ اُفق کا سُرخ ہو جاتا ہے روز　　ڈھانپنے آتی ہے جب دنیا کو ظلمت شام کی

-----

بات تھی خاصی پرانی زخم بھی تازہ نہ تھا　　دل نہ سنبھلے گا کبھی لیکن یہ اندازہ نہ تھا

کس طرح باہر نکلتے ذات کے زنداں سے لوگ　　آگہی کھڑکی نہ تھی احساس دروازہ نہ تھا

تھا نگارِ شام کا سب حسن مرہونِ شفق　　صبح کے پُر نور چہرے پر کوئی غازہ نہ تھا

------

غزل کے باب میں لہجہ و اُسلوب اور عمیق حسیت کے پہلو جس انداز سے تراشے گئے ہیں وہ شاعر کے جذبہ و تخیّل کی وسعتوں اور تنوعاتی آہنگ کے عکاس ہیں۔ ان میں نہ تکلف ہے نہ تصنّع۔

روشن رہی ہے محفل یاراں تمام رات — جلتا رہا ہے شہر غریباں تمام رات
یہ اور بات آنکھوں کے آگے پڑا رہا — سچائیوں کا لاشۂ حرماں تمام رات
لیکن مرے وطن ترے شاعر ترے ادیب — تھے وقفِ مدح زلفِ پریشاں تمام رات
لب پر شکایت غم ہجراں تمام دن — دل میں حکایتِ غم جاناں تمام رات
کہتے رہے فسانۂ ابرو تمام روز — پڑھتے رہے قصیدۂ مژگاں تمام رات
ٹپکا نہ اشک دیدۂ احساس سے کوئی — دل تھا حضورِ یار غزل خواں تمام رات
دیکھا ہے میں نے آج بھی رہتے ہیں محوِ رقص — انسانیت کی لاش پہ انساں تمام رات

------

اس غزل کے تمام اشعار ایک ہی فکری تسلسل کے مظہر ہیں اور شاعر کا یہ اُسلوبِ ابلاغ زیر نظر مجموعہ کا طرۂ امتیاز ہے قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ شاعر نے کس طرح مختلف رویوں کو غزل کے پیکر میں تسلسل عطا کیا ہے جسے ہم نظم کی صنفی خوبصورتی بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اب دیکھیے غزل کے شناختی وصف یعنی غنائیت کی صورت گری:

یہ کیا بتاؤں کہ ہے کس کتاب میں ترا عکس — ہے لوحِ ذہن پہ یادوں کے باب میں ترا عکس
چمن میں جاؤں تو کیونکر نہ یاد آئے تری — سمن میں ہے تری خوشبو گلاب میں ترا عکس
تو عمر ہے تو مہ و سال گردِ راہ تری — تو زندگی ہے تو دیکھوں حباب میں ترا عکس
میں لاکھ اپنے تصور کے راستے بدلوں — مگر ہے یاد کے ہر اک سراب میں ترا عکس
ہر ایک حسن میں صورت دکھائی دے تیری — ہر آبشار میں ہر جوئے آب میں ترا عکس
خدا کرے کہ وہی خواب زندگی بن جائے — نظر جو آئے کبھی مجھ کو خواب میں ترا عکس

------

زیرِ نظر شعری مجموعہ مختصر سہی لیکن شاعر کے کثیر الجہتی ادراک و شعور نے ایسے رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ بنا دیا ہے جو زندگی کی معاصر حقیقتوں کے احساس اور مستقل نگاہی کے اوصاف کی خوشبو سے معمور و معطر ہے۔

آثار کچھ ایسے ہیں کہ تیرا کرم اس بار کچھ ہم پہ بھی اے گردشِ ایام رہے گا

-----

سیکھے نہیں نظر نے زباں کے چلن ابھی تلخی پہ کیا مٹھاس کا ہو پیرہن ابھی

کیا ہم سے تیرا سرد رویہ ہے زندگی کہدوں تو جل اُٹھے گا ترا تن بدن ابھی

-----

زندگی کون ہے جو تیرے شہیدوں میں نہیں کون ٹھہرا ہے ترے تیرِ نظر کے آگے

-----

دیکھا ہے کتنے چہروں میں اے زندگی تجھے کتنے ہیں تیرے رنگ بتانا محال ہے

نذرِ فریب ہم کہ فریبِ نظر ہے تو دنیائے دلفریب یہ کہنا محال ہے

------

سید ابرار کے نصاب شاعری میں غزل کے بعد اصافِ نظم بھی شامل ہیں جن میں پابند نظموں (مقفیٰ و مردّف) کے علاوہ آزاد نظمیں بھی شامل ہیں اور جیسا کہ حواشی سے ظاہر ہے یہ نظمیں مختلف ممالک میں اُن کی سفارتی تعیناتی کے دوران کہی گئی ہیں۔ نظم ''پراگ'' جاذب توجہ ہوئی اور کیوں تو ملاحظہ فرمایئے۔

یہ پراگ ہے
جو بقول گوئٹے
ہے تاج عالم کا خوبصورت ترین ہیرا
کہ جس کی تعمیر میں مقید
یہاں پہ اٹھارویں صدی ہے

کہیں پہ موسیقی
منجمد ہو کے
اک عمارت میں ڈھل گئی ہے
کہیں محل ہے
مگر جو دیکھو قریب جا کر
تو گویا پیاری سی اک غزل ہے

------

ایک اور نظم ''محبت'' ہے جس کے سوزِ خلوص اور مترنم آہنگ نے مجھے متاثر کیا ایک بند جو معنوی آفاقیت کا مرقع ہے:

محبت زندگی ہے زندہ رہنے کا سلیقہ ہے
محبت بندگی ہے شکر کرنے کا طریقہ ہے

اس مجموعۂ کلام کا بیتی وقار شاعر کے فارسی ادب کے مطالعہ کا مرہونِ منت ہے شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے روحانی مُرشد مولانا جلا الدین رومیؒ کو ابرار صاحب نے ایک فارسی نظم میں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اپنی ارادت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

رومیؒ والا گہر عالی مقام از مزارش قونیہ را احترام
گلشنِ دل را بہارِ زندگی تشنگاں را آبشارِ زندگی
اُوکہ بالاتر ز ماہ و سال بود مُرشدِ اقبال با اقبال بود
فیض می یابد از آں خوش خصال اہلِ دل اہلِ نظر، اہلِ کمال

------

ایک اور نظم کا ذکر کرنا چاہوں گا جو 'نوحہ نگاری' کی ذیل میں آتی ہے۔ یہ نظم بھی شاعر کی ارادت وعقیدت کا شاہکار ہے جو ۲۸ اشعار پر مشتمل ہے اس کا لسانی پس منظر بھی "فارسی ہیں تابینی نقش ہائے رنگ رنگ" کے تنوعات فکر سے مملو ہے اگر چہ ذریعۂ اظہار اردو ہے:

آسمانِ حیات کا وہ نور اب سرِ بزم کہکشاں نہ رہا
مہر تھا، ماہ تھا، کہ تارا تھا جو سرِ بزم آسماں نہ رہا
ایک شفقت کا استعارہ تھا جو سرِ محفلِ جہاں نہ رہا
نیکیاں کچھ سمیٹ لو جب تک یہ ندا آئے کہ فلاں نہ رہا

------

آخری شعر سعدی شیرازیؒ کے شعر کا خوبصورت ترجمہ ہے جو شاعر کی بلاغتِ فکر اور مہارت فن کا مظہر ہے۔ شیخ فرماتے ہیں:

خیرے کُن اے فلاں وہ غنیمت شمار عمر زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

------

ترجمہ کا یہ رجحان غالب اور اقبال کے یہاں بھی نظر آتا ہے بلکہ غالب نے تو خود اپنے فارسی کلام کے بیشمار تراجم کیے ہیں صرف دو اشعار پیش خدمت ہیں:

اے گل جو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند آں رو یہا کہ در تہہ خاکِ فنا شدند

(فارسی)

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں خواب میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

(اردو)

------

گفتی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

(فارسی)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(اردو)

------

آخر میں ایک خاص فکری عنصر کی طرف اشارہ واجب ہے کہ ''تم جلاؤ تو دیا'' کے شاعر کا واضح اختصاصِ کلام ہے کہ اُن کی شاعری میں واعظ وزاہد یا رقیب وعدو جیسی ''ہستیوں'' کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا اور یہ بھی کم ہی نظر آئے گا کہ ان کا محبوب قاتل یا خونخوار ہو یا ظلم وستم کا خنجر بدست پیکر ہو چنانچہ اسی طہارتِ فکر نے اُن کی شاعری کو تازگی اور رجائیت عطا کی ہے:

کب اندھیروں سے اجالوں کا سفر رُک پایا سپر انداز ہر اک شب ہے سحر کے آگے

**کتاب : یہاں سے آگے (ناول)**

**مصنف : نجم الثاقب**

**مبصر : فرزانہ خان**

**ناشر : سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور**

اردو ادب میں گنتی کے چند ناول ہی ایسے ہیں جو ناول کے تمام لوازمات پورے کرنے کے

ساتھ ساتھ کوئی نئی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غزل اور نظم میں بے شمار آوازیں، بے شمار شعراء، ایک سے بڑھ کے ایک شاعر! اسی طرح افسانے میں معیاری ادب کی بے شمار مثالیں۔ ناول اس لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ غالب، میر، اقبال، فیض، راشد، مجید امجد، منیر نیازی، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، سلیم احمد، عطا شاد، عین سلام سے شروع کریں۔ تو سودا، مصحفی، درد، یگانہ کے نام آنکھوں کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ ذوق اور ریاض خیر آبادی کی طرف نگاہ نہ اٹھے تو برا لگتا ہے۔ پھر حالی، جوش سے شروع کریں تو بات کرتے ہوئے اچانک مصطفیٰ زیدی، احمد مشتاق، شکیب جلالی، احمد فراز، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور امداد آکاش، کشور ناہید، بیرم غوری، عباس تابش، عرفان بیگ، وحید احمد، طارق نعیم اور نجم الثاقب یاد آجاتے ہیں ابھی احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ ایک جہان ہے شاعری کا ایک سے بڑھ کے ایک!

دوسری طرف کرشن چندر، کنہیا لال کپور، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، انتظار حسین ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ افسانے اور کہانی کے ستون بنے نظر آتے ہیں۔ منشایاد، احمد داؤد، ہاجرہ مسرور، اکرام اللہ، انور سجاد اور شوکت صدیقی کو دیکھیں تو خالدہ حسین، ممتاز شیریں، رشید امجد، نیلوفر اقبال اور مرزا حامد بیگ کے ساتھ خادم مرزا اپنے معیاری ادب سے افسانے کی ساکھ قائم رکھے ہوئے ہیں اور جب ناول، معیاری ناول اور ادبی ناول کی بات ہو تو قرۃ العین کے ''آگ کا دریا'' سے بات شروع ہوتی ہے اور عبداللہ حسین کے ''اُداس نسلیں'' کے قصے تک پہنچتی ہے۔ انتظار حسین کی ''بستی'' سے جونہی گذریں تو بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے آگے خدیجہ مستور کا ''آنگن'' ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ایک آدھ ناول کو مان لیتے ہیں اور امراؤ جان ادا بھی ایک ناول ہی ہے۔ اضافہ کرنے کی خواہش ہے تو عزیز احمد کی ''آگ'' کو بھی شامل کر لیجیے۔ یعنی گنے چنے چند ناول! ادبی، معیاری، چند ناول، ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب تو ڈاکٹر سلیم اختر، مسعود اشعر یا آصف فرخی ہی دے سکتے ہیں۔ ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے میں اتنا جانتی ہوں کہ اردو ادب میں معیاری ناول زیادہ تعداد میں نہ

ہونے کی بنیادی وجہ معیاری، ادبی ناول لکھنے کی دقت ہی ہے۔ صلاحیت کا نہ ہونا بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ لیجیے، مستنصر حسین تارڑ کا ''بہاؤ'' بھی شامل کر لیتے ہیں۔ ''وحشتِ سوس'' بھی ایک ادبی ناول ہے۔ لیکن بات جب ناول کی آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ تعداد میں بہت کم، معدودے چند! وہ جو رضیہ بٹ، حمیدہ جبیں اور مینا ناز وغیرہ کے ناولوں کو پڑھتے اور سراہتے ہیں۔ اُن سے دست بستہ گزارش ہے کہ یہ ''معاشرتی'' ناول ہیں۔ بات مقبول ہونے کی نہیں، ادب اور معیاری ادب کی ہے۔ ابن صفی، جاسوسی ناولوں میں ایک معتبر نام ہے۔ نسیم حجازی ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ بحث نہیں کرنی حقیقت تسلیم کرنی ہے۔ دوسری طرف آج کی نوجوان نسل جو چند صاحبان کی شاعری وغیرہ کو فیس بک پہ چڑھا کے اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کرتے ہیں ان کی بات نہیں ہو رہی۔ نہ ہی ان کی بات ہو رہی ہے جو جوش کی شاعری پڑھے بغیر اقبال کے بعد کسی اور کو بڑا شاعر ہی نہیں مانتے۔ اُن کی بات بھی نہیں ہو رہی جو شاعری کے انتخاب کی کسی بھی کتاب میں اپنا نام ڈھونڈتے ہیں اور اگر اس میں اپنا نام نظر نہ آئے تو کتاب کونے میں پھینک دیتے ہیں۔ بات معیاری ادب کی ہو رہی ہے۔

ناول ہے ''یہاں سے آگے'' جسے نجم الثاقب نے نہایت خموشی مگر بڑے اہتمام سے سنگِ میل پبلیکیشنز سے ۲۰۱۱ء میں چھپوایا۔ آج اُس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء میرے سامنے ہے۔ کون کہتا ہے کہ معیاری ادب پڑھا نہیں جاتا۔ دو ایک سال میں دوسرا ایڈیشن آ جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں ادب، معیاری ادب پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں۔

بلھے شاہ اور خواجہ فرید جیسے بلند پایہ شعراء کے کلام کی خوبی ایک یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اُن کی شاعری ہر خاص و عام کو پسند آتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی مرضی کے رنگ چُن لیتے ہیں۔ ''یہاں سے آگے'' کا عالم بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ۲۰۱۱ء میں یہ ناول میں نے چند لوگوں کو تحفتاً دیا، سب متاثر ہوئے اور اس ناول کے ادبی پہلوؤں پر ہم نے پہروں گفتگو کی۔ لیکن بات یہاں نہیں رکتی میری ایک دوست کے گھریلو ملازم نے یہ ناول پڑھا، صبح سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ

''بیگم صاحبہ'' کہہ کے اس نے میری دوست سے کہا ''اس میں تو میری کہانی بھی ہے۔ میں تو روتا رہا ہوں۔ پوری رات پڑھتا رہا ہوں۔ ابھی ختم کیا ہے''۔!

ہمارے خیال میں انتظار حسین اس دور کے بڑے نثر نگار ہیں۔ آپ اتفاق کریں یا نہ کریں، اُن کے مایۂ ناز انداز بیان، موضوعات اور قلم کی وسعت کے قائل جانتے ہیں کہ ''بستی'' نے ناول کے کئی گاؤں بسائے ہیں۔ یہی انتظار حسین ''یہاں سے آگے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہاں سے آگے'' ناول کے تمام لوازمات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں سے آگے کی طرف ایک واضح اشارہ بھی کرتا ہے۔ ''کیا ہے'' اور ''کیا ہونا چاہیئے'' کی اُلجھتی گتھتی گتھیوں کی منزل سہولت سے طے کرتا ہوا یہ ناول اُردو ادب میں ایک گران قدر اضافہ ہے''

''یہاں سے آگے'' اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کسی معیاری ناول سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ یہ ''کیا ہے'' بھی بتا رہا ہے اور ''کیا ہونا چاہیئے'' کی گتھیوں کو سلجھا بھی رہا ہے۔ نثر نگار، جب نثر لکھتا ہے تو اس کی زمینیں اور بنیادیں نثر کے علاقوں میں ہی پیوستہ ہوتی ہیں، لیکن جب ایک شاعر نثر نگاری کرتا ہے تو اس کی تحریر کا مقام حد نظر پھیلی زمین کے اختتام پر نکلتے ہوئے سورج کی پہلی کرنیں متعین کرتی ہیں۔ نجم الثاقب میری نظر میں بنیادی طور پر اور فطری طور پر شاعر ہیں۔ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر، ان کا ایک شعر سنیئے

سورج کیسے اور کہاں سے نکلے گا مجھ سے پوچھو میں نے رات گزاری ہے

-----

نجم الثاقب نے رات گزاری ہے تاہم ''فطری طور پر شاعر'' کو ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ شاید طویل بات کرنی ہو، تسلسل برقرار رکھتے ہوئے، اور یہاں سے آگے کا راستہ دیکھنا اور دکھانا ہو تو غزل اور نظم سے بات نہیں بنتی۔ معلوم نہیں کتنی راتیں گزاریں اور نجم الثاقب نے یہ ناول مکمل کیا۔ فراست رضوی ''یہاں سے آگے'' پر بات کرتے ہوئے جو کہتے ہیں، وہ ناول کو پڑھ کے بالکل سچ لگتا ہے ''یہاں سے آگے'' نجم الثاقب کا پہلا ناول ہے لیکن اپنے اسلوب، بُنت اور تکنیک

کے اعتبار سے یہ کسی کہنہ مشق ناول نگار کی تخلیق محسوس ہوتا ہے۔ اس کی تکنیک اتنی طاقتور ہے کہ قاری کو ناول کے آغاز سے ہی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے"

"چونکہ ناول کا مصنف شاعر ہے اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی اپنے بیان سے کسی بڑی حقیقت کی علامت میں تبدیل کر دیتا ہے۔"

"یہ مجموعی طور پر ایک اعلیٰ درجے کا ناول ہے۔ جس میں حنوط شدہ تتلیوں کی صورت میں تقدیر کے جبر اور فنا کے تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وطن کی مٹی سے محبت کا درس بھی ہے اور مادّیت کے مقابلے میں روحانی اقدار کی فضیلت کا بیان بھی ہے۔ انسانی رشتوں کی شکست و ریخت بھی ہے اور انسانوں کی ناکام آرزوئیں بھی ہیں۔ جدید زندگی اور جدید تہذیب کے تضادات اور مُنافقین بھی ہیں۔ دیہات کی زندگی سے محبت کا اظہار بھی اور مغرب کے جھوٹے معیارات بھی ہیں۔ زر پرست معاشرے کی سفاکیاں بھی ہیں۔ پنجاب کے پڑھے لکھے مڈل کلاس خاندانوں کی قدریں اور مسائل بھی ہیں۔ کامیابی کے مادی اور دنیاوی معیارات کا کھوکھلا پن بھی ہے اور نائن الیون کے بعد کی دنیا کا چہرہ بھی ہے"

"اس ناول کے ذریعے نجم الثاقب نے قاری کو یہ پیغام دیا ہے کہ مسرت کا تعلق کثرتِ زر سے نہیں ہے بلکہ خوشی سچے انسانی رشتوں اور عملِ خیر میں ہے"

فراست رضوی مزید کہتے ہیں "میں پورے اعتماد کے ساتھ نجم الثاقب کے ناول "یہاں سے آگے" کو اُردو کے اعلیٰ ترین ناولوں کی صف میں ایک اضافہ قرار دوں گا"۔!

نجم الثاقب نے "یہاں سے آگے" اپنے جنون کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے لکھا ہے اور صرف گھر تک نہیں پہنچے، وسعتِ بیان میں پورے جہان کو سمیٹا ہے اور سمیٹا بھی کچھ ایسے ہے کہ سب کو سمجھ بھی آجائے۔ نجم الثاقب نے اپنے شعر

یہاں سے آگے تو راستہ ہے　　یہاں سے آگے کہاں کو جائیں

-----

میں نے جس راستے کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کی تفصیل نائن الیون کے بعد کی دنیا کو سمجھ کر واضح کیا ہے۔ نیویارک، سیالکوٹ اور گاؤں، اس تکون میں زندہ رہنے والے ولید کا قصہ کچھ اس دلچسپ انداز میں سنایا ہے کہ شکھاں رنگ والی کے دکھ سے لے کر Blaise Pascal کے ریاضیاتی دماغ کی الجھنوں کو بھی نہایت سہولت سے ساڑھے سو صفحات میں سمو دیا ہے۔ اس ناول کے کسی بھی باب کو پڑھ لیں، ایک مکمل کہانی ملے گی۔ فلیش بیک میں لکھا ہوا یہ ناول جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ ساری باتیں، سارے فلسفے، ساری حقیقتیں، سارے راز، کرداروں کے ذریعے آسان زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ مکالمے اس قدر طاقتور اور دلیلوں سے بھرپور ہیں کہ جگہ جگہ نظر ٹھہرتی ہے اور دل چاہتا ہے یہ بات ہمیں ہمیشہ کے لیے یاد رہ جائے۔ جُورا فقیر، ماسی حاجراں، شفیقا قصائی، ماسٹر پیراں وسایا، ولید، عارف، نذرو بنگالی، مریم راجپوت، سدرہ، پروفیسر حیدر، ڈاکٹر تبسم، سیٹھ صبغت اللہ، صبا، نیناں، جینی اور پروفیسر آرتھر کے علاوہ کرداروں کا ایک جمِ غفیر ہے جو ایک دوسرے سے جڑے نظر آتے ہیں اور ناول میں اپنے اپنے کردار کی ساری توجیہہ لے کر نمودار ہوتے ہیں اور جو کہنا تھا، کرنا تھا وہ کہہ کے، کر کے چلے جاتے ہیں۔ بلا کا ربط ہے کہانی میں، کہیں بھی قاری کا دماغ اِدھر اُدھر نہیں جاتا کہ یہ کیسے ہوا؟ وہ کیا؟ کیسے تھا؟ ہر وقت ایک ہی دُھن لگی رہتی ہے ''اب کیا ہوگا؟'' میں نے یہ ناول کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ ایک اچھے شعر کی طرح یہ ناول بار بار دہرایا جا سکتا ہے۔

مکالمے کا ذکر اوپر آیا تو آپ کو ایک جھلک دکھاتی ہوں دیکھیے کہ اس مکالمے میں علم، تجربہ، دانش اور ان کے ساتھ مکالمے کا ایک اچھوتا حُسن، کہ پتہ ہی نہیں چلتا یہ مکالمہ ''لکھا گیا ہے'' لگتا ہے یہ مکالمہ ہمارے سامنے ''ہو رہا ہے''۔!

گاؤں میں واپسی کے بعد کمپیوٹر، ریاضی اور ٹیکنالوجی کا بادشاہ، ناول کا مرکزی کردار ولید، گاؤں میں آئے۔ ایک نوجوان سے مختصری گفتگو کرتا ہے!

''بی اے کے بعد پڑھائی جاری رکھو گے ناں''

”جی ہاں، سی ایس ایس کروں گا، پولیس میں جاؤں گا، اے ایس پی بنوں گا“

”پولیس میں ہی کیوں؟ ڈسٹرکٹ مینجمنٹ یا فارن سروس میں کیوں نہیں“

”جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا۔ فارن سروس فارن میں ہوتی ہے میں یہاں کچھ کرنا چاہتا ہوں اور ڈم ایم جی اب کمزور ہو رہی ہے اصلی گروپ پولیس ہے۔“

”اصلی گروپ مطلب؟ پولیس میں آکر کیا کرو گے؟“

”رعب ہے جناب رعب، پولیس کا رعب ہے اور پھر لمبا پیسہ بھی ہے“

”رعب اور پیسہ! اور یہ دونوں کسی اور جگہ سے مل جائیں تو پھر بھی پولیس میں جاؤ گے؟“

”پھر بھی اس لیے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت طاقت بھی ہونی چاہیئے اپنے پاس۔“ قائداعظم، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام، عبدالستار ایدھی اور ان جیسے مشاہیر میں سے کون پولیس کی نوکری کرتا تھا۔ طاقت سے تمہاری مراد کیا ہے۔ بندوق کی طاقت یا کسی کو جیل ڈالنے کی طاقت؟ طاقت تو بیٹا علم میں ہوتی ہے یا پھر اچھے اعمال میں، کیا کہتے ہو؟“

”وہ تو ٹھیک ہے جی لیکن زمانہ بدل گیا ہے، ہمارا ویلیو سسٹم بدل گیا ہے۔ پیشہ، طاقت، تعلقات یہی پیمانے ہیں“

”اور اس بدلے ہوئے ویلیو سسٹم کو تم پولیس میں جا کر ٹھیک کر سکو گے؟“

”تو پھر آپ ہی بتایئے کیا کیا جائے۔ اتنی مہنگائی ہوگئی ہے، انصاف ملتا نہیں، غنڈہ گردی انتہا کو پہنچ چکی ہے، بے روزگاری، بجلی کا بل، بچوں کی تعلیم و تربیت، ہم لوگ تو گھر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے اور کچھ نہیں تو قبضہ گروپ، ہتھوڑا گروپ، چوریاں، ڈاکے، سیاست کی قلابازیاں اور دہشت گردی۔ پولیس میں جاؤں گا تو کم از کم اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت تو کر سکوں گا۔ وہ زمانے گئے جب سچ بولو، نیک رہو، غصہ حرام ہے رشوت حرام ہے، یہ سب بتانے والے بزرگ ہوا کرتے تھے۔ اب تو ماں باپ خود کہتے ہیں کہ کما کر لاؤ، کہاں سے اور کیسے کما کر لاؤ، یہ ان کا مسئلہ نہیں رہا“

"اب سمجھ میں آیا کہ تم کس ویلیو سسٹم کی بات کر رہے تھے۔ بیٹا سچ ختم نہیں ہوا۔ بس ذرا اس کے راستے میں مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ رشوت حلال نہیں ہوئی، کبھی بھی نہیں ہوگی، بس ذرا ہم لوگوں نے شارٹ کٹس ڈھونڈنے شروع کر دیے ہیں۔ بزرگ نہیں بدلے ذرا بے چینی بڑھ گئی ہے"

"پرانی باتیں ہیں، زمانہ بدل گیا ہے، اصول بدل گئے ہیں"

"باتیں، زمانہ اصول مان لیا تھوڑی دیر کے لیے سب بدل گئے ہیں۔ تو کیا خون کا رنگ بدل گیا ہے ؟ ماں کی محبت بھی بدل گئی ہے، دوسروں کے لیے کچھ اچھا کرنے کا جذبہ بھی بدل گیا ہے؟ بھوک پر قابو پا لیا گیا ہے، لالچ پر آرا چلا دیا گیا ہے؟ درختوں اور پھولوں نے اُگنا چھوڑ دیا ہے؟ تتلیوں نے کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیا ہے؟ کتوں نے مالک پر حملے شروع کر دیے ہیں؟ فقیر کی جھولی خالی ہوگئی ہے؟ قرآن کے لفظ بدل گئے ہیں؟ زمین نے انسان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہے؟ بہت کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے بیٹا، پیسہ اتنا ہی اچھا جتنا ضرورت کا، ورنہ سنبھالا نہیں جاتا"۔!

اسلوب اچھوتا، اندازِ بیان دلچسپ، ہر کردار اپنی زبان بولتا ہوا، پلاٹ لاجواب، جگہ جگہ بکھرے نئے نئے اقوالِ زریں، کہانی کا تسلسل شروع سے آخر تک قائم، موضوعات کا درست چناؤ اور ہر موضوع سے بدرجہ اتم انصاف، ضخامت موزوں، مقصدیت موجود، جواز و دلیل جگہ جگہ ہو تو مجھے بتایئے کہ یہ ناول اردو ادب میں "ایک گراں قدر اضافہ" کیسے نہ ہو۔ "شہکار ناول" کیوں نہ کہلائے۔

زبان کی سلاست اور مشکل الفاظ سے پرہیز بھی اس ناول کی خوبیوں میں شامل ہیں۔ اُردو باکمال، اور اس میں جینی کے عمدہ انگریزی میں لکھے ایک خط سے مصنف کا انگریزی زبان پر عبور بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کسی جگہ پڑھا تھا کہ "یہاں سے آگے" اب انگریزی زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ بہت جلد انگریزی زبان پڑھنے اور سمجھنے والے بھی اس ناول کی قدر و قیمت سے آشنا ہوں گے۔ یوں اُردو ادب انگریزی میں منتقل ہوگا اور دنیا بھر میں ہمارے ادب کو روشناس کرانے والوں

میں نجم الثاقب کا نام بھی شامل رہے گا۔ اس ناول کی ایک خاص بات کا سب نے اعتراف کیا ہے۔ میں اپنی پسند کے چند فقرے، اس ناول سے چن کر آپ کے ذوق سلیم کے لیے پیش کر رہی ہوں۔

"نقصان وہ ہوتا ہے جو پورا نہ کیا جا سکے"

"تتلی دیکھنے اور محسوس کرنے والوں کو احساس دلاتی ہے کہ مکمل سکون اطمینان اور گہری خاموشی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"شاعری اور شادی دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ ایک دنیا میں ستارے اور گلاب، خواب چلتے ہیں تو دوسری دنیا میں پانی اور بجلی کا بل ادا ہوتا ہے"

"سب کچھ چاہا گیا اگر مل جائے تو انسان اور خدا میں فاصلہ کم رہ جاتا ہے"

"میں ابھی پورا امریکی نہیں ہوا، پاسپورٹ بدلنے سے تہذیب نہیں بدلتی"

"کون سے خواب پورے ہوئے ہیں؟ وہ جو پورے ہوئے وہ بھی اب خواب ہو چکے ہیں"

"پسند اور ناپسند پر کبھی بحث نہیں ہو سکتی"

-----

کتاب : کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں)

مصنفہ : ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

مبصر : عقیل دانش

ناشر : بک ہوم لاہور

قیمت : ۳۰۰ روپے / ۷ پونڈ / ۱۴ ڈالر

معروف شاعرہ۔ ادیبہ۔ افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر رضیہ اسمٰعیل کی تازہ تخلیق "کہانی بول پڑتی ہے" پوپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت نے اُردو میں پوپ کہانی کی اختراع کو ایک سنجیدہ بحث کی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ہندی اور مغرب کے اثر سے اردو نظم و نثر میں نئی نئی

اصناف نے جنم لیا ہے۔ گزشتہ صدی کے شروع میں آزاد۔ معرّیٰ اور جدید نظم رسائل اور جرائد کی زینت بنی مولانا عبدالحلیم شرر کا رسالہ ''دل گداز'' اس ذیل میں اولیت کا حامل ہے۔ تصدق حسین خالد اور ن۔م۔ راشد نے نظم کی اِس صنف کو ایک وقار عطا کیا اور اب کوئی رسالہ۔ کوئی جریدہ ایسا نہیں ہے جس میں اس طرح کی نظمیں موجود نہ ہوں۔ گزشتہ کچھ دہائیوں سے ہندی دو ہے بھی مقبولِ خواص وعوام ہیں۔ کچھ دن انگریزی سانیٹ کے تراجم بھی رسائل کی زینت بنے لیکن اب اُن کی جگہ ہائی کو اور کچھ اور نئی اقسام نے لے لی۔ حمایت علی شاعر کی ''ثلاثی'' نے بھی کچھ دن رنگ دکھایا لیکن اب اس کا جلوہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اُردو نثر میں مغرب اور مشرق بعید کے اثر سے مختصر نظمیں اور افسانچے در آئے۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں انشائے لطیف اکثر رسائل کی زینت بنی اِن رسائل میں ''نقاد'' اور ''نگار'' کو بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل رہی۔ قاری کو چونکانے۔ نتیجے سے حظ اُٹھانے کے نئے نئے اسلوب تراشے گئے ''نیا کی مختصر کہانی'' آج بھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ''ٹرین میں سفر کرتے ہوئے ایک شخص نے دوسرے شخص سے پوچھا۔ آپ جنوں پر یقین رکھتے ہیں دوسرا شخص دھواں بن کر کھڑکی سے غائب ہو گیا۔ گزشتہ چند سال میں اردو کے معروف افسانہ نگار محترم مقصود الٰہی شیخ نے مختصر کہانیوں کو ''پوپ کہانی'' کے عنوان سے تخلیق کرنے کی روایت قائم کی جو انگریزی اور خصوصاً امریکی ادب میں پہلے ہی اپنا رنگ جما چکی تھی۔ پوپ موسیقی کی اصطلاح مختصر کہانیوں کے لیے استعمال کرنے کے عقب میں غالباً یہ خیال ہے کہ جس طرح کلاسیکی موسیقی کے مقابلے میں پوپ موسیقی ہلکی اور عام فہم ہوتی ہے اسی طرح پوپ کہانی بھی عام قاری کو اپنے تاثر کی گرفت میں لے لے گی۔ شیخ صاحب نے پوپ کہانی کی تعریف اس طرح کی ہے۔ ''پوپ کہانی افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلم بند کرنے کا نام ہے۔ ''پوپ کہانی'' کی تعریف کے ذیل میں شیخ صاحب کی یہ تعریف تاحال تشنہ ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اسمٰعیل نے کلاسیکی موسیقی کے راگوں سے پوپ کہانی کو متصل کرنے کی ایک تجویز پیش کی ہے۔ اس خیال میں

ندرت ہے لیکن یہ بڑی پتہ ماری اور جانکاہی کا کام ہے اور وہی شخص کر سکتا ہے جسے کلاسیکی موسیقی اورادب کی تمام اصناف پر قدرت حاصل ہو۔ ڈاکٹر رضیہ اسمٰعیل نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر جو تفصیلی بحث کی ہے وہ پوپ کہانی کے ذیل میں بڑی خاصے کی چیز ہے۔ اُنھوں نے مشرق کے علاوہ مغرب کے حوالے سے اُن مغربی قلمکاروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو سالہا سال سے پوپ کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ اس ذیل میں اُنھوں نے معروف امریکی کہانی کار کنگ وینکلس King Wenclas سے خط و کتابت کی اور اُس کی اجازت سے اُس کی پوپ کہانیوں کے مجموعے ''دس پوپ کہانیاں'' Ten Pos Stories سے دو کہانیاں ''اردوائیں'' جو ''مشین'' اور ''سرخ دروازہ'' کے عنوان سے اُن کے مجموعے میں شامل ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں رضیہ صاحبہ نے پوپ کہانی لکھنے کے چند نکات کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود اِن اشاروں پر کاربند رہ کر پوپ کہانیاں لکھی ہیں۔ ہمارے خیال میں کہانی کی بُنت کوئی بھی ہو اور پیش کرنے کا انداز کچھ بھی ہو مجموعی طور پر قاری پر اُس کا گہرا تاثر ہونا چاہیئے۔ اور کہانی بول پڑتی ہے۔'' کی تمام کہانیاں اس تاثر کی حامل ہیں۔ رضیہ صاحبہ کے عام موسیقی کے تاثر کی بات پر ہمیں اُن کی عام کہانیوں (ہمارے خیال میں پوپ کے بجائے ''عام کہانی'' زیادہ مقبول ہوگی) کے تاثر کا احساس ہوا۔ مثلاً جب ہم لتا منگیشکر کو گاتا سنتے ہیں

'یہ شام کی تنہائیاں ایسے میں ترا غم'

تو ایک خاص کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں۔ سادہ سے الفاظ۔ اختصار اور لہجے نے یہ کیفیت پیدا کی ہے بالکل اسی طرح کہانی بول پڑتی ہے کی پاپ کہانیاں قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی نفسیات کی خوبصورت تصویریں بھی ہیں اور درد کے شجر کی خنک ہوائیں بھی۔ ایشین ریڈیو پر تلفظ کے قتل عام کا نوحہ بھی ہے اور مذہبی تشخص کے خاتمے کا ماتم بھی ہے انسانی رشتوں کی خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے عکس بھی ہیں اور بے وطنی کے کرب کا بیان بھی۔ غیر ملک میں مقامی افراد کے ہاتھوں بے عزتی کی جھلکیاں بھی ہیں اور نام نہاد مذہب کے ٹھیکیداروں کی چیرہ دستیوں کا اظہار بھی۔ آپ ان خوبصورت کہانیوں کو کوئی بھی نام دیدیں میں انھیں ''دل کی کہانیاں'' کہتا ہوں اور اس پُر تاثر تخلیق پر ڈاکٹر رضیہ اسمٰعیل کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

# مراسلات

## ڈاکٹر نسیم ہائنس۔ یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا، وینکوور، کینیڈا

آپ کینیڈا تشریف لائے اور سیاٹل بھی گئے جو وینکوور سے چند گھنٹوں کا سفر ہے۔ آپ سے فون پر بات کر کے بہت خوشی ہوئی۔ کاش آپ کا یونیورسٹی آنا ممکن ہوتا۔ میری کلاسز کے طلبا و طالبات آپ سے مل کر اور آپ کو سن کر بہت خوش ہوتے۔

چند روز قبل آپ کا گرانقدر تحفہ ''حرفِ معتبر'' اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کی نئی جہت'' وصول ہوا، اور آج الاقربا کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد معزالدین اور جناب انور سدید صاحبان نے بجا فرمایا کہ اداریوں کے اس مجموعہ کو ادبی اداریہ نویسی کی تاریخ کا سنگِ میل کہا جا سکتا ہے، اور کہ دیگر اصنافِ نظم و نثر کی طرح یہ مجموعہ بھی آپ کا منفرد و امتیازی اسلوب تحریر کی نشان دہی کے ساتھ اردو ادب کے فروغ و ارتقاء کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہے۔ اداریہ نویسی کے چند اہم تقاضے ہیں، مثلاً (۱) موضوع پر ارتکاز (۲) اپنی ذات سے باہر آ کر اور بالاتر اور غیر جانبدار ہو کر موضوع کا تجزیہ کرنا (۳) دیگر آراء کا جائزہ اور غلط آراء کی منطق اور صداقت کی دلائل سے تردید کرنا (۴) زبان و بیان کی سلاست اور مقناطیسیت (۵) اخلاقی اقدار کی میزان پر اداریہ کا پورا اترنا (۶) مختلف ذہنی سطح رکھنے والے قارئین کی فہم کا ادراک اور طرز نگارش سے ان کے لیئے دلائل کو قابلِ قبول کرانے کی صلاحیت پیدا کرنا (۷) اور آخر میں قارئین کے لیئے پیغام عمل۔ آپ کے اداریے ماشاءاللہ اس بنیادی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں پاکستان کے صحافیوں کے لیئے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتی اور درسگاہوں کے صحافت کے پروگرامز میں کم از کم 'رکومینڈڈ ریڈنگ' کے طور پر اس کی شمولیت پر اصرار کرتی۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر میں قوم کے بصیرت سے محروم تعلیمی پالیسی تشکیل و وضع کرنے والے افسران شاہی اور حکومت کے کارندوں کے لیئے اس کے مطالعہ کو لازمی قرار دیتی، اس لیئے کہ

وزرائے کرام عدیم الفرصتی کا شکار ہیں، وہ اپنی تقریبات میں آ کر کرسی صدارت پر رونق افروز ہوتے ہیں یہ ان کا ہماری ثقافت اور علم وادب پر احسان ہے، ورنہ وہ کہاں اور علم وادب کہاں۔ وہ ایسی تقریبات میں جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں اس سے ان کی ذہنی سطح اور آگہی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس شمارہ کے اداریہ میں ان کی تقریر دل پذیر کے حوالہ سے ادب کے سلسلہ میں ان کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسالہ کا مطالعہ قسطوں میں ہو رہا ہے۔ تحفہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیئے پہلی فرصت میں یہ چند سطور لکھنا ضروری تھیں۔ خدا حافظ

## امین حیدر۔ اردو انسٹی ٹیوٹ شکاگو، امریکہ

پہلی مرتبہ الاقرباء بذریعہ ڈاک موصول ہوا، اس سے قبل میرے دیرینہ دوست جناب حسن چشتی صاحب کے توسط سے انٹرنیٹ پر پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس جریدہ سے تعارف بھی ان کا مرہون منت ہے۔ آپ نے ڈپٹی نذیر احمد خان دہلوی پر میرا مضمون شریک اشاعت فرمایا، شکریہ یہ ہماری انجمن ''اردو انسٹی ٹیوٹ'' کی ہفتہ وار نشست میں پیش کیا گیا تھا۔

میرے نزدیک الاقرباء شگفتہ تحریروں کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ میگزین کی تاریخ بہت پرانی ہے یہ عربی کے لفظ ''مخزن'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''گودام'' ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلا میگزین ۱۶۶۳ء میں جرمنی سے شائع ہوا تھا مگر اسے مقبولیت انگلینڈ سے شائع ہونے والے ایک جریدہ ''جینٹل مین میگزین'' سے حاصل ہوئی جو ۱۷۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی مقبولیت کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ برخلاف ایک روایتی موضوعاتی کتاب کے اس میں ہمہ جہت موضوعات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ اس میں کہانیاں، نظمیں اور سیاسی تبصرے وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ آج میگزین کی جو شکل ہے ہم دیکھتے ہیں اس کا خاکہ انہی بنیادوں پر قائم ہے۔ اردو میں بھی میگزین کو جسے ہم رسالہ، جریدہ، ڈائجسٹ، مجلہ وغیرہ کے نام سے جانتے ہیں، خاصی مقبولیت حاصل ہے، تاہم چند ہی ایسے مجلّے ہیں جنھیں معیاری کہا جا سکتا ہے۔ اسلام آباد پاکستان سے جاری ہونے والے سہ ماہی ''الاقربا'' کا شمار بھی ایسے ہی چند منتخب معیاری رسالوں میں ہوتا

ہے۔ یہ رسالہ اپنی مجلس ادارت کی انتھک محنت اور خلوص کی وجہ سے ادب کے سنجیدہ قارئین میں خاصی مقبولیت رکھتا ہے اور جسے اپنے قارئین کا بے حد اعتماد حاصل ہے، جس کے لیئے سید منصور عاقل اور ان کی پوری ٹیم بالخصوص محترمہ شہلا احمد، ناصر الدین صاحب اور پروفیسر ہما سالاری صاحبہ و مجلسِ مشاورت کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ الاقربا کی ایک خصوصیت جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس کی آن لائن دستیابی ہے، جو کچھ عرصہ تعطل کے بعد الحمدللہ پھر بحال ہوگئی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں انٹرنیٹ موجود ہے وہاں وہاں اس سے مستفید ہوا جا سکتا ہے، جیسا کہ الاقربا کے ادیب و شاعر اور مراسلہ نگاروں کی نگارشات سے ظاہر ہے۔ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء کی ہارڈ کاپی کی وصولیابی کے لیئے میں اپنے محترم دوست جناب اویس جعفری صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ موجودہ شمارہ بھی گزشتہ شماروں کی طرح بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ''تشنۂ مقاصد ادبی تقریبات'' بہت اچھا موضوع ہے۔ اس تازہ شمارہ میں اسلامی خطاطی، تاریخ نگاری اور تاریخ گوئی پر لکھے گئے مضامین بہت پسند آئے۔ ''اقبال کا تصورِ تنہائی'' ایک بہت عمدہ تنقیدی اور اچھوتا مضمون ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حمد و نعت، غزلیں اور نظمیں ادب عالیہ کا نمونہ ہیں۔ غرض اس شمارہ میں تمام سابقہ شماروں کی طرح میرے اور متنوع ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیئے بے شمار ادبی گوشے ہیں جو دامنِ دل کے لیئے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ میں ایسے قیمتی اور بیش بہا فکر انگیز مضامین پر مشتمل تاریخ ساز رسالہ کی ادارت پر آپ اور آپ کے درونِ ملک اور بیرون ملک رفیقانِ کار کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

## خواجہ مشتاق حسین۔ گلبرٹ، آریزونا، امریکہ

اس سہ ماہی کے شمارہ سے علم ہوا کہ آپ سیاٹل آئے ہوئے تھے۔ میرا آپ کے میزبان سے سخت احتجاج ہے کہ ٹائم زون میں فرق نہ ہونے کے باوجود انھوں نے مجھے آپ کے ساتھ گفتگو سے محروم رکھا۔ ان کا یہ بہانہ بہت کمزور ہے کہ وقت کم اور مصروفیات زیادہ تھیں۔ بہر حال ایک شعر یاد آرہا ہے آپ کی نذر کرتا چلوں:

ہمیں خبر ہے ہوا کا مزاج رکھتے ہو  مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں

------

پروفیسر معین الدین عقیل صاحب کا ''پاکستان کی اسلامی خطاطی کا ایک عمدہ شاہکار'' بہت عمدہ مضمون ہے۔ اگر آپ اس فن کے فروغ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ دور اس فن کے عروج کا بہت زریں عہد ہے اور یہ اسی کا فیض ہے کہ باوجود اس دورِ ناپرسانِ فن اور ابتلا کے خطاطی کا پرچم آج بھی لہرا رہا ہے۔ سلطان ابراہیم غزنوی، سلطان ناصر الدین محمود، مولانا جلال الدین مانکپوری، عبداللہ ہروی، ظہیر الدین محمد بابر، سلطان مظفر الحلیم گجراتی، مغل بادشاہ جہانگیر کے دوسرے بیٹے شہزادہ پرویز، شاہجہانی عہد کے عبدالباقی یاقوت رقم، حافظ محمد حسین لاہوری، محمد روح اللہ لاہوری، سید عنایت اللہ حسینی، داراشکوہ، سلطان محی الدین عالمگیر، حاجی محمد اسماعیل ماثر ندرانی، میرزا محمد، اورنگزیب کے استاد حاجی قاسم کے بیٹے حاجی عبداللہ، اسی عہد کے احمد یار خان یکتا، محمد عارف یاقوت رقم، سید احمد بلگرامی، سید عبدالواحد بلگرامی، نواب مرید خان، مولانا غوث پیشاوری، قاضی فیض اللہ، قاضی عصمت اللہ خان، اور ان کے علاوہ بیشتر نام ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر اسلامی فن خطاطی کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

''بلاعنوان''، ''آکاس بیل'' اچھے افسانے ہیں۔ ''ہندی نژاد ایرانی شعرا کا مختصر جائزہ'' شوقِ تفصیل کو مہمیز دیتا ہے۔ حمد و نعت، نظم و غزل کا شعبہ تو حسب معمول اپنا امتیاز قائم رکھے ہوئے ہے۔ چند منتخب اشعار کی تعریف کیئے بغیر چارہ نہیں، ہر چند کے ہر شاعر داد و تحسین کا مستحق ہے۔

نعتیہ اشعار:

آستاں آئینۂ ہمسر افلاک بھی دے  سر دیا ہے تو درِ سیّد لولاک بھی دے

-----

بس ایک آسماں کے سفر نے ترے کتنے  وا کر دیے زمین پہ دریائے ممکنات

-----

لباسِ نور ہے جیسے بدن پر  غمِ امت مگر رخ سے عیاں ہے

-----

عمر گزری ہے کہ ویران ہے دل کی دنیا    اب تو اس گھر میں کوئی موجِ خرام آجائے

------

آج طیبہ کے گلی کوچوں کی یاد آئی بہت    آج میرا دل ہوا معراج کو گرمِ سفر

------

گنجینۂ غزلیات میں ان چند اشعار کی تعریف واجب الادا ہے:

کیا مسائل کی خبر دیگا وہ جس نے طارق    غمِ ہستی کو طبیعت کی گرانی سمجھا

------

دیکھ کر س کی طرف پھر نہ کسی کو دیکھا    اپنا معیار نظر ہم نے گرایا ہی نہیں

------

جانا تھا مجھے شہر کسی کام سے لیکن    گولی کی صدا سن کے میں گھر سے نہیں نکلا

------

جہاں ابلیس کا سکہ رواں ہے    وہاں احساس بیداری بہت ہے

------

فرازِ دار سے ضامن نظر نہ آیا کوئی    سکونِ قلب سے احباب گھر گئے ہوں گے

------

میں افق تا بہ افق ڈھونڈنے نکلا صفدر    حدِ امکان کہاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

------

دے گئی ہیں مجھ کو جلوت کا مزہ    خلوتِ دل میں تری پرچھائیاں

------

نظم ''سوچ کے نیم وا در یچہ سے'' کا آہنگ اور ''کیفی اعظمی'' میں الفاظ کا شکوہ اور روانی قابلِ داد اس لیئے بھی ہے کہ کیفی کی کتاب ''آخرِ شب'' کی اصطلاحات کو بہت فنکارانہ انداز سے اس طرح پرو دیا ہے کہ کیفی کی کلیات کا مطالعہ کیئے بغیر اس کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔ ''اُف یہ تحریریں'' ایک دردناک موجِ موسیقی ہے۔ قطعات ورباعیات کے خالقین کو مبارکباد۔

## پروفیسر احمد اللہ۔ سیاٹل۔ امریکہ

کوئی ایک دہائی قبل انیس قدوائی بھائی نے 'الاقربا' سے متعارف کرایا تھا، اس وقت سے

یہ مستقل میرا محبوب رسالہ ہے اور وہ اس لیے کہ یہ بڑی خصوصیات کا حامل اور ظاہری اور باطنی حسن سے مزین اپنی مثال آپ ہے۔ شاید آپ کو اس کا اندازہ نہ ہو کہ یہ محفلِ یاراں میں سدا گردش کرتا رہتا ہے اور سب اس رطلِ گراں سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ آپ سے ملاقات کے وقت بھی یہ میرے بریف کیس میں تھا جس سے آپ کو اس جریدہ سے وابستگی کا اندازہ ہوا ہوگا۔ میرے بہت عزیز اور سگے خلیرے بھائی حبیب اللہ اوج مرحوم جن کی وجہ شہرت صحافت تھی مگر وہ ایک اچھے ادیب اور مقتدر شاعر بھی تھے، ان کی شعری تخلیقات بھی 'الاقربا' کی زینت رہی ہیں۔ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں ان کی ایک مرصع غزل شائع ہوئی تھی، جس کا مقطع ہے

کون جانے کہ غریب اوج پہ کیا گزرے گی      حسبِ امید وہ آئیں نہ اگر آج کی رات

------

میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ سے کبھی ملاقات ہو پائے گی، حالانکہ جو نادر اداریے آپ سے قلم زد ہوتے رہے ہیں انھوں نے ہمیشہ آپ کی دید و ملاقات کی خواہش کو تقویت دی ہے۔ زہے قسمت کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ 'الاقربا' کی محفل میں ماشاءاللہ بہت ممتاز اہلِ قلم شامل ہیں اور رسالہ کا ہر شمارہ ان کی معیاری نثر و نظم کا ایک خوبصورت مہکتا ہوا گلدستہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ برادرم اویس جعفری بھی میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ اگر قدوائی بھائی حیات ہوتے تو یہ ناممکن تھا کہ آپ کے ساتھ تفصیلی نشست منعقد نہ ہوتی۔ ان کی کمی بُری طرح محسوس ہوتی ہے۔ آپ سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ آپ اور آپ کے شریکِ کار زبان و علم و ادب کی جو ناقابلِ فراموش خدمت کر رہے ہیں وہ لائقِ تحسین ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ آپ نے یہاں کے احباب علم سے اپنی مختصر ملاقات کو تصویر میں محفوظ فرما کر اسے تاریخی حیثیت دیدی ہے۔ بیشتر شماروں میں فاونڈیشن کی تقریبات کی تصاویر حالانکہ مقامی و مخصوص اراکین کے لیئے ایک علیحدہ مختص حصہ میں درج ہوتی ہیں، لیکن ہم جیسے دور افتادہ قارئین کو بھی ان سے باخبر رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آپ سے مختصر ملاقات کو اصطلاحِ شعر میں

"صحبت چشم زدان" کہا جاسکتا ہے۔ یہ شعر آپ کی نذر کرتا چلوں

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد    رُوئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

-----

اجازت دیجئے اور رفیقانِ کار کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے۔

## احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی۔ سیاٹل۔ واشنگٹن (امریکہ)

الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع ہونیوالے علمی، تحقیقی اور ادبی سہ ماہی مجلّہ "الاقرباء" سے راقمِ سطور ایک عرصہ سے متعارف ہے تاہم اس سلسلہ میں تحریری طور پر کسی اظہار خیال کا موقع نہ مل سکا۔ پھر ایک مدت کے بعد میرے کرم فرما محبّ مکرم و مخلصِ محترم الحاج محمد اویس جعفری کے حُسنِ توسط سے الاقرباء کے تین تازہ شمارے پے در پے موصول ہوئے، تسلسل کے ساتھ الاقرباء کے مطالعہ نے مجھے بھی اپنا قربت دار بنا لیا اور اس کے قلم کاروں سے ایک خاص علمی و فکری ارتباط، قربت، محبت اور اُنس پیدا کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "الاقرباء" بامقصد تعمیری ادب کا نمائندہ اور اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدروں کا نقیب، دورِ حاضر کا ایک خالص علمی و تحقیقی مجلّہ ہے۔ اس کے مضامین، مقالات اور گوشۂ شعر و سخن، سب میں علم و ادب کی خوشبو رچی بسی ہے، اس کے اداریے یا افتتاحیہ تحریریں عصری حیثیت اور زمانی شعور کے ساتھ فکر و تحقیق کا حسین مرقع ہیں، میری نظر میں اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ادب اور دین و اخلاق کے درمیان جو نہایت لطیف مگر مضبوط اور مستحکم رشتہ ہے اس کی بھرپور رعایت اور پاسبانی کی جاتی ہے اور یقیناً اس کا سہرا مجلس ادارت اور اس کے گرامی قدر صدر نشین جناب منصور عاقل صاحب کے سر ہے۔۔۔ ورنہ آج کے دور میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زبان اور قلم دونوں ہی کے صحیح استعمال اور قلم کی حقیقت اور عظمت کے صحیح ادراک سے محروم ہیں، قلم کی نسبت رکھتے ہوئے بھی قلم کی حُرمت کو انہوں نے پامال کیا اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کے نام پر اباحیت کو فروغ دیا۔

اسی طرح الاقرباء میں ڈاکٹر محمد معزالدین، جناب محمد طارق غازی، خود مجلّہ

کے مدیر محترم منصور عاقل مدظلہ، اور دیگر اہلِ علم کی چشم کشا اور بصیرت افروز تحریروں میں قارئین کے لیے بہت کچھ سرمایۂ علم وادب چھپا ہوتا ہے۔ محترم جناب اویس جعفری صاحب، نے حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور شاعری پر جو مقالہ لکھا ہے وہ اُن کی ژرف نگاہی، علمی ذوق اور ادبی و تحقیقی شعور کا آئینہ دار ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ الاقرباء کے خوش ذوق اور خوش فکر قارئین نے صاحب مقالہ کی اس کاوش کو خوب سراہا، ماشاء اللہ وہ ایک خوش فکر شاعر و ادیب ہیں اُن کی لکھی ہوئی حمد، نعت اور نظمیں بھی الاقرباء کے مختلف شماروں میں نظر سے گزرتی رہتی ہیں، وہ برجستہ شعر کہتے ہیں جس میں زبان کی صفائی وسلاست کے ساتھ علم وفکر کے آب دار موتی لفظ لفظ سے دمکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

الاقرباء نے جن ادیبوں، قلمکاروں اور شاعروں کو اپنے دامنِ علم وادب میں جگہ دی ہے وہ سب ہی باکمال ہیں، بلند نظر ہیں، ہمیں ایسے حضرات کی (اہل علم وقلم) جنھوں نے قدرت کے عطا کردہ بیان وتعبیر کی قدرت وصلاحیت کی قدر کی، شعروادب کو ذہن سازی اور تعمیر واصلاح کا ذریعہ بنایا جس سے تہذیب وتمدّن کو فروغ ملا، انسانی واخلاقی قدریں عام ہوئیں، ضرور حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ ایسے ہی حضرات سے ادب کی عظمت اور قلم کا وقار واعتبار قائم ودائم ہے۔

محترم منصور عاقل صاحب کی سیاٹل (واشنگٹن) تشریف آوری کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا، کاش وقت میں گنجائش ہوتی تو اُن کے اعزاز میں شایانِ شان محفل سجائی جاتی اور اُن کے زریں افکار وخیالات سے استفادہ کا موقع ملتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں برکت عطا فرمائے وہ اپنے رفقاء اور احباب کے ساتھ اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی اور استحکام واستقلال قارئین اردو کی ذہنی وفکری سطح کی بلندی، قلم کاروں کی حوصلہ افزائی اور الاقرباء کو ظاہری وباطنی خوبیوں کے اعتبار سے بامِ عروج پر پہنچانے کے سلسلہ میں پوری قوت اور عزم وارادہ کی پختگی کے ساتھ جس انداز میں سرگرم عمل ہیں وہ یقیناً قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ خدا کرے الاقرباء کا یہ ادبی وتحقیقی سفر جاری رہے۔ اس کے اراکینِ بزم کا مرحلۂ شوق طے نہ ہو اور یوں

شمع جلتی رہے، ہوتا رہے محفل کو فروغ

## نعیم اقبال سینٹر برائے اسلامک سائنسز، اسنو ہومشن، واشنگٹن۔(امریکہ)

الاقربا کے تازہ ترشمارہ نے شعروادب سے برسوں پرانے اور فراموش کردہ رشتہ کو بحال کر دیا۔ شکریہ بہت خوب، معیاری اور قابلِ تعریف جریدہ ہے۔ لاہور کی شعری وادبی نشستیں یاد آگئیں۔ تعلیم کے لیئے یو۔کے۔ جانا ہوا اور پھر کاروبار کے لیئے امریکہ آکر آباد ہو گیا۔ اس دوران ایسے صاف ستھرے ادبی رسالوں سے ربط قائم نہ رہ سکا۔ آپ کے توسط سے تجدید ہو گئی۔ کوشش کروں گا کہ یہ خوش آیند وابستگی قائم رہے۔ آپ کے سیاٹل کے دوران قیام ملاقات بہت مختصر مگر یادگار رہی۔

ڈاکٹر مظفر اقبال بھائی کی جانب سے پُرخلوص میزبانی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کے حلقہ احباب میں کچھ دانشور اور علماء سے وہ پہلے سے واقف تھے، کچھ نئے اہلِ علم سے تعارف ہوا اور ان کے لیئے یہ دریافت موجب صد انبساط ہے۔ انھیں یہ ملال ہے کہ وقت کی کمی کے باعث آپ کے یہاں نشست بہت مختصر رہی اور تشنگی باقی رہ گئی۔ ''انٹیگریٹڈ انسائیکلوپیڈیا اوف دی قرآن'' کے سلسلہ میں مظفر بھائی کو دورانِ ملک اور بیرونِ ملک دوروں پر روانہ ہونا ہے اور الحمدللہ جلد نمبر دوم پر بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ عدیم الفرصتی کی بنا پر ممکن ہے وہ آپ کا براہِ راست شکریہ ادا نہ کر پائیں، اس لیے یہ چند سطور بطور اظہار تشکر قبول فرمائیے۔ اگر ممکن ہو تو لیاقت نیشنل لائبریری سے انسائیکلوپیڈیا کے پہلی جلد کی خریداری کی سفارش فرما دیجیے۔ جو رقم ایک جلد کی فروخت سے حاصل ہوتی ہے وہ دوسری جلدوں کے مضامین کی تحقیق، تدوین واشاعت پر صرف ہوتی ہے۔ میں اس کی تفصیل منسلک کر رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے پہلی جلد میں قرآنی الفاظ کا اندراج ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے اندارج اللہ سے شروع ہو کر اللہ کے اسماء حسنہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس پیمانہ پر اس نوعیت کا کام آج تک نہیں ہوا ہے۔ غیر مسلم مستشرقین نے تعصب سے کام لیتے ہوئے مسلم طلباء و محققین کو ناقص اور گمراہ کن مواد فراہم کیا ہے، جس کی تصحیح نہ صرف انتہائی ضروری ہے بلکہ عین فرض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تحقیقی کام ان قرآنی الفاظ پر جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر وحی فرمائے ہیں، نہ صرف ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک بڑے خلا کو پُر کرتا ہے۔ ناشر سے یہ پہلی جلد زرِ ترسیل کے علاوہ ۲۹۵ ڈالر میں خریدی جا سکتی ہے۔ دعا کیجیے ساتوں جلدیں بخیر و خوبی وقت مقررہ میں مکمل ہو جائیں۔ (آمین)

## شجاع طلعت بیلویو۔ واشنگٹن (امریکہ)

اس سہ ماہی کا شمارہ موصول ہوا۔ پروفیسر وحید الظفر خان صاحب سے الاقربا کے صفحات پر میری یہ پہلی ملاقات ہے۔ میرا مطالعہ محدود ہے اور میری نظر سے اقبال کے تصورِ تنہائی پر اس سے قبل کوئی مضمون نہیں گزرا۔ مصنف کا تنقیدی ادب پر گرفت کا اندازہ ان انگریزی اصطلاحات سے ہوتا ہے جو اس فاضلانہ مضمون میں جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ اقبال کے متعدد اشعار میں عُزلت اور تنہائی کی تلاش و جستجو نظر آتی ہے۔ اس کیفیت میں جہاں ایک درد کی کسک ہے وہاں ایک لطف و انبساط کا بے ساختہ اظہار بھی ہے۔ ان کی نظم ''ایک آرزو'' ملاحظہ ہو جس میں جلوت کو شرما دینے والی خلوت کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:

دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو      آزاد فکر سے ہوں، عُزلت میں دن گزاروں

-----

'بانگ درا' کی نظم ''صدائے درد'' کا یہ شعر پڑھیے:

اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں      لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں

-----

ایک اور نظم ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور      دل کہ ہے بیتابیِ الفت میں دنیا سے نفور

ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں      منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں

-----

ایک اور نظم ''رخصت اے بزمِ جہاں'' کا یہ آخری شعر:

عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

-----

''نالہ فراق'' کے دو شعر:

گشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں ۔۔۔ شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو بہلاتا ہوں میں ۔۔۔ بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

-----

ایک اور نظم ''چاند'' کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں ۔۔۔ بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تُو تنہا ہوں میں

-----

''اسرارِ خودی' میں فرماتے ہیں:

من مثالِ لالۂ صحرا ستم ۔۔۔ درمیانِ محفلے تنہا ستم

-----

کلامِ اقبال میں اس فکر کے حامل بے شمار اشعار ہیں۔ اس خلوت پسندی اور عزلت گزینی کے پس پشت آدم بیزاری یا شکست خوردگی نہیں بلکہ اپنے دل میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی خواہش کا راز مضمر ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی محرکات اس طرز فکر وعمل کا موجب ہو سکتے ہیں، جیسے ان کی بصیرت سے افرادِ ملت کی اکثریت کی لاعلمی، دیر وحرم کے پاسبانوں کا نفاق انگیز طرزِ عمل، امتِ مسلمہ کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زبوں حالی، مغرب کا رویۂ استحصال اور ہماری ذہنی و جسمانی غلامی، عدم اتحاد اور ان جیسے بیشمار امراض جن سے مسلمان دوچار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ مگر اقبال کے سفرِ شعر کا تعاقب کرنے سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ جستجوئے تنہائی خود حکیم الامت کے لیئے نغمہ سرائی کی محرک بھی اور ان کے سینہ میں ایک قیامت خیز امنگ و ولولہ اور نغمہ آتشیں کی وجہ تخلیق بھی جو اور ''بے ہوش جو پڑے ہیں'' ان کی روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے کا ایک مجرب نسخہ

بھی۔ ہمدم وہمراز وہم خیال کی دریافت میں خوش آیند ناکامی سے یہ راز فاش ہوتا ہے کہ خود اپنی ذات ہی سب سے بہتر اپنی ہمدم ورفیق ہے اور یہی طوافِ ذات آخر اس منزل کا سراغ فراہم کرتی ہے جہاں اپنی ذات کی معرفت کے توسط سے اپنے خالق کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اقبال کو وہ چشمِ بینا عطا ہوتی ہے جس پر اس جہاں سے ماورا سینکڑوں جہان آشکار ہوتے ہیں:

دلِ من راز دانِ جسم و جان است      نہ پنداری اجل بر من حرام است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم      ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

-----

مفکرِ مملکت خداداد پاکستان اگر آج حیات ہوتے تو ان پر یہ دیکھ کر کیا گزرتی کہ اس کے اربابِ بست وکشاد کو سورۃ اخلاص بھی صحیح پڑھنا نہیں آتی، نہ اس کے کھیت سے اس کے دہقان کو روٹی میسر ہے اور نام نہاد خدا امانِ ملت کے محلوں کے چراغ خونِ مزدور سے روشن ہیں۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز دلعلِ ناب      از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب، انقلاب اے انقلاب

------

## ضامن جعفری۔ٹورنٹو (کینڈا)

پروفیسر اویس جعفری صاحب کی وساطت سے میرا آپ سے غائبانہ تعارف تو ہو چکا تھا اب گزشتہ شب ٹیلیفون پر رابطہ بھی ہو گیا۔ٹورنٹو میں آپ کے انتہائی مختصر قیام کے دوران ملاقات کے دن اور وقت کے تعین میں غلط فہمی کے باعث آپ سے ملاقات نہ ہونے کا قلق رہا۔ سہ ماہی ''الاقربا'' کے مجھے اب تک تین شمارے مل چکے ہیں اور سب کے سب ہر اعتبار سے منفرد ہیں۔ میں نے اپنے چند دوستوں کو بھی فرداً فرداً برائے مطالعہ پیش کیے اور سب ہی نے بیحد سراہا۔ یہاں بھی اچھا کہنے والے اور عمدہ لکھنے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند وتوانا رکھے۔ آمین۔

## پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

الاقرباء شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء اپنی درخشندہ اور روایتی علمی و ادبی اشاعت کے معیار کا نشانِ امتیاز بن کر طلوع ہوا۔ کراچی اور لاہور کی تشنۂ مقاصد بین الاقوامی ادبی و ثقافتی تقریبات کے حوالے سے آپ کا بے لاگ تبصرہ پڑھا، پاکستان میں سطحی اور رسمی گفتگو کرنے اور تقریبات کے انعقاد میں خانہ پری کرنے کی ناقابلِ رشک روایت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ اب ایسی تقریبات کا ہونا نہ ہونا برابر ہے البتہ دوسرے مسلم ممالک کے سکالر پوری تیاری کے ساتھ شرکت کرتے ہیں لیکن ان کی بات بھی رزق ہوا ہو جاتی ہے کہ ہم اپنی روش تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے مثلاً اس مذکورہ کانفرنس میں ڈاکٹر علی بیات کا یہ کہنا درست تھا کہ ''اردو پاکستان کی قومی زبان ہے بلکہ عربی اور فارسی کے ساتھ تعلق ہونے کی وجہ سے عالم اسلام کے مابین اتحاد کا بہترین ذریعہ بھی ہے'' لیکن ہمارے ہاں کسی حکومت نے اردو کی اہمیت اور ضرورت کو اس زاویہ نظر سے نہیں دیکھا، انگریزی زبان صرف سائنسی مضامین پڑھنے والے طلباء کے لیے لازمی قرار دی جا سکتی ہے جب کہ اردو کو ہر نوع کے دفاتر میں رائج کیا جانا چاہیئے۔ وفاقی اور صوبائی وزیروں کو ڈھنگ سے اردو آتی ہے نہ انگریزی، صرف ان کے معتمدین (سیکریٹریز) انگریزی میں مراسلے جاری کرتے ہیں، وہ اردو میں سرکاری کام کرنے سے اس لیے احتراز کرتے ہیں کہ انہیں اردو زبان میں مدعا بیان کرنا محال ہو جاتا ہے، جہاں تک لاہور میں ادبی اور ثقافتی تقریب کا تعلق ہے آپ نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ''لگتا یوں ہے کہ جملہ معاملات دروبست اخباری کالم نویسوں کے ہاتھوں میں آگئے ہیں'' اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ بہرحال آپ نے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہی ہے کہ ان اجتماعات میں جس شدید تشنگی کا احساس ہوا وہ تھا اہلِ علم و خبر کی جانب سے اردو زبان کے ساتھ بین الاقوامی ناروا سلوک پر عدم توجہی کا بے رحمانہ مظاہرہ۔

اس شمارے میں پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون پسند آیا فنِ خطاطی کے حوالے سے ایسے مضامین اور خطاطی کے نمونے پیش کرنے کی ہر دور میں ضرورت رہے گی، ایران میں فنِ خطاطی

میں یدطولیٰ رکھنے والے ہر عہد میں اپنے کمالات دکھاتے رہے ''خوشنویسی یک موہبت الٰہی است'' آستانِ قدس کے ایک شعبے میں فن خطاطی کے ہزار ہا نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس فن کو پذیرائی حاصل ہے، یوسف سدیدی اوران کے شاگرد خاص منظر رقم نے خطاطی میں نام پیدا کیا ڈاکٹر معین الدین عقیل نے صحیح فرمایا کہ ''پاکستانی عمال حکومت بیرونی ممالک میں تعینات ہو کر اپنے فرائض بھول جاتے ہیں'' اگر ہمارے سفارت خانوں میں مختلف فنون خصوصاً فن خطاطی کی نمائش کا اہتمام ہوتا رہے اور پاکستانی ثقافت کا حقیقی تعارف پیش کیا جاتا رہے تو ہم مسلم ممالک میں خصوصاً اور دوسرے ممالک میں عموماً اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں اوران تمام ممالک میں پاکستان کی علمی، ادبی اور ثقافتی تقریبات کا انعقاد ضروری بھی ہے۔

''ڈاکٹر خیال امروہوی کی شاعری میں غیر طبقاتی معاشرہ کا آدرش'' بھرپور مقالہ ہے، محمد امیر ملک نے ڈاکٹر خیال امروہوی کے نظریات پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے، 'الاقرباء' میں خیال امروہوی مسلسل اپنے مضامین اور غزلیں بھیجا کرتے تھے دراصل اشتراکی نظام کے خاتمے کا فائدہ سرمایہ داروی نظام کو پہنچا۔ اسلام کا حقیقی نظام جسمانی اور روحانی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ ہے کہ اس میں حاکم وقت خود اختیاری فقر کے نتیجے میں عوام کی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے لیکن دینی علوم پر دسترس رکھتے ہوئے وہ عوام الناس کی رہنمائی بھی کرتا ہے ہم فلاحی اسلامی ریاست کا خواب تو دیکھتے ہیں لیکن اس کی تعبیر کے منتظر ہیں خیال امروہوی ایک ایسے دانشور تھے جو شاعری سے شغف رکھنے کے نتیجے میں بیگانہ عمل تھے خواہ ان کے خیالات عمل کے حق میں دیکھے گئے مگر انہیں غم روزگار، تنگ دستی اور ناتوانی سے واسطہ پڑا، ان کا خیال درست پایا گیا لیکن وہ خود بہت سی محرومیوں کا شکار ہوئے۔

حیات نام عمل کا عمل کا نام حیات    حیات حرف و حکایات کی کتاب نہیں

-----

اس میں شک نہیں کہ خیال امروہوی کی شاعری میں ان کا دبنگ لہجہ ہمیں تبدیلی احوال پر آمادہ کرتا ہے مگر وہ خود اپنے خیالات نہ بدل سکے۔

## پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ کراچی

کچھ ہی دیر قبل ''حرفِ معتبر'' ہمدست ہوئی تو سرورق سے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ حرفِ معتبر کیا ہوگا۔ واقعی آپ کے اداریے 'حرفِ معتبر' ہی ہوا کرتے ہیں، بے حد فکر انگیز، دردمندی سے مزین، قومی وملی احساسات وجذبات کا مرقع کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ دراصل اس فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے جو ہم سب پر عائد ہے لیکن ادا آپ کرتے ہیں۔ یہ سب ہی اداریے، جب سے ''الاقربا'' میسر آرہا ہے، مطالعے میں آچکے ہیں لیکن ان کا مجموعہ اب ایک ایسی حوالہ جاتی کتاب کی صورت اختیار کر چکا ہے جو اپنے متعلقہ موضوعات پر ایک راست فکر نقطہ نظر کے تعین کے لیے استفادے میں آتا رہے گا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے اداریوں کو یکجا کیا۔ اب یہ بیک نظر قومی و ادبی مسائل و مباحث میں رہنمائی فراہم کرتا رہے گا اور ان کی تاریخ کے مرتب کرنے میں بھی کام آتا رہے گا۔

## ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی۔ حیدر آباد (سندھ)

آپ کی گراں قدر کتاب (اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کی نئی جہت) مل گئی ہے۔ یہ اداریے ہیں لیکن اپنی جگہ مقالات بھی ہیں اردو کے حوالے سے ان کی حیثیت تاریخی بھی ہے ایک دفعہ تفصیل سے پھر پڑھ رہا ہوں۔ بیمار ہوں زیر علاج ہوں۔ ان کی اشاعت اور کتابی صورت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔

## صابر عظیم آبادی۔ کراچی

'الاقرباء' کا تازہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء موصول ہوا۔ اس شمارے میں بھی معیاری مضامین اور مقالات شامل ہیں خاص طور سے نورینہ تحریم بابر کی تاریخ نگاری، سید انتخاب علی کمال کی تاریخ گوئی اور مسلم شمیم صاحب کا علی سردار جعفری پر مضمون بہت پُر مغز ہیں۔ دیگر مضامین قابل تحسین ہیں۔ پرتو روہیلہ کی کتاب 'غالب کے غیر مدون فارسی مکتوبات' اور مضطر اکبر آبادی

کے شعری مجموعہ ''عکس جمال'' پر آپ کا تبصرہ خوب سے خوب تر کا حامل ہے۔ نظم و غزل اور نعت کا حصّہ بھی بہت معیاری ہے۔

آئندہ اشاعت کے لیے ایک نعت اور چند رباعیات حاضر خدمت ہیں۔ غزلیں آپ کے ریکارڈ میں موجود ہوں گی۔ باقی حالات بدستور ٹھیک ہیں۔ تمام اراکین اور احباب کی خدمت میں میرا اسلام کہیئے۔

## سعود صدیقی۔ کراچی

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء کا الاقرباء اپنی پوری آب و تاب لے کر آیا جس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں حسب معمول، پچھلے شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی الاقرباء کو بہتر سے بہتر بنانے کی کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماشاءاللہ الاقربا پاکستان کے سارے ادبی جرائد اور دیگر رسالوں میں اپنی ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس کو اردو ادب پر ایک عالمی معیار کا جریدہ کہا جاتا ہے۔

زیر نظر شمارے میں سارے مضامین، افسانے، تبصرے، شعر و شاعری اور دیگر ادبی مواد کا انتخاب بہت محنت و جانفشانی سے کیا گیا ہے بلکہ مجھے اس شمارے میں اور زیادہ تنوع اور روائی نظر آئی مثلاً کوئی چار یا پانچ بے حد معلوماتی مضامین تاریخ نگاری کے ہیں جن کا معیار بہت بلند پایا۔ اسی طرح شعری انتخاب میں بھی غزل و نظم کے علاوہ قطعات و رباعیات نے الاقرباء کو اور بھی دلکش بنا دیا۔ جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا مضمون ''ایسی چنگاری بھی یارا اپنے خاکستر میں ہے'' کے عنوان سے پاکستان کی اسلامی خطاطی کے شاہکار، بہت پسند آیا۔ کاش ایسے معلوماتی اور دلچسپ مضامین کسی طرح ہماری نوجوان نسل تک بھی پہنچ سکیں۔ محترم طارق غازی صاحب اردو و عربی اور شاید فارسی کے بھی ایک ممتاز اسکالر اور انشا پرداز ہیں میں ذاتی طور پر بھی غازی صاحب کا بے حد مداح ہوں، سلطنت عثمانیہ پر ان کا مقالہ نہایت معتبر اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسے مضامین ہمیں اپنی جامعات اور اعلیٰ درسگاہوں میں اسلامی تاریخ کے نصاب

میں ضرور شامل کرنے چاہئیں۔ لیکن کون کرے؟ جناب امین حیدر صاحب کا دلچسپ اور طنز و مزاح سے بھرپور مکالماتی مضمون بہ قلم ڈپٹی نذیر احمد مرحوم پڑھ کر بہت لطف آیا مضطر اکبرآبادی کے مجموعہ 'عکس جمال' پر جناب سید منصور عاقل صاحب کا سیر حاصل تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مضطر صاحب کی شاعری اپنے کلاسیکی فکر و خیال کے باوجود نیا اسلوب رکھتی ہے۔ واقعی ایسے شعر کہنے میں ایک عرصے کی مشق سخن چاہیے۔ بقول شاعر:

یہ سارے ادب، آداب و ہنر یونہی تو نہیں آ جاتے ہیں
عمریں تج دینی پڑتی ہیں، اک حرف رقم کرنے کے لیے

---

شعر و سخن کی بات چلی تو یہ بھی کہتا چلوں کے اس شمارے میں غزلوں، حمد اور نعتوں کا انتخاب بہت عمدہ ہے اور بالخصوص جہاں طارق غازی، ضامن جعفری، اویس جعفری اور انور شعور جیسے شعراء کا کلام موجود ہو وہ سارے انتخاب کو جگمگا دیتا ہے۔ میں الاقربا کے ادبی و تحقیقی معیار پر جناب سید منصور عاقل، تمام اراکین مجلس ادارت و مشاورت کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

## ولی عالم شاہین۔ اوٹیسولو (کینیڈا)

چار دہائیوں سے اوپر کی بات ہے کئی بار ماجد الباقری مرحوم اور شعیب بن عزیز کے ساتھ راولپنڈی میں آپ کے دفتر میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں مناپلی کنٹرول اتھارٹی، اسلام آباد میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (شماریات) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ راؤ سلیمان، ڈاکٹر محمد عذیر، اور مسرت حسین زبیری میرے سربراہوں میں تھے۔ میں اگست ۱۹۷۳ء میں کینیڈا آ گیا اور جب سے یہیں ہوں۔ شعیب بن عزیز سے اب بھی گاہے بگاہے فون پر گفتگو رہتی ہے۔ انہوں نے لاہور آنے کی دعوت بھی دی لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آیا۔

آج انٹرنیٹ پر الاقرباء کی خبر کے ساتھ آپ کا اسم گرامی نظر آیا۔ آپ کی ادبی فتوحات اور دیگر حوالوں سے مجھے پورا یقین ہو گیا کہ آپ سے میری شناسائی رہی ہے۔ اس خط کو تجدید

شناسائی کی ایک کڑی جانیئے۔ ہمارے شہر آٹوا میں ایک صاحب ذوق ماہر اسلامیات، ادیب و شاعر طارق غازی نام کے رہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ قبل الاقرباء کا ذکر کیا تھا۔ رسالہ کبھی میری نظر سے نہیں گزرا اور اس سے آگے بات بھی نہیں بڑھی۔ اُن سے میری راہ و رسم ہے اور وہ کئی بار غریب خانے پر آچکے ہیں۔ اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ تین فائلیں منسلک ہیں۔ موقع ملے تو ایک نظر ڈال لیجیے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

## پروین شیر۔ونی پیگ۔کنیڈا

چند دنوں قبل سفر سے واپس آئی تو الاقرباء اکتوبر/دسمبر کا شمارہ اپنی آن بان کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ از حد مسرت ہوئی۔ گرچہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے، پھر بھی میں نے فوری طور پر آپ کا شکریہ ادا کرنا اور مبارک باد دینا ضروری سمجھا۔ عرصے بعد واپسی پر بے شمار مصروفیات حملہ آور ہیں لیکن کچھ لمحے چُرا کر الاقرباء کے پیمانے سے قطرہ قطرہ اپنی پیاس بجھانے کی سعی میں تشنگی مزید بڑھتی جاتی ہے۔ عمدہ سرورق نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ معیار مشمولات حسب دستور اعلیٰ ہیں اور قابل داد۔ میری غزل اور مکتوب بھی شامل ہیں اس عنایت کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔ مضامین بہت معلوماتی ہیں محترم اویس جعفری صاحب کی نظم ماشاءاللہ لاجواب ہے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ احباب کو سلام۔

## سیّد حبیب اللہ بخاری

''الاقرباء'' کا شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء زیرِ نظر آیا۔ ترسیل جریدہ کے لیے شکر گزار ہوں۔ مقالۂ افتتاحیہ میں آپ نے قلبی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ دیگر مضامین و مقالات کی نگارشات قابلِ ستائش ہیں۔ امین حیدر کا مکالماتی مضمون ''ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی کا اندازِ نگارش منفرد ہے۔ افسانے پسند آئے بالخصوص بلاعنوان و آکاس بیل۔ حقیقت یہ ہے کہ شمارہ کے جملہ مندرجات قابلِ تعریف اور علمی و ادبی شاہکار ہیں۔

## عارف منصور۔لاہور

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ہی کے توسط سے آپ کا اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔آپ نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں کراچی اور لاہور کی تشنۂ مقاصد بین الاقوامی ادبی وثقافتی تقریبات کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے دوسرے صفحے پر محترم ڈاکٹر جاوید اقبال کے ایک فرمان کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے اسے انتہائی گمراہ کن قرار دیا ہے دراصل مجھے یہاں آپ کی اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے چند گزارشات پیش کرنی ہیں تاکہ ایک غلط فہمی کا فوری طور پر سدباب ہو جائے ،آپ ذرا ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کیے ہوئے فقرے کو غور سے پڑھیں ''جدید یورپی کلچر میں عقلی اور تجرباتی علوم کی ترقی دراصل اسلامی تہذیب ہی کی توسیع ہے۔''میں اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال کے خطبات مدراس جن کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے کیا ہے اور جسے بزم اقبال ۲۔کلب روڈ، لاہور نے شائع کیا ہے، میں پہلے خطبے ''علم اور مذہبی مشاہدات'' سے کتاب کے صفحہ نمبر ۴۳۔۴۴ پر موجود عبارت نقل کرتا ہوں۔

''پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالم اسلامی نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں، کیوں کہ جہاں تک علم وحکمت کا تعلق ہے مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب وتاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں''

درج بالا عبارت کے مطالعے کے بعد آپ جاوید اقبال کے ارشاد کیئے ہوئے جملے کو کس طرح حضرت علامہ کی فکر سے متصادم اور ان کی ذاتی تعبیر وتشریح کا مظہر کہہ کر اسے گمراہ کن تعبیر کا

لیبل لگا سکتے ہیں ☆۔ براہ کرم ان معاملات میں اپنی رائے قائم کرنے کے لیے خصوصی درخواست ہے کہ حقائق کا جائزہ تفصیل سے لیا جائے ورنہ غلط فہمی کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی کسی آئندہ اشاعت میں اس وضاحت کو بھی جگہ دیں گے اور اپنی رائے سے بھی رجوع فرمائیں گے۔

---

☆ محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو ہم اس لیے واجب التعظیم سمجھتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام کی ایک عظیم المرتبت اور سرمایۂ افتخار شخصیت حضرت علامہ اقبالؒ کی نسبت شرف فرزندی سے سرفراز فرمایا ہے اور وہ خود بھی دنیائے معارف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں تاہم حضرت علامہ کا فکر و فلسفہ جو اسلامی تہذیب کا بھی ترجمان ہے اور جس کی بنیاد قرآن حکیم واسوۂ رسولؐ ہے اُمت مسلمہ کی میراث ہے یہ میراث دینِ اکمل (اکملتُ لکم دینکم) کے طفیل کسی بھی نوع کی ترمیم و توسیع سے ماورا ہے۔ اس تناظر میں فاضل مراسلہ نگار اگر اقبالؒ اور فرزندِ اقبال کے ارشادات پر ہر دو کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور فرمائیں جنھیں انھوں نے اپنے مراسلہ میں نقل فرمادیا ہے تو فکر و معنی کا تضاد واضح ہو جائے گا۔

فرمودۂ اقبالؒ "مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔"

ارشاد فرزند اقبالؒ "جدید یورپی کلچر میں عقلی اور تجرباتی علوم کی ترقی دراصل اسلامی تہذیب ہی کی توسیع ہے۔"

مفہوم میں قطعاً کوئی ابہام نہیں کہ بقول علامہ مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے بعض پہلوؤں کو اپنانے کے نتیجہ میں ترقی یافتہ شکل میسر آئی جب کہ اسلامی تہذیب کے لیے جس کے حدود و قیود کا تعین دین فطرت اور دین اکمل کے مرہون منت ہے اُس میں کسی بھی نوع کی توسیع کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مغربی تہذیب کی تازہ ترین ترقی کا شاہکار ہم جنس پرستی جیسے قبیح و مکروہ فعل کو قانونی جواز مہیا کرنا ہے جس کے روادار جانور تک نہیں۔ (ادارہ)

## محمد طارق علی۔ راولپنڈی کینٹ

جناب منصور عاقل کے ادب آشنا قلم سے نکلی دو کتابیں حال ہی میں یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئی ہیں۔ انہیں نہ صرف مقامی ادبی حلقوں بلکہ مختلف بیرونی ممالک کے اردو نواز حلقوں میں پذیرائی مل رہی ہے۔ ان کتابوں کے نام ہیں "حرفِ معتبر" (۲۰۱۳ء) اور "متاعِ فکر و نظر" (۲۰۱۴ء)۔ صاحب قلم ایک طویل عرصہ سے اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ادب شناسی اور ادب پروری انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کتابوں سے قبل مختلف ادبی/ نیم ادبی موضوعات پر انکی بیس کتابیں منصۂ شہود پر آ کر قبول عام پا چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتابیں پڑھنے کے بعد دل نے چاہا کہ اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں۔

پہلی کتاب "حرفِ معتبر" سہ ماہی "الاقرباء" میں ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۳ء چھپے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ جن کی کل تعداد ستاون ہے۔ ان اداریوں سے اردو ادب سے مصنف کی گہری محبت جھلکتی ہے۔ مختلف درپیش ادبی و لسانی مسائل کو نہ صرف انہوں نے اپنے مخصوص طرزِ فکر و تحریر سے اجاگر کیا بلکہ زبان کی حیثیت کو گراں مایہ بنانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان ہمہ وقت اپنے بولنے والوں کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب و تمدن کی ترقی و پرداخت کرتی ہے۔ اسی لئے ہر قوم اپنی مخصوص زبان کو "قومی زبان" کا درجہ دیتی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اردو زبان کے لئے مختلف منفی اور غیر تعمیری رویئے نظر آتے ہیں۔ منصور عاقل داد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے قلم و زبان کے ذریعے اصلاحِ احوال کے پہلو ڈھونڈتے ہیں اور مقتدر حلقوں سے عملی اقدام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کوئی ساتھ دے یا نہ دے، وہ تن تنہا اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے اداریوں میں ایک ناگزیر دل سوزی و جذباتیت ہوتی ہے لیکن وہ جو کچھ لکھتے ہیں علمیت کی گہری چاشنی میں ڈبو کر لکھتے ہیں۔

جناب منصور عاقل کی دوسری کتاب "متاعِ فکر و نظر" ان کے مذکورہ جریدے میں مطبوعہ مختلف کتابوں پر تبصروں (۲۰۰۵ء تا ۲۰۱۳ء) پر مشتمل ہے۔ کل تعداد ستانوے ہے۔ ان تحریروں میں وہ کتاب کیساتھ ساتھ مصنف کی ذاتی و ادبی خدمات کو بھی اجاگر کرتے ہیں اور یوں ان کے تبصرے قاری کیلئے توشۂ خاص ہیں۔ ان میں صرف ادب ہی نہیں بلکہ زندگی سے قریب دیگر مضامین فلسفہ، مذہب اور تاریخ سبھی کچھ ملتا ہے۔ نیز ان کی لذت خیز نثر دو آتشہ بن کر سامنے آتی ہے۔

# خبرنامہ

## الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
شہلا احمد

# احوال و کوائف

## ○ الاقرباء کی رکن ہالا صابری کی اقوام متحدہ کے کمیشن برائے خواتین میں شرکت پاکستانی وفد کی قیادت کے فرائض انجام دیئے

سینئر نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب جی۔ اے صابری و بیگم ماریہ صابری کی ہونہار،، باصلاحیت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبزادی عزیزہ ہالہ صابری کو رواں سال کے دوران یہ قابلِ فخر اور منفرد اعزاز حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے پاکستانی وفد کے چیئر پرسن کی حیثیت سے ۱۰ تا ۲۱ مارچ ۲۰۱۴ء کے دوران نیویارک (امریکہ) میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے خواتین (سماجی مرتبہ وحیثیت) کے اجلاس سے عورتوں اور لڑکیوں کے لیے مرتبہ عالمی ایجنڈے پر خطاب کیا۔

واضح رہے کہ اس کمیشن کا اجلاس ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ رواں سال کے دو ہفتے تک جاری رہنے والے اہم اجلاس میں سال ۲۰۱۵ء کے بعد کے ترقیاتی پروگرام کو زیر بحث لایا گیا اور اُن تجاویز پر غور کیا گیا جو خواتین کو معاشرہ میں مقتدر بنانے کے لیے پیش کی گئیں۔ اس اجلاس میں دنیا بھر کے ممالک کو مدعو کیا گیا تھا جن میں سفارتی شخصیات، سول سوسائٹی کے نمائندگان اور این۔ جی۔ اُوز شامل تھے۔ عالمی گرل گائیڈز اور گرل سکاؤٹس کی ایسوسی ایشن کے اراکین کا ایک وفد اقوام متحدہ کے کمیشن کے ہر سالانہ اجلاس میں شرکت کرتا ہے پاکستان اس ادارہ کا رُکن ہے چنانچہ اس سال کے لیے عزیزہ ہالہ صابری کا انتخاب بھی عالمی تنظیم ہی نے کیا۔ ہالہ صابری طویل مدت سے گرل گائیڈز کی پاکستانی تنظیم سے وابستہ ہیں اور پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے سرگرم رہی ہیں۔

اپنے مفصل و موثر خطاب میں آنسہ ہالہ صابری نے اپنے بین الاقوامی سامعین کو اپنے ان تجربات سے آگاہ کیا جو انھیں اِس ضمن متعدد تقریبات میں شرکت کر کے حاصل ہوئے۔ انھوں نے ایسے نکات اُٹھائے اور سوال و جواب کے ذریعہ بحث و مباحثہ کا ایسا ماحول پیدا کیا جو خواتین کو مقتدر بنانے کے سلسلہ میں فیصلہ سازی میں مددگار ہو سکے۔ انھوں نے پاکستانی خواتین کی آواز کو عالمی سطح پر بلند کیا اور اُن چیلنجوں کا ذکر کیا جو نسوانی آبادی کو ملک میں درپیش ہیں۔ آنسہ ہالہ صابری نے دو پینل مباحثوں میں اپنے دلائل سے ثابت کیا کہ غیر رسمی تعلیم کو خواتین کے مقتدر بنانے میں ایک موثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے اِس موقع پر نوجوان خواتین کی دو ذیلی تقاریب منعقد کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا تا کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے خواتین کے ۵۸ ویں اجلاس میں جو نوجوان خواتین شرکت کر رہی ہیں وہ اپنی ترجیحات پر گفتگو کر سکیں اور عالمی سطح پر اپنی آواز بلند کر سکیں۔ یہ بات یقیناً پاکستان گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن اور خود پاکستان کے لیئے باعث فخر ہے کہ پاکستانی خواتین کی جواں سال نسل نے بین الاقوامی سطح پر قابلِ تحسین کردار ادا کیا۔

۲۱ مارچ کی شب کو اقوام متحدہ کے کمیشن کے اجلاس کی متعدد نشستوں کے اختتام پر جن فیصلوں کا اعلان کیا گیا اُن پر گفتگو کرتے ہوئے آنسہ ہالہ صابری نے بحیثیت چیر پرسن پاکستانی وفد کے فیصلوں پر پیشرفت کو قابلِ اطمینان قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ کمیشن نے آئندہ کے ترقیاتی ایجنڈے میں نہ صرف خواتین کے مقتدر ہونے کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے بلکہ دوسرے تمام شعبوں میں بھی اُن پر خصوصی توجہ مرتکز کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں ثانوی تعلیم کے ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم شامل ہے نیز غیر رسمی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا جانا شامل ہے۔ آنسہ صابری نے مزید کہا کہ پاکستان جیسے ملک میں رسمی و غیر رسمی تعلیم اور جدید ٹیکنالوجی کو یکجا کرنے کے علاوہ نظام تعلیم کو یکساں اور ہمہ گیر بنانے ہی سے ہمارے مسائل کا حل ممکن ہے۔ اس طرح ہمارے راستے کی بے شمار تہذیبی و ثقافتی اور جغرافیائی رکاوٹیں دور ہو سکیں گی۔

آخر میں آنسہ ہالہ صابری نے کہا کہ اقوام متحدہ کے اس عالمگیر اجتماع میں شرکت کے باعث مجھے قیمتی تجربات میسر آئے ہیں اور پاکستان کی نمائندگی کرنا میرے لیے باعث فخر ہے میں اپنے وفد میں شامل باخبر اور باصلاحیت اراکین کے تعاون کی شکر گزار رہوں۔

## ○ ثمرہ جمال کی شادی خانہ آبادی

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب جمال ناصر خان و مرحومہ حنا جمال صاحبہ کی صاحبزادی ثمرہ جمال (Eclectrical Engineer) ۲۸ مارچ ۲۰۱۴ء کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ ان کے شوہر شمائل الرحمٰن (Electronics Engineer) مارکیٹنگ منیجر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ادارہ اس مبارک و پُر مسرت موقع پر ثمرہ، شمائل اور اہل خانہ کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔

## ○ سانحۂ رحلت

انتہائی دکھ کے ساتھ یہ خبر رقم کی جارہی ہے کہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے سینئر رکن سید نظر علی زیدی ۱۶ فروری ۲۰۱۴ء کو انتقال فرما گئے۔ اناللّٰہ و انا الیہ راجعون

مرحوم دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ جناب پنجاب گورنمنٹ میں Dy.Director Industries کے عہدے پر فائز رہے۔ جناب نظر زیدی صاحب الاقرباء فاؤنڈیشن کے سابق سکریٹری جنرل جناب محمد حسن زیدی کے بڑے بھائی تھے اور مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

## ○ محترمہ شہلا اسلام کی پوتی کی ولادت

الاقرباء فاؤنڈیشن کی نائب صدر اور الاقرباء سہ ماہی کی مدیر مسئول محترمہ شہلا اسلام کے صاحبزادے اظہر اور ان کی بیگم مریم کو اللہ تعالیٰ نے ۱۳ فروری ۲۰۱۴ء کو بیٹی کی رحمت سے نوازا جس کا نام حرمین اظہر رکھا گیا ہے۔ ادارہ اس خوشی کے موقع پر محترمہ شہلا اسلام اظہر، مریم و اہلِ خانہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

## O خوشخبری

۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو رکن مجلسِ منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید حسن سجاد و بیگم عالیہ حسن کے صاحبزادے محمد منیب حسن و بیگم زینب منیب کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی۔ حسن سجاد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے سید محمد مزمل حسن کی منگنی ان کی پھوپھی زاد حنا سے طے پائی ہے جو لاہور میں Dental Surgery کی طالبہ ہیں۔ ادارہ ان خوشیوں میں جناب حسن سجاد عالیہ حسن و اہل خانہ کے ساتھ شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشیوں اور رحمتوں سے نوازے۔ آمین

## O جناب پروفیسر لئیق احمد خاں صاحب کا انتقال پُر ملال

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن سید فیصل منصور کے سُسر اور ان کی اہلیہ نادیہ کے والدِ گرامی پروفیسر لئیق احمد صاحب مختصر علالت کے بعد ۲۸ جنوری ۲۰۱۴ء کو انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحوم صدر الاقرباء فاؤنڈیشن سید منصور عاقل صاحب کے سمدھی تھے۔ وہ باعتبار پیشہ محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ مرحوم علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں Director Education, Academy of Educational Planning میں Assistant Registrar اور بعد میں بحیثیت Directo Gireral خدمات سرانجام دیں۔

مرحوم ایک طویل عرصے تک PTV سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے لاتعداد تعلیمی پروگرامز کی میزبانی کی۔ پروگرام "Science Magazine" نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستارۂ امتیاز، Life Time Achievement Award اور Pride of perrformance Award سے نوازا گیا۔ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

سیّدہ سارہ سلمان

# گھریلو چٹکلے

- اگر کسی جگہ سے چھپکلی کو بھگانا ہو تو چار چمچ گھی، دو چمچ تمبا کو اور ایک چمچ نسوار ملا کر اُس جگہ لگا دیں۔ چھپکلی نہیں آئے گی
- کالی گردن کو صاف کرنے کے لیے دو چمچ بادام کا تیل، ایک چمچ دہی اور ایک چٹکی خمیر ملا کر ہفتے میں تین دن، رات کو مل کر سو جائیں اور صبح کو صاف کر لیں۔ گردن صاف ہو جائے گی۔
- پیاز کو اگر خستہ تلنا ہو تو پیاز کو باریک کاٹ کر تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں رکھ کر فرائی کریں۔ پیاز خستہ رہے گی۔
- آئینے میں اگر نشان آجائیں تو تھوڑی دیر کے لیے ٹوتھ پیسٹ لگا دیں اور ۱۵ منٹ کے بعد صاف کر لیں۔ آئینہ صاف ہو جائے گا۔
- گردے میں تکلیف ہو یا پیشاب میں جلن ہو تو خربوزے کے تازہ بیج کو دودھ یا پانی کے ساتھ Blend کر کے دِن میں دو سے تین دفعہ پی لیں
- زیور کو صاف کرنے لیے ہلدی، کپڑے دھونے کے پاؤڈر کو پانی میں ملا کر اِس میں بھگو دیں۔ برش سے صاف کر کے دھو لیں اور خشک کر لیں۔
- دھوپ سے اگر جلد جھُلس جائے تو ٹماٹر کا رس لگا لیں جلد چمک جائے گی۔
- ہاتھوں پر اگر بال پوائنٹ کے نشان لگ جائیں تو ماچس کی اَن جلی تیلی کو گیلا کر کے مل لیں۔ نشان ختم ہو جائیں گے۔